یه کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینه

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

۷۸۶
۹۲_۱۱۰
یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

یا عباسؑ

DvD Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

آثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۴

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ——— تفسیر نمونہ

جلد ——— ۱۴

زیرِ نظر ——— آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ——— حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ار گنگارام بلڈنگ
شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

مطبع ——— معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ——— ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ ——— 200/-

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون: ۷۱۲۲۴۲۳-۷۳۱۴۳۱۱

عَرضِ نَاشَر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ـــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ـــــ تفسیر نمونہ ـــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علاّمہ سیّد صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سیّد العلماء السیّد علی نقی النقوی اعلیٰ اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیرِ قرآن کے جدید اسلُوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیرِ موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علاّمہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہٗ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمّتِ مُسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصّہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصّوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ اس وقت آپ کے زیرِ نظر ہے جس میں سابقہ جلد ۲۴ میں سے صفحہ ۱۹۳ تا ۴۱۵، جلد ۲۵ مکمل اور جلد ۲۶ میں سے صفحہ ۲۶ تا ۱۴۸ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سُورہ طلاق، سُورہ تحریم، سُورہ مُلک، سُورہ القلم، سُورہ الحاقہ، سُورہ معارج، سُورہ نوح، سُورہ جن، سُورہ مزمل، سُورہ مدثر، سُورۂ قیامت، سُورہ دہر، سُورہ مرسلات، سُورہ نباء، سُورۂ نازعات اور سُورہ عبس کی تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکّر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھدَاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عمومًا اور جوانوں میں خصوصًا اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیدِ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر بُرہان	از	مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمّد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمّد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سیّد قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمّد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفیٰ مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کے اُردو ترجمے کے متعدد اڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مُحسنِ ملّت حضرت علاّمہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوار معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماء میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پَرتَو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے ، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دَور کی تفاسیر کو دینا ہوگا ۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے ۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر) ۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کرسکے ۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہوسکے ۔ الحمد للہ ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا ۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی نو جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی دسویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں ۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں از حد شکرگزار ہوں ۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں ۔

۱ ۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی ؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی ۔

۲ ۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں ؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو ، یہاں تک کہ سفر و حضر میں ، بعض اوقات جلاوطنی[1] کے مقام پر ، حتّٰی کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے ۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا ۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے ۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے ۔

۳ ۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

[1] سابق شاہ ایران معدوم کے دَور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا ۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بار الہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا دمجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تُو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

تفسیر نمونہ جلد ۱۴

فہرست

سورۂ طلاق ۲۵

سورۂ طلاق کے مضامین ۲۶

سورۂ طلاق کی تلاوت کی فضیلت ۲۶

آیت ۱ ۲۷

طلاق اور علیحدگی کی شرائط ۲۸

چند نکات

۱۔ طلاق حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے ۳۱

عاطفی مشکلات ۳۲

اجتماعی مشکلات ۳۳

اولاد کی مشکلات ۳۳

۲۔ اسبابِ طلاق ۳۴

۳۔ عدت کا فلسفہ ۳۵

آیت ۲، ۳ ۳۷

صلح یا پسندِ خدا علیحدگی ۳۸

چند نکات

۱۔ مشکلات سے نجات اور تقویٰ ۴۱

۲۔ روحِ توکل ۴۳

آیت ۴ تا ۷ ۴۵

مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق ۴۷

چند نکات

۱۔ طلاقِ رجعی کے احکام ۵۲

۲۔ خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ۵۳

۳۔ گھرانے کے نظام کی اہمیت ۵۳

آیت ۸ تا ۱۱ ۵۵

سرکشوں کا دردناک انجام ۵۶

آیت ۱۲ ۶۱

خلقتِ عالم کا مقصد معرفت ہے ۶۱

سورۂ تحریم ۶۵

سورہ تحریم کے مضامین ۶۶

سورہ تحریم کی تلاوت کی فضیلت ۶۶

آیت ۱ تا ۵ ۶۸

شانِ نزول ۷۰

پیغمبرؐ کی بعض ازواج کی شدید سرزنش ۷۱

چند نکات

۱۔ اچھی بیوی کے اوصاف ۷۵

۲۔ صالح مومنین سے کون مراد ہے؟ ۷۶

۳۔ افشائے راز ۷۸
۴۔ حلالِ خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے ۷۹
آیت ۶ تا ۸ ۸۰
اپنے گھر والوں کو جہنّم کی آگ سے بچاؤ ۸۱
چند نکات
۱۔ اہل خانہ کی تعلیم و تربیت ۸۶
۲۔ توبہ رحمت کا ایک دروازہ ہے ۸۸
آیت ۹ تا ۱۲ ۹۰
مومن اور کافر عورتوں کے نمونے ۹۱

سُورہ مُلک ۹۸

سُورہ مُلک کے مضامین ۹۹
اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت ۱۰۰
آیت ۱ تا ۵ ۱۰۱
تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے ۱۰۲
ایک نکتہ
عالم آفرینش کی عظمت ۱۰۸
آیت ۶ تا ۱۱ ۱۱۰
اگر ہم سُننے والے کان اور بیدار فکر رکھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔ ۱۱۱
ایک نکتہ
عقل و خرد کی اونچی قدر و قیمت ۱۱۴
آیت ۱۲ تا ۱۴ ۱۱۶
کیا جہان کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟ ۱۱۶
آیت ۱۵ تا ۱۸ ۱۱۹
کوئی مجرم اس کے عذاب و سزا سے امان میں نہیں ہے۔ ۱۲۰
آیت ۱۹ تا ۲۱ ۱۲۴
اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو ۱۲۵
ایک نکتہ
انسان کی ناکامی کے چار عوامل ۱۲۸
آیت ۲۲ تا ۲۷ ۱۲۹
شاہراہِ توحید کے راست قامت افراد ۱۳۰
آیت ۲۸ تا ۳۰ ۱۳۵
جاری پانی تمہارے اختیار میں کون دیتا ہے؟ ۱۳۶
ایک نکتہ

سُورہ قلم ۱۴۰

سُورہ قلم کے مضامین ۱۴۱
سُورہ قلم کی تلاوت کی فضیلت ۱۴۲
آیت ۱ تا ۷ ۱۴۳
تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں ۱۴۴
چند نکات
۱۔ انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر ۱۴۸
۲۔ پیغمبر کے اخلاق کا ایک نمونہ ۱۵۲
آیت ۸ تا ۱۶ ۱۵۶
ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو ۱۵۷
چند نکات

۱۔ اخلاقی رذائل ۱۶۱
۲۔ مداہنہ اور سازگاری ۱۶۲
آیت ۱۷ تا ۲۵ ۱۶۴
باغ والوں کی عبرت انگیز داستان ۱۶۵
آیت ۲۶ تا ۳۳ ۱۶۹
سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام ۱۷۰
چند نکات
۱۔ انحصار طلبی؛ ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت۔ ۱۷۴
۲۔ گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ ۱۷۵
آیت ۳۴ تا ۴۱ ۱۷۶
مکمل بازپرس ۱۷۷
آیت ۴۲ تا ۴۵ ۱۸۰
اس دن سجدہ کرنا چاہیں گے، لیکن قادر نہ ہوسکیں گے۔ ۱۸۱
آیت ۴۶ تا ۵۰ ۱۸۵
عذاب کا تقاضا کرنے میں جلدی نہ کرو ۱۸۶
آیت ۵۱ ، ۵۲ ۱۹۰
وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کرسکتے ۱۹۰
ایک نکتہ
کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے ۱۹۲

سُورہ حاقہ

۱۹۵
سُورہ حاقہ کے مضامین ۱۹۶
اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت ۱۹۶
آیت ۱ تا ۸ ۱۹۷
سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب ۱۹۸
آیت ۹ تا ۱۲ ۲۰۲
سننے والے کان کہاں ہیں ؟ ۲۰۲
چند نکات
علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت ۲۰۵
گناہ اور سزا میں تناسب ۲۰۵
آیت ۱۳ تا ۱۷ ۲۰۷
وہ دن جس میں وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا ۲۰۸
آیت ۱۸ تا ۲۴ ۲۱۲
اے اہل محشر میرا نامۂ اعمال پڑھو ۲۱۳
چند نکات
۱۔ لفظ عرش کی ایک اور تفسیر ۲۱۵
۲۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام ۲۱۶
۳۔ ایک سوال کا جواب ۲۱۶
آیت ۲۵ تا ۲۹ ۲۱۸
اے کاش مجھے موت آجاتی ۲۱۹
ایک نکتہ
چند عبرت انگیز داستانیں ۲۲۰
آیت ۳۰ تا ۳۷ ۲۲۳
اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو ۲۲۴
ایک نکتہ
حروفِ قرآن پر اعراب لگانے کی ابتدا ۲۲۷

آیت ۳۸ تا ۴۳	۲۲۹
یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے	۲۳۰
آیت ۴۴ تا ۵۲	۲۳۴
اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے	۲۳۵
ایک نکتہ	۲۳۹

سورۂ معارج

	۲۴۰
سورہ معارج کے مطالب	۲۴۱
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۴۱
آیت ۱ تا ۳	۲۴۳
فوری عذاب	۲۴۵
ایک نکتہ	
بہانہ تراشوں کے بیہودہ اعتراضات	۲۴۶
آیت ۴ تا ۷	۲۴۹
پچاس ہزار سال کے برابر دن	۲۴۹
آیت ۸ تا ۱۸	۲۵۲
وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبر گیری نہیں کرے گا	۲۵۳
آیت ۱۹ تا ۲۸	۲۵۷
شائستہ انسانوں کے اوصاف	۲۵۸
آیت ۲۹ تا ۳۵	۲۶۳
بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصّہ	۲۶۴
آیت ۳۶ تا ۴۱	۲۶۷
کس منہ سے جنّت کی طمع ؟	۲۶۷
ایک نکتہ	
'مشارق' و 'مغارب' خدا	۲۷۰
آیت ۴۲ تا ۴۴	۲۷۱
گویا اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں	۲۷۱

سورہ نوحؑ

	۲۷۴
سورہ نوحؑ کے مطالب و مضامین	۲۷۵
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۷۶
آیت ۱ تا ۴	۲۷۷
نوحؑ کا پہلا پیغام	۲۷۸
عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب	۲۸۰
آیت ۵ تا ۹	۲۸۱
ان کی ہدایت کے لیے ہر طرح سے کوشش مگر......	۲۸۱
چند نکات	
۱۔ تبلیغ کے طریقے	۲۸۴
۲۔ حقیقت سے فرار کیوں ؟	۲۸۴
آیت ۱۰ تا ۱۳	۲۸۶
ایمان کی دنیاوی جزا	۲۸۶
ایک نکتہ	
تقویٰ اور عمران و آبادی میں ربط	۲۸۸
آیت ۱۵ تا ۲۰	۲۹۱
باغبانِ ہستی نے تمہیں ایک پھول کی طرح پالا ہے	۲۹۱

آیت ۲۱ تا ۲۵ ۲۹۵
خدا کا لطف تجھے مدارات کہتا ہے ۲۹۶
آیت ۲۶ تا ۲۸ ۳۰۰
اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے ۳۰۰
چند نکات
نوحؑ پہلے اولوالعزم پیغمبر ۳۰۳

سورۂ جنّ ۳۰۶

سورہ جن کے مضامین و مطالب ۳۰۷
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۳۰۷
آیت ۱ تا ۶ ۳۰۹
شانِ نزول ۳۱۰
ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے ۳۱۱
آیت ۷ تا ۱۰ ۳۱۶
ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے لیکن..... ۳۱۷
آیت ۱۱ تا ۱۵ ۳۲۰
ہم نے حق کو سنا اور سرِ تسلیم خم کر لیا ۳۲۱
آیت ۱۶ تا ۱۹ ۳۲۴
ہم تمہیں ان فراواں نعمتوں کے ذریعے آزمائیں گے۔ ۳۲۴
ایک نکتہ
'ان المساجد للہ' کی تفسیر میں تحریف ۳۲۸
آیت ۲۰ تا ۲۴ ۳۳۰
کہہ دیجیے: میں کسی کے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں ۳۳۱
چند نکات
۱۔ خدائی رہبروں کی صداقت ۳۳۴
۲۔ جمعیّت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں ۳۳۵
آیت ۲۵ تا ۲۸ ۳۳۶
عالم الغیب خدا ہے ۳۳۶
چند نکات
۱۔ علم غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق ۳۳۹
۲۔ آئمہ کے علم غیب کو ثابت کرنے کی ایک اور راہ ۳۴۵
۳۔ جنّ کی خلقت کے بارے میں تحقیق ۳۴۷

سورہ مزمّل ۳۵۱

سورہ مزمّل کے مضامین و مطالب ۳۵۲
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۳۵۳
آیت ۱ تا ۵ ۳۵۵
اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا ۳۵۵
چند نکات
۱۔ تلاوت قرآن اور دعا و عبادت کیلئے رات کو اٹھنا ۳۵۸
۲۔ ترتیل کا معنی ۳۵۹
۳۔ نماز شب کی فضیلت ۳۶۰
آیت ۶ تا ۱۰ ۳۶۲
رات کے وقت کی عبادت کا اثر ۳۶۲

آیت ۱۱ تا ۱۹	۳۶۸
ان متکبرین کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے	۳۶۹
ایک نکتہ	
عذابِ الٰہی کے چار مرحلے	۳۷۳
آیت ۲۰	۳۷۵
جتنا تمہارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو	۳۷۶
چند نکات	
۱۔ عقیدت کے ساتھ عملی آمادگی کی ضرورت	۳۸۰
۲۔ غور وفکر کے ساتھ تلاوتِ قرآن	۳۸۰
۳۔ معاش کی تلاش، جہاد کی ہمردیف	۳۸۱

سورہ مدّثر

سورہ مدّثر	۳۸۲
سورہ مدّثر کے مضامین	۳۸۳
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۳۸۳
آیت ۱ تا ۱۰	۳۸۵
اٹھ اور عالمین کو ڈرا	۳۸۶
آیت ۱۱ تا ۱۷	۳۹۲
شانِ نزول	۳۹۳
'ولید' ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند	۳۹۵
آیت ۱۸ تا ۲۵	۳۹۹
ہلاک ہو جائے وہ، اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا	۴۰۰
آیت ۲۶ تا ۳۰	۴۰۳
اس کی سرنوشتِ شوم	۴۰۳
انیس کا عدد عذاب کے فرشتوں کا عدد ہے	۴۰۶
آیت ۳۱	۴۰۷
دوزخ کے مامورین کی تعداد کس لیے ہے	۴۰۷
ایک نکتہ	
پروردگار کے لشکروں کی تعداد	۴۱۰
آیت ۳۲ تا ۳۷	۴۱۲
آیت ۳۸ تا ۴۸	۴۱۵
تم اہلِ دوزخ کیوں ہو گئے؟	۴۱۶
ایک نکتہ	
روزِ جزا کے شفاعت کرنے والے	۴۲۰
آیت ۴۹ تا ۵۶	۴۲۳
حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیر سے گدھے	۴۲۴

سورہ قیامت

سورہ قیامت	۴۲۸
سورہ قیامت کے مضامین	۴۲۹
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۴۲۹
آیت ۱ تا ۶	۴۳۱
قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے وجدان کی قسم۔	۴۳۲
چند نکات	
۱۔ عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغریٰ	۴۳۶
۲۔ قرآن مجید میں قیامت کے نام	۴۳۸
آیت ۷ تا ۱۵	۴۴۰
انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے	۴۴۱

آیت ۱۶ تا ۱۹ — ۴۴۶
قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ — ۴۴۶
آیت ۲۰ تا ۲۵ — ۴۴۹
میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے۔ — ۴۴۹
آیت ۲۶ تا ۳۰ — ۴۵۴
ایک نکتہ
موت کا دردناک لمحہ — ۴۵۶
آیت ۳۱ تا ۴۱ — ۴۵۹
وہ خدا جس نے انسان کو ایک ناچیز نطفہ سے پیدا کیا۔ — ۴۶۰
چند نکات
۱۔ جنین کی تبدیلیاں یا بار بار کی رستاخیز — ۴۶۴
۲۔ جہانِ بشریت میں نظامِ جنیت — ۴۶۴

سُورہ انسان (دہر) — ۴۶۶

سُورہ انسان (دہر) کے مضامین — ۴۶۷
کیا یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے؟ — ۴۶۷
سورہ انسان (دہر) کی فضیلت — ۴۶۹
آیت ۱ تا ۴ — ۴۷۱
ہم نے ناچیز نطفہ کو انسان بنادیا اور ہدایت کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں دیدیے۔ — ۴۷۲
ایک نکتہ
جنین کا پُرغوغا عالم — ۴۷۵
آیت ۵ تا ۱۱ — ۴۷۸
اہلِ بیت، پیغمبر کی فضیلت پر ایک عظیم سند۔ — ۴۷۹
ابرار کے لیے عظیم اجر — ۴۸۲
ایک نکتہ
بھوکوں کو سیر کرنا بہترین حسنات میں ہے — ۴۸۸
آیت ۱۲ تا ۲۲ — ۴۹۱
بہشت کی عظیم جزائیں — ۴۹۳
آیت ۲۳ تا ۲۶ — ۵۰۱
خدا کے حُکم کے اجراء پر موفق ہونے کیلیے پانچ احکام — ۵۰۱
آیت ۲۷ تا ۳۱ — ۵۰۵
یہ ایک تنبیہہ ہے اور راستہ کا انتخاب کرنا تمہارے اختیار میں ہے — ۵۰۶

سُورہ مرسلات — ۵۰۹

سُورہ مرسلات کے مضامین — ۵۱۰
اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت — ۵۱۰
آیت ۱ تا ۱۵ — ۵۱۲
خدا کے وعدے حق ہیں وائے ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے۔ — ۵۱۲
ایک نکتہ
ان قسموں کا مطلب — ۵۱۸

آیت ۱۶ تا ۲۸ ۵۲۰

ان تمام مظاہر قدرت کے باوجود پھر بھی تم معاد میں شک رکھتے ہو؟ ۵۲۱

آیت ۲۹ تا ۴۰ ۵۲۷

نہ دفاع کرنے کی قدرت ہے نہ فرار کی راہ ۵۲۸

آیت ۴۱ تا ۵۰ ۵۳۴

اگر وہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ۵۳۵

سورہ نباء

۵۴۰

سورہ نباء کے مضامین اور اس کا دائرہ کار ۵۴۱

اس سورہ کے مضامین کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے //

تلاوت کی فضیلت ۵۴۲

آیت ۱ تا ۵ ۵۴۳

اہم خبر //

چند نکات ۵۴۵

۱۔ مسئلہ ولایت اور نباء عظیم //

۲۔ معاد قیامت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے ۵۴۷

آیت ۶ تا ۱۶ ۵۴۹

ایک نکتہ ۵۵۹

ان آیات کا مسئلہ معاد سے تعلق //

آیت ۱۷ تا ۲۰ ۵۶۱

آخر کار روزِ معود آ کر رہے گا ۵۶۱

آیت ۲۱ تا ۳۰ ۵۶۶

جہنّم ایک عظیم کمین گاہ ۵۶۷

آیت ۳۱ تا ۳۷ ۵۷۲

پرہیزگاروں کی عظیم جزا کا ایک حصّہ //

چند نکات ۵۷۷

۱۔ متّقین کے لیے عطیات اور سرکشوں کے لیے عذاب ۵۷۷

۲۔ جنّت کے مشروب //

آیت ۳۸ تا ۴۰ ۵۷۹

کافر کہیں گے کہ کاش ہم مٹی ہوتے //

ایک نکتہ ۵۸۵

مسئلہ جبر و اختیار کے حل ہونے کا واضح راستہ //

سورہ نازعات

۵۸۸

سورہ نازعات کے مضامین اور اس کا دائرہ فکر ۵۸۹

تلاوت کی فضیلت //

آیت ۱ تا ۵ ۵۹۱

انتھک فرشتوں کی قسم //

دو سوالوں کا جواب ۵۹۵

آیت ۶ تا ۱۴ ۵۹۶

معاد صرف ایک عظیم صیحہ سے رونما ہو گا ۵۹۷

آیت ۱۵ تا ۲۶ ۶۰۱

فرعون کہتا تھا کہ میں تمہارا بہت بڑا خدا ہوں ۶۰۲
ایک نکتہ ۶۰۷
قرآن کی فضیلت کا ایک گوشہ //
آیت ۲۷ تا ۳۳ ۶۰۸
تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمانوں کی (معاد پر ایک دوسری دلیل) ۶۰۹
آیت ۳۴ تا ۴۱ ۶۱۳
وہ جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھیں ۶۱۴
چند نکات ۶۱۶
۱۔ مقام ربّ کیا ہے //
۲۔ طغیان اور دُنیا پرستی کے درمیان ربط ۶۱۷
۳۔ صرف دو گروہ ۶۱۸
آیت ۴۲ تا ۴۶ ۶۱۹
قیامت کی تاریخ صرف خدا جانتا ہے //

سُورہ عبس

۶۲۳
سُورہ عبس کے مضامین ۶۲۴
اس سورہ کا نام اس کی مناسبت سے تلاوت کی فضیلت ۶۲۴
آیت ۱ تا ۱۰ ۶۲۵
حق طلب نابینا سے بے اعتنائی برتنے پر شدید عتاب ۶۲۸
آیت ۱۱ تا ۲۳ ۶۳۰
صرف پاک لوگوں کا ہاتھ قرآن کے دامن تک پہنچتا ہے ۶۳۱
آیت ۲۴ تا ۳۲ ۶۳۹
انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے ۶۴۰
ایک نکتہ ۶۴۶
صحیح و سالم مواد غذائی //
آیت ۳۳ تا ۴۲ ۶۴۸
صیحۂ قیامت ۶۴۹
ایک نکتہ ۶۵۲
تعمیرِ ذات کی راہ //

☆ ☆ ☆

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۴

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

سورۂ طلاق : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۸

سورۂ تحریم : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۸

سورۂ مُلک : مکّی سورت ہے اور اس کی ۳۰ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۹

سورۂ قلم : مکّی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۹

سورۂ حاقہ : مکّی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۹

سورۂ معارج : مکّی سورت ہے اور اس کی ۴۴ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۹

سورۂ نوحؑ : مکّی سورت ہے اور اس کی ۲۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۹

سورۂ جنّ : مکّی سورت ہے اور اس کی ۲۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــــ ۲۹

سُورۂ مزمّل : مکّی سورت ہے اور اس کی ۲۰ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۲۹

سُورۂ مدّثر : مکّی سُورت ہے اور اس کی ۵۶ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۲۹

سُورۂ قیامت : مکّی سُورت ہے اور اس کی ۴۰ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۲۹

سُورۂ دھر : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۳۱ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۲۹

سُورۂ مُرسلات : مکّی سورت ہے اور اس کی ۵۰ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۲۹

سُورۂ نبأ : مکّی سُورت ہے اور اس کی ۴۰ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۳۰

سُورۂ نازعات : مکّی سورت ہے اور اس کی ۴۶ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۳۰

سُورۂ عبس : مکّی سُورت ہے اور اس کی ۴۲ آیات ہیں ۔
پارہ ـــــ ۳۰

سورۂ طلاق

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں ۔

آغاز ترجمہ
۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورۂ طلاق کے مضامین

اہم ترین مسئلہ جو اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے،جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے،وہ مسئلہ طلاق،اس کے احکام وخصوصیات اور اس کے نتائج ہیں۔اس کے بعد مبدء ومعاد، پیغمبرؐ کی نبوت اور بشارت و نذارت کے مباحث بیان کئے گئے ہیں۔

اِس طرح اس سورہ کے مضامین کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصّہ: اس سورہ کی پہلی سات آیات ہیں، جو طلاق اور اس سے مربوط مسائل کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ان میں اس مسئلہ کی جزئیات کو مختصر اور پُرمعنی عبارتوں میں دقیق اور لطیف انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ انسان انھیں دیکھ کر خود کو اس موضوع میں پورے طور پر مستغنی سمجھتا ہے۔

دوسرا حصّہ: جو حقیقت میں پہلے حصّہ کے اجراء کا سبب ہے، خدا کی عظمت، اس کے رسُولؐ کے مقام عظمت صالحین کے اجر وثواب اور بدکاروں کی سزا وعذاب کے بارے میں بحث کرتا ہے۔نیز اس اہم اجتماعی مسئلہ کے اجراء کی ضمانت کے طور پر ایک منظم مجموعۂ قواعد پیش کرتا ہے۔ضمناً یہ سورہ ایک دوسرا نام بھی رکھتا ہے اور وہ سورہ نساء قصریٰ (بروزن ومعنی صغریٰ) مشہور سورہ نساء کے مقابلہ میں ہے جو "نساء کبریٰ" ہے۔

* * *

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرؐ اکرم سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الطلاق مات علیٰ سنة رسول الله صلی الله علیه وآله"۔

"جو شخص سورہ طلاق کو پڑھے (اور اسے اپنی زندگی کے امور میں اپنائے اور اس پر کاربند رہے)، وہ دنیا سے سنّتِ پیغمبرؐ پر جائے گا"۔[1]

* * *

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡہُنَّ لِعِدَّتِہِنَّ وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّۃَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡہُنَّ مِنۡۢ بُیُوۡتِہِنَّ وَ لَا یَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ؕ وَ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ ؕ لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا ﴿۱﴾

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

(۱) اے پیغمبرؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو عدت کے زمانہ میں طلاق دو۔ (وہ زمانہ جب وہ ماہانہ عادت سے پاک ہوگئی ہو اور مرد نے اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کی ہو) اور عدت کا حساب رکھو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جو تمھارا پروردگار ہے۔ نہ تو تم انھیں ان کے گھروں سے باہر نکالو اور نہ وہ (عدت کے دوران) باہر جائیں سوائے اس صورت کے کہ وہ ظاہر بظاہر کوئی برا کام انجام دیں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو شخص حدود الٰہی سے تجاوز کرتا ہے تو وہ خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے۔ تو نہیں جانتا، شاید خدا اس کے بعد کوئی اور نئی وضع (اور اصلاحی ذریعہ) فراہم کر دے۔

تفسیر

طلاق اور علیحدگی کی شرائط

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی اہم ترین بحث وہی طلاق کے بارے میں ہے کہ جو اس کی پہلی آیت سے شروع ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے عظیم پیشوا و رہبر کے عنوان سے رُوئے سُخن پیغمبرؐ اسلام کی طرف کیا، اور اس کے بعد ایک عمومی حکم جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انھیں عدّت کے زمانہ میں طلاق دو"۔ (یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن)۔

یہ ان پانچ احکام میں سے پہلا حکم ہے جو اس آیت میں آئے ہیں جیسا کہ مفسّرین نے اِس سے استفادہ کیا۔ اِس سے مُراد یہ ہے کہ صیغۂ طلاق ایسے زمانہ میں جاری کیا جائے جب عورت اپنی ماہانہ عادت سے پاک ہو گئی ہو اور اپنے شوہر سے اس کی نزدیکی نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ سورہ بقرۃ کی آیت ۲۲۸ کے مطابق عدت طلاق "ثلاثۃ قروء" (تین مرتبہ پاک ہونے) کی مقدار میں ہونی چاہیے۔ اب یہاں یہ تاکید کرتا ہے کہ طلاق عدت کے آغاز کے ساتھ ہو۔ اور یہ اس صُورت میں ممکن ہے کہ جب طلاق پاکیزگی کی حالت میں اختلاطِ جنسی کے بغیر متحقق ہو۔ اگر طلاق حیض کے زمانہ میں واقع ہو جائے تو عدت کے زمانہ کا آغاز، طلاق کے آغاز سے جُدا ہو جائے گا۔ اور عدت کا آغاز پاک ہونے کے بعد ہو گا۔

اسی طرح سے اگر عورت ایسی طہارت کی حالت میں ہو کہ اس نے اپنے شوہر سے نزدیکی کی اور جدا ہونا مسلّم ہُوا ہو، کیونکہ اس قسم کی پاکیزگی اختلاط جنسی کی بناء پر رحم میں نطفہ کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجیے۔)

بہر حال یہ طلاق کی پہلی شرط ہے۔

متعدّد روایات میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہُوا ہے کہ:

"جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کی ماہانہ عادت میں طلاق دے تو اس طلاق کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور پلٹ آنا چاہیے، یہاں تک کہ عورت پاک ہو جائے"۔ اس کے بعد اگر وہ طلاق دینا چاہتا ہے تو دے دے"۔ [۱]

یہی مطلب روایاتِ اہلِ بیتؑ میں بھی بارہا بیان ہوا۔ یہاں تک کہ آیت کی تفسیر کے عنوان سے بھی ذکر ہُوا ہے۔[۲]

اس کے بعد دُوسرے حکم کو، جو عدت کا حساب رکھنے کا مسئلہ ہے، پیش کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "عورت

---

[۱] یہ روایات کتاب "الطلاق" صحیح مسلم جلد ۲ میں صفحہ ۱۹۰۳ کے بعد نقل ہُوئی ہیں۔ [۲] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۳۴۸ "باب کیفیۃ طلاق العدۃ" ۱۱

کا حساب رکھو" (واحصوا العدّة)۔

غور کے ساتھ ملاحظہ کیجیے کہ عورت تین مرتبہ اپنی پاکیزگی کے دن ختم کرے اور ماہانہ عادت دیکھے، جب تیسرا دورِ پاکیزگی ختم ہو اور تیسری ماہانہ عادت میں داخل ہو تو اس کے ایّامِ عدّت کی مُدّت آخر کو پہنچی اور ختم ہوئی۔

اگر اس امر میں غور نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ عدّت کا دَور ضروری مقدار سے زیادہ شمار ہو جائے، اور عورت کو کچھ ضرر اور نقصان پہنچے، کیونکہ یہ چیز اُسے نئے نکاح اور ازدواج سے مانع ہوگی۔ اگر یہ مُدّت کمتر ہو تو عدّت کے اصلی ہدف کی رعایت نہیں ہوگی کہ جو پہلے ازدواج کے حریم کی حفاظت اور انعقاد نطفہ کا مسئلہ ہے۔

"احصوا"، "احصاء" کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، اور اصل میں "حصیٰ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی سنگریزہ کے ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں بہت سے لوگ جبکہ وہ پڑھنے لکھنے سے آشنا نہیں تھے، مختلف موضوعات کا حساب کتاب سنگریزوں کے ذریعے رکھتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے: عدّت کا حساب رکھنے کے مخاطب مرد ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفقہ اور مسکن کا مسئلہ ان کے ذمّہ ہے۔ اسی طرح حقِ رجُوع بھی انھیں کو حاصل ہے ورنہ عورتیں بھی مُوظف ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کے واضح ہونے کے لیے پورے غور کے ساتھ عدّت کا حساب رکھیں۔

اس حکم کے بعد تمام لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اس خُدا سے ڈرو جو تمھارا پروردگار ہے اور تقویٰ اختیار کرو" (واتقوا الله ربّکم)۔

وہ تمھارا پروردگار اور مُربّی ہے اور اس کے احکام تمھاری سعادت کے ضامن ہیں۔ اِس بناء پر اس کے فرامین پر کاربند ہو جاؤ، اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ خصوصًا طلاق اور عدّت کا حساب رکھنے میں دقّت سے کام لو۔

اس کے بعد تیسرے اور چوتھے حکم کے بارے میں، جن میں سے ایک شوہروں اور دوسرا بیویوں سے مربوط ہے۔ فرماتا ہے: "تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اور وہ بھی عدّت کے دوران گھروں سے باہر نہ نکلیں" (لا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن)۔

اگرچہ بہُت سے بے خبر اس حکمِ اسلامی کو طلاق کے وقت اصلاً جاری نہیں کرتے اور محض صیغۂ طلاق کے جاری ہوتے ہی مرد بھی خود کو آمادہ کرتا ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکال دے اور عورت بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیتی ہے کہ شوہر کے گھر سے نکل کر اپنے عزیزوں کے گھر واپس چلی جائے۔ لیکن یہ اسلامی حکم بہت ہی اہم فلسفہ کا حامل ہے، کیونکہ یہ عورت کے احترام کے علاوہ عام طور پر شوہروں کی طلاق سے بازگشت اور رشتۂ زوجیت کے استحکام کے لیے بھی اسباب فراہم کرتا ہے۔

اِس اہم اسلامی حکم کو نظرانداز کر دینے سے، جو قرآن کے متن میں آیا ہے، بہُت سی طلاقیں دائمی جدائی کا سبب بن جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر اس حکم کا اجرا ہوتا تو یہ اکثر زوجین کی صُلح اور نئے سرے سے بازگشت پر

منتہی ہوتا۔

لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ طلاق کے بعد عورتوں کو گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پانچویں حکم کا استثناء کی صورت میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "سوائے اس صورت کے کہ وہ عورتیں کسی واضح بُرے کام کو انجام دیں" (الا ان یأتین بفاحشة مبینة)۔

مثلاً وہ شوہر اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ اس قدر ناسازگاری، بدخلقی اور بدزبانی کرے کہ اُسے گھر میں رکھنا زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے۔

یہ بات کئی ایک روایات میں نظر آتی ہے، جو آئمہ اہلِ بیت سے نقل ہوئی ہیں۔[1]

البتہ اس سے مُراد ہر قسم کی مخالفت اور جُزئی ناسازگاری نہیں ہے، کیونکہ لفظ فاحشہ کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ کوئی بہت بُرا کام ہو گیا ہے، خاص طور پر جب کہ وہ 'مُبیّنہ' کی صفت سے بھی موصوف ہُوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فاحشہ" سے مُراد عفّت اور پاکدامنی کے منافی عمل ہے، اور یہ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہُوا ہے۔ اس صورت میں خارج کرنے سے مُراد اجراء حد کے لیے باہر لے جانا اور واپس گھر میں لے آنا ہے۔

ان دونوں معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے کے بعد پھر تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "یہ خدائی حدود ہیں اور جو شخص حدودِ الٰہی سے تجاوز کرے تو اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے" (وتلك حدود الله ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه)۔

کیونکہ یہ قوانین اور احکامِ الٰہی خود مکلّفین کے مصالح کے ضامن ہیں اور ان سے تجاوز کرنے سے، چاہے وہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، خود ان کی سعادت پر ضرب لگتی ہے۔

آیت کے آخر میں عدّت کے فلسفہ اور عورت کے گھر اور اصلی اقامت گاہ سے باہر نہ نکلنے کی علّت کی طرف ضمناً اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تو نہیں جانتا کہ خدا اس واقعہ کے بعد نئی وضع اور اصلاح کا ذریعہ فراہم کر دے" (لا تدری لعل الله یحدث بعد ذالك امرًا)۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیظ و غضب کا وہ طُوفان رُک جائے گا جو عام طور طلاق و جدائی کے معاملہ میں ناگہانی فیصلوں کا موجب بن جاتا ہے۔ چنانچہ عدّت کی مُدّت میں عورت کا ہر وقت مرد کے ساتھ ہونا، نیز خصوصاً جہاں اولاد کا معاملہ بھی درمیان میں ہو ایسے میں ایک دُوسرے سے محبّت کا اظہار رجوع کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور دشمنی و عداوت کے تیرہ و تار بادلوں کو ان کے آسمان زندگی سے دُور کر دیتا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۰، ۳۵۱، حدیث ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

یہاں قابلِ توجہ بات یہ ہے اور امام باقرؑ سے بھی مروی ہے:

"المطلقة تكتحل و تختضب وتطيب وتلبس ما شائت من الثياب لان الله عزّوجل يقول لعل الله يحدث بعد ذالك امرًا لعلها ان تقع في نفسه فيراجعها"

"مطلقہ عورت اپنی عدّت کے دوران آرائش کرے، آنکھ میں سُرمہ لگائے، اپنے بالوں کو رنگین کرے، اپنے آپ کو معطّر کرے اور ہر وہ لباس جو اُسے پسند ہو پہنے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے: شاید خدا اس واقعہ کے بعد کوئی نئی کیفیت فراہم کر دے اور ممکن ہے کہ اس طریقہ سے عورت دوبارہ شوہر کے دل کو مسخر کرے اور مرد رجوع کرے۔"[1]

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عام طور پر علیحدگی اور طلاق کا ارادہ جلد گزر جانے والے ہیجانوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو وقت کے گزرنے اور مرد و عورت کے ایک مدّت تک، جو نسبتًا طولانی (عدّت) ہوتی ہے، مسلسل معاشرت کرنے اور انجام کار غور و فکر کرنے سے معاملہ کلّی طور پر بدل جاتا ہے۔ اور بہت سی علیحدگیوں اور طلاقوں میں صُلح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذکورہ اسلامی احکامِ عدّت کے زمانہ میں عورت کے سابق شوہر کے گھر میں رہنے پر دِقّت کے ساتھ عمل ہو۔ انشاء اللہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ یہ سب امور "طلاق رجعی" کے بارے میں ہیں۔

چند نکات

۱۔ طلاق حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زوجیت کی قرارداد ایک ایسی قرارداد ہے کہ جسے جُدائی کے قابل ہونا چاہیئے، کیونکہ بعض اوقات ایسے علل و اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو عورت اور مرد کی مشترکہ زندگی کو غیر ممکن یا مشکلات اور مفاسد سے بھر دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم یہ اصرار کرتے رہیں کہ یہ قرارداد ابد تک باقی رہے تو یہ بات بہت زیادہ مشکلات کا سرچشمہ بن جاتی ہے، لہٰذا اسلام نے اصل طلاق کے ساتھ موافقت کی ہے۔ آج ہم عیسائی معاشروں میں طلاق کے بالکل ممنوع ہونے کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو عیسائی مذہب کے تحریف شدہ قانون کے حکم کے مطابق طلاق کو ممنوع شمار کرتے ہیں۔ قانونی طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے شوہر و زوجہ ہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۲ حدیث ۲۴

سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہر ایک نے اپنے لیے ایک غیر رسمی بیوی یا شوہر کا انتخاب کر رکھا ہے۔

اس بناء پر اصل مسئلہ طلاق ایک ضرورت ہے لیکن ایک ایسی ضرورت جسے ایک ممکن حد تک کم ہونا چاہیے، اور جب تک زوجیت کو برقرار رکھنے کی راہ ہو کوئی اس پر عمل نہ کرے۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں شدت کے ساتھ طلاق کی مذمت کی گئی اور اسے (مبغوض ترین حلال) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت میں آیا ہے:

"ما من شیء ابغض الی اللہ عزوجل من بیت یخرب فی الاسلام بالفرقة یعنی الطلاق"

"خداوند تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل اس سے زیادہ قابلِ نفرت نہیں ہے کہ اسلام میں کسی گھر کی بنیاد جدائی (یعنی طلاق) کے ساتھ ویران ہو۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"ما من شیء مما احله الله ابغض الیه من الطلاق"

"حلال امور میں سے کوئی چیز خدا کی بارگاہ میں طلاق سے زیادہ مبغوض نہیں ہے۔"[2]

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"تزوجوا ولا تطلقوا، فان الطلاق یهتز منه العرش"

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو۔ کیونکہ طلاق عرشِ خدا کو لرزا دیتی ہے۔"[3]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ طلاق، عورتوں، مردوں، خاندانوں اور خصوصاً اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دیتی ہے، جنھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: عاطفی مشکلات اس میں شک نہیں کہ وہ مرد اور عورت جو کئی سالوں یا مہینوں سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، طلاق کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ عاطفی و جذباتی لحاظ سے مجروح ہوں گے اور آئندہ کے ازدواج میں انہیں اس کی تلخ یاد ہمیشہ پریشان کرے گی، یہاں تک کہ دوسری بیوی یا شوہر کو ایک قسم کی بدبینی اور سوءِظن کے ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کے نقصان دہ آثار کسی پر مخفی نہیں ہیں۔ اسی لیے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا

۱،۲ وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۲۶۶ (حدیث ۱-۵)

۳ وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۲۶۸ (حدیث ۷)

قسم کی عورتیں اور مرد ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے سے اعراض کرتے رہتے ہیں۔

۲: اجتماعی مشکلات طلاق کے بعد بہت سی عورتوں کو شائستہ اور دلخواہ طور پر نئی شادی کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے وہ شدید پریشانی میں گرفتار ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو بھی اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے بعد اپنے مطلب کی شادی کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ خصوصاً اگر درمیان میں بچوں کا معاملہ بھی ہو۔ تب وہ اکثر ایسی شادی کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں جو انھیں امن و سکون نہیں پہنچاتی اور اس بناء پر آخر زندگی تک رنج و تکلیف میں مُبتلا رہتے ہیں۔

۳: اولاد کی مشکلات اولاد کی مشکل ان سب سے زیادہ اہم ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ سوتیلی مائیں سگی ماں کی طرح شفیق و مہربان ہوں یعنی وہ اس اولاد میں شفقت و محبت کے خلا کو پُر کرسکے جو ماں کی محبت بھری گود سے جُدا ہوئی ہے۔ اسی طرح سے اگر عورت اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے تو سوتیلے باپ کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ البتہ کچھ عورتیں اور مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی اولاد کے لیے شفیق و مہربان اور وفادار ہوتے ہیں لیکن مسلہ طور پر ان کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے، اسی وجہ سے طلاق کے بعد بیچاری اولاد بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوجاتی ہے۔ شاید ان میں سے اکثر بچے آخر عمر تک روحانی سکون سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک ایسا نقصان ہے جو نہ صرف اس گھرانے کے لیے بلکہ پُورے معاشرے کے لیے ہے، کیونکہ اس قسم کے بچے جو ماں یا باپ یا دونوں کی محبت سے محرُوم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات خطرناک افراد کی صُورت اختیار کرلیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مناسب توجہ نہ ہونے کی وجہ سے انتقام جوئی کے جذبہ کے زیر اثر آجاتے ہیں اور اپنا انتقام پُورے مُعاشرے سے لیتے ہیں۔

اگر اسلام نے طلاق کے بارے میں اس قدر سخت گیری کی ہے تو اس کی وجہ یہی نقصان وہ نتائج ہیں جو مختلف جہات میں نمُودار ہوتے ہیں۔

اسی بناء پر قرآن مجید بھی صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ جس وقت عورت اور مرد کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں کے عزیز و اقارب ان میں اصلاح کی کوشش کریں۔ وہ لوگ ایک "خاندانی صلح کمیٹی" بنا کر دونوں میاں بیوی کو شرعی عدالت تک جانے اور طلاق و جدائی کے عمل سے روکیں۔

(ہم نے صلح کمیٹی کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سورہ نساء کی آیت ۳۵ کے ذیل میں بیان کی ہے۔)

اسی بناء پر جو چیز عورت اور مرد میں خوش بینی اور خاندانی تعلقات کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں مدد دے وہ اسلام کی نظر میں محبوب ہے اور جو اسے متزلزل کرے وہ بُری اور قابلِ نفرت ہے۔

❊ ❊ ❊

۲ : اسبابِ طلاق

دُوسرے اجتماعی امور میں پیدا ہونے والے اختلافات کی طرح طلاق کی بھی مختلف وجوہات ہوتی ہیں کہ جن کا دقیق مطالعہ اور مقابلہ کیے بغیر ایسے حادثہ کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ہم طلاق کے عوامل کو معلوم کریں اور معاشرے میں اس کی جڑوں کو ختم کریں۔ اگرچہ یہ عوامل بہت زیادہ ہیں لیکن ان میں سے ذیل کے اُمور زیادہ اہم ہیں :

الف : عورت یا مرد کی غیر محدود توقعات ، جُدائی اور علیٰحدگی کے اہم ترین عوامل میں سے ایک ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک اپنی توقع کے دامن کو محدود کر دے ، خواب وخیال کی دُنیا سے باہر نکل آئے ، طرفِ مقابل کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور جتنی اس کی حدود میں ممکن ہو اتنی ہی توقع رکھے تو بہت سی طلاقوں کو روکا جا سکتا ہے۔

ب : بہت سے گھرانوں میں حُسن پرستی اور اسراف وتبذیر کی رُوح کا کارفرما ہونا ایک اور اہم عامل ہے جو خاص طور پر عورتوں کو ہمیشہ کے لیے ناراضی کی حالت میں رکھتا اور طرح طرح کے بہانوں سے طلاق و جُدائی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ج : دونوں میاں بیوی کی خصُوصی زندگی خصُوصًا ان کے اختلافات میں عزیز و اقارب اور جان پہچان والوں کی بے جا مداخلتیں طلاق کا ایک اور اہم عامل شمار ہوتی ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اگر وہ دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلافات کے ظہور کے وقت انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں اور اِس کی یا اُس کی جانبداری میں اختلاف کی آگ کو ہوا نہ دیں تو زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہ آگ خاموش ہو جاتی ہے۔ لیکن دونوں طرف کے لوگوں کی مداخلت کہ جو اکثر تعصب اور ناروا محبتوں کے ساتھ ہوتی ہے ، وہ مُعاملے کو دن بدن مشکل اور پیچیدہ تر بناتی رہتی ہے۔

البتہ یہ بات اس معنی میں نہیں ہے کہ عزیز و اقارب ہمیشہ ہی اپنے آپ کو ان اختلافات سے دور رکھیں ، بلکہ مُراد یہ ہے کہ وہ انھیں معمولی اختلافات میں ان کی حالت پر چھوڑ دیں۔ لیکن جب اختلافات کُلی صورت میں جڑ پکڑ لیں تو پھر طرفین کی مصلحت پر توجہ رکھتے ہُوئے اور ہر طرح کی تعصب آمیز جانبداری سے اجتناب اور پرہیز کرتے ہُوئے مداخلت کریں اور فریقین کی صلح کے مقدمات فراہم کریں۔

د : عورت اور مرد کا ایک دُوسرے کی خواہش کے بارے میں بے اعتنائی کرنا خصوصًا ان چیزوں سے جو عاطفی اور جنسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ہر مرد یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بیوی پاک وصاف اور پُرکشش رہے۔ اسی طرح ہر بیوی بھی اپنے شوہر سے یہی توقع رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایسے اُمور ہیں جن

کے اظہار کے لیے وہ عام طور پر تیار نہیں ہوتے ۔ یہ وہ مقام ہے کہ طرف مقابل کا بے اعتنائی برتنا اپنی ظاہری وضع قطع کا خیال نہ رکھنا ، ضروری تزئین کو ترک کر دینا ، اور پریشان بال اور گندہ رہنا ، بیوی یا شوہر کو اس قسم کی ازدواجی زندگی سے سیر کر دیتا ہے ۔ خاص طور پر اگر ان کی زندگی کے ماحول میں ایسے افراد بھی رہتے ہوں جو ان امُور کی رعایت کرتے ہوں لیکن وہ اس مسئلہ سے بالکل ہی بے اعتنائی کریں ۔

اسی لیے اسلامی روایات میں اس مطلب کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

"لا ینبغی للمرئة ان تعطل نفسها"

"عورت کے لیے یہ بات سزاوار نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے زینت و آرائش کیے بغیر رہے ۔"[1]

ایک اور حدیث سے امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"ولقد خرجن نساء من العفاف الی الفجور ما اخرجهن الا قلة تهيئة ازواجهن"

"بہت سی عورتیں جادۂ عفت سے خارج ہوگئیں اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ ان کے شوہر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے تھے ۔"[2]

ھ : عورت اور مرد کے گھرانے کے تمدن اور رہنے سہنے کے طریقوں کا ایک دوسرے سے مناسبت نہ رکھنا بھی طلاق کا ایک اہم عامل ہے ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بیوی یا شوہر کے انتخاب سے پہلے بڑی دقت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے ۔ انھیں "کفو شرعی" یعنی مسلمان ہونے کے علاوہ "کفو فرعی" بھی ہونا چاہیے ۔ یعنی ان دونوں کے درمیان مختلف جہات سے ضروری مناسبتوں کی رعایت ہونی چاہیئے اس اہتمام کے بغیر اس قسم کی شادیوں کے ٹوٹ جانے پر تعجب نہیں کرنا چاہیے ۔

۳ : عدّت کا فلسفہ

اس میں شک نہیں ہے کہ عدت کی دو بنیادی وجوہات ہیں جن کی طرف قرآن مجید اور اسلامی روایات میں اشارہ ہُوا ہے :

اوّل : نسل کی حفاظت اور عورت کی وضع و حالت کا حاملہ ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے مشخص ہونا ۔

---

[1] ، [2] مکارم الاخلاق ص ۹۱ ، ۱۰۷

دوئم : پہلی زندگی کی طرف پلٹ آنے اور علیٰحدگی کے عوامل کو ختم کرنے کا وسیلہ ہونا کہ جس کی طرف اوپر والی آیت میں ایک لطیف اشارہ ہُوا تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اسلام اس مسئلہ میں یہ تاکید کرتا ہے کہ عورت عدّت کے زمانہ میں اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہے۔ اِس طرح طبعی طور پر ان کے درمیان چند ماہ کی ایک مسلسل معاشرت رہے گی جو انھیں اِس بات کا موقع فراہم کرے گی کہ وہ علیٰحدگی کے مسئلہ کا جلد گزر جانے والے ہیجانات سے بالاتر ہو کر حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔

خصوصاً طلاقِ رجعی [1] کے سلسلہ میں کہ جہاں زوجیت کی طرف لوٹنا کسی قسم کے تکلفات کا محتاج نہیں۔ اور ہر ایسا قول یا فعل، جو مرد کے بازگشت کی طرف مائل ہونے پر دلالت کرے، وہ رجُوع شمار ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ عورت کے بدن پر شہوت کے ساتھ یا بغیر شہوت کے ہاتھ رکھ دے، چاہے رجوع کا ارادہ نہ ہو تو بھی وہ رجُوع ہی شمار ہوگا۔

اِس طرح سے اگر یہ مدّت ان شرائط کے ساتھ گزر جاتے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں، اور وہ دونوں آپس میں صلح نہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعتاً وہ مشترک زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے۔

---

[1] "طلاق رجعی" سے مراد وہ طلاق ہے جو پہلی یا دوسری مرتبہ دی جاتی ہے اور جدائی کا ارادہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ اِس طرح سے عورت نہ اپنے حق مہر کو اور نہ دوسرے مال کو خرچ کرتی ہے۔

(۲) فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ

(۳) وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ○

ترجمہ

(۲) جب ان کی عدت ختم ہو جائے تو پھر یا تو شائستہ طور پر انھیں روک لو یا شائستہ طریقہ سے ان سے جُدا ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو عادل مردوں کو گواہ بنالو، اور خدا کے لیے شہادت کو قائم کرو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے لیے کوئی نہ کوئی نجات کی راہ فراہم کر دیتا ہے۔

(۳) اور اسے ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتا ہے جس کا اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو

شخص خدا پر توکّل کرے تو خدا اس کے امر کی کفایت کرتا ہے۔ خدا اپنے امر کو انجام تک پہنچا کر رہتا ہے۔ اور خدا نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

تفسیر

صلح یا پسندِ خدا علیٰحدگی

طلاق سے مربُوط مباحث جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں ان کو جاری رکھتے ہُوئے پہلی زیرِ بحث آیت میں چند مزید احکام کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پہلے فرماتا ہے: "جب ان کی عدت کی مدّت آخر کو پہنچ جائے تو انھیں شائستہ طور پر، رجوع کے طریق سے، روک لو یا شائستہ طور پر ان سے الگ ہو جاؤ"۔ (فاذا بلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او فارقوھن بمعروف)۔

"بلوغ اجل" (مدّت کے آخر کو پہنچنے) سے مُراد یہ نہیں ہے کہ عدت کی مدت پُورے طور پر ختم ہو جائے بلکہ مُراد مدّت کا آخری دنوں تک پہنچنا ہے، ورنہ عدّت کے ختم ہو جانے پر رجوع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ انھیں روک رکھنا عقدِ جدید کے صیغہ کے ذریعہ ہو، لیکن یہ معنی آیت سے بہت بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال اس آیت میں ازدواجی زندگی سے مربُوط ایک اہم ترین اور مناسب ترین حکم پیش ہوا اور وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد یا تو شائستہ طور پر آپس میں زندگی بسر کریں یا پھر شائستہ طریقے سے ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں۔ جس طرح مشترک زندگی کو صحیح اصول، انسانی طرز اور شائستہ اور مناسب طور پر ہونا چاہیے، اسی طرح سے جدائی بھی ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے، بدگوئی اور ناسزا کہنے، ظلم وستم اور حقوق ضائع کرنے سے خالی ہونی چاہیے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح تعلقات صلح صفائی کے ساتھ انجام پائیں اسی طرح علیٰحدگیاں بھی افہام وتفہیم کے ساتھ ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے یہ مرد اور عورت مستقبل میں دوبارہ مشترک زندگی کی سوچ لیں لیکن جُدائی کے وقت بدسلوکیاں ان کی فکری فضا کو اس طرح سے تیرہ و تاریک بنا دیتی ہیں کہ بازگشت کی راہ ان کے لیے بند کر دیتی ہیں اور بالفرض اگر وہ نئے سرے سے ازدواج کرنا بھی چاہیں تو مناسب فکری اور عاطفی ذریعہ موجود نہیں ہوتا۔ دوسری طرف آخر وہ مسلمان ہیں اور ایک ہی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا مخاصمت اور ناشائستہ طریقے سے جدائی نہ صرف انھیں میں اثر انداز ہوگی، بلکہ دونوں کے خاندانوں میں بھی نقصان دہ اثرات چھوڑے گی۔ اور بعض حالات میں آئندہ کے لیے بھی ان کی ہمکاریوں کا سلسلہ کلّی طور پر برباد کر دے گی۔

واقعاً یہ کتنی اچھی بات ہے کہ نہ صرف ازدواجی زندگی میں بلکہ ہر قسم کی دوستی اور مشترک عمل میں بھی جہاں تک ہو

سکے، انسان شائستہ اور مناسب ہمکاری کو جاری رکھے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر شائستہ طور پر جدا ہو جائے، کیونکہ شائستہ طور پر جدائی بھی طرفین کے لیے ایک قسم کی کامیابی اور موفقیت ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ "اساک بمعروف" اور "فراق بہ معروف" وسیع معنی رکھتے ہیں یہ ہر قسم کے واجب و مستحب شرائط اور اخلاقی کاموں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور اسلامی و اخلاقی آداب کے ایک مجموعہ کو ذہن میں مجسّم کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "تم طلاق اور جدائی کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے شاہد و گواہ بنالو"۔ (واشهدوا ذوى عدل منکم)۔

تاکہ اگر آئندہ کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو طرفین میں سے کوئی انکار نہ کر سکے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ گواہ بنانا طلاق کے سلسلہ میں اور رجوع کرنے کے سلسلہ میں بھی ہے۔ لیکن چونکہ رجوع بلکہ تزویج کے وقت بھی گواہ بنانا قطعاً واجب نہیں ہے، لہٰذا اس بناء پر اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ اوپر والی آیت رجوع کو بھی شامل ہے تو یہ اس سلسلے میں ایک مستحبی حکم ہوگا۔

تیسرے حکم میں گواہوں کی ذمہ داری کو اس طرح بیان کرتا ہے: "شہادت کو خدا کے لیے قائم کرو"۔ (و اقیموا الشهادة لله)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دونوں میں سے کسی ایک طرف قلبی میلان، حق کی شہادت سے مانع ہو جائے۔ لہٰذا رضائے خدا اور حق کو قائم کرنے کے سوا اور کسی چیز کو اس میں راہ نہیں پانا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گواہوں کو عادل ہونا چاہیے، لیکن عدالت کے باوجود بھی گناہ کا صدور محال نہیں ہے۔ اس بناء پر انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے نگران ہوں اور جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر حق کی راہ سے منحرف نہ ہوں۔

ضمناً "ذوى عدل منکم" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں گواہ مسلمان، عادل اور مرد ہونے چاہئیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے تمام گزشتہ احکام کے متعلق مزید کہتا ہے: "صرف وہ لوگ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اس وعظ و نصیحت سے سبق حاصل کرتے ہیں"۔ (ذالکم یوعظ به من کان یؤمن بالله والیوم الأخر)۔

بعض ذالکم کو صرف خدا کی طرف توجہ کرنے اور گواہوں کی طرف سے عدالت کی رعایت کرنے کے مسئلہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور طلاق کے بارے میں گزشتہ تمام مسائل کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

بہر صورت یہ تعبیر ان احکام کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے، اس طرح کہ اگر کوئی شخص ان کی رعایت نہیں کرتا اور ان سے وعظ و نصیحت حاصل نہیں کرتا تو گویا وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ بعض اوقات آئندہ کی معیشت اور زندگی سے مربوط مسائل یا دوسری گھریلو مجبوریاں، اس بات کا سبب بن جاتی ہیں کہ میاں بیوی طلاق کے وقت یا رجوع کے وقت یا دونوں گواہ شہادت دینے کے وقت حق و عدالت

کی راہ سے منحرف ہو جائیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے : "جو شخص خدا سے ڈرے اور گناہ کو ترک کر دے تو خدا اس کے لیے نجات کی راہ قرار دے دیتا ہے اور اس کی زندگی کی مشکلات کو حل کر دیتا ہے" (و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا)۔

٭ ٭ ٭

"اور اس کو ایسی جگہ سے جس کا اُسے گمان بھی نہ ہو گا روزی دے گا" (و یرزقہ من حیث لا یحتسب)۔

"اور جو شخص خدا پر توکّل کرے اور اپنا امر اس کے سپرد کر دے تو خدا اس کی کفایت کرتا ہے" (و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ)۔

"کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا فرمان ہر چیز میں نافذ ہے۔ اور جس کام کا وہ ارادہ کرے اُسے انجام دے دیتا ہے" (ان اللہ بالغ امرہ)۔

"لیکن خدا نے ہر کام اور ہر چیز کے لیے ایک اندازہ اور حساب قرار دیا ہے" (قد جعل اللہ لکل شیءٍ قدرًا)۔

اِس طرح سے وہ مردوں، عورتوں اور گواہوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ حق کی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور عدالت کو جاری کریں۔ پھر اپنے مشکل کاموں کی کشائش خدا سے چاہیں کہ خدا نے یہ ضمانت لی ہے کہ وہ پرہیزگاروں کی مشکل کو حل کرے گا اور انھیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جہاں سے خود انھیں بھی گمان نہیں ہو گا۔

خدا نے ضمانت دی ہے کہ جو توکّل کرے گا وہ مصیبت میں گرفتار نہیں رہے گا، اور خدا اس ضمانت کے ادا کرنے پر قادر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ آیات طلاق اور اس سے مربوط احکام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ان کا مضمون وسیع ہے جو دیگر موارد کو بھی شامل ہے۔ یہ خدا کی طرف سے تمام پرہیزگاروں اور توکّل کرنے والوں کے لیے ایک امید بخش وعدہ ہے کہ انجام کار لطفِ الٰہی انھیں اپنی پناہ میں لے لے گا، انھیں مشکلات کے پیچ و خم سے گزار دے گا، سعادت کے تابناک افق کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا، معیشت کی سختیوں کو برطرف کر دے گا اور مشکلات کے تیرہ و تاریک بادلوں کو ان کی زندگی کے آسمان سے ہٹا دے گا۔

"قد جعل اللہ لکل شیءٍ قدرًا" کا جملہ اس نظام کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو عالم تشریع و تکوین پر حاکم ہے۔ یعنی یہ احکام جو خدا نے طلاق وغیرہ کے بارے میں صادر فرمائے ہیں سب کے سب ایک حساب اور دقیق حکیمانہ اندازے کے مطابق ہیں۔

اسی طرح سے وہ مشکلات جو انسان کی زندگی میں ازدواجی مسئلہ میں یا کسی اور مسئلہ میں رُونما ہوں، ان میں سے ہر ایک کا اندازہ و حساب اور مصلحت و اختتام ہوتا ہے۔ انھیں ان حوادث کے ظاہر ہونے پر گھبرانا نہیں چاہیے اور زبان پر گلہ اور شکوہ کے الفاظ نہیں لانے چاہئیں۔ نیز مشکلات کے حل کے لیے خلاف تقویٰ

سے متوسّل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تقویٰ اور خودداری کے ساتھ ان سے جنگ کرنی چاہیے اور ان کا حل خدا سے طلب کرنا چاہیے۔

❁ ❁ ❁ ❁

چند نکات

۱: مشکلات سے نجات اور تقویٰ

اوپر والی آیات قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید دلانے والی آیات ہیں۔ ان کی تلاوت دل کو صفائی اور روح کو نور و روشنی بخشتی ہے۔ یہ تلاوت یاس و ناامیدی کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے، دل میں امید کی حیات بخش شعاعیں چمکاتی ہے اور تمام پرہیزگار اور باتقویٰ افراد کو نجات اور حل مشکلات کا وعدہ دیتی ہے۔

ایک حدیث میں ابوذر غفاری سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انی لا علم اٰیة لو اخذ بها الناس لکفتهم و من یتق الله یجعل له مخرجًا ... فما زال یقولها ویعیدها۔"

"میں ایک ایسی آیت کو پہچانتا ہوں کہ اگر تمام انسان اس کے دامن کو تھام لیں تو وہ ان کی مشکلات کے حل کے لیے کافی ہے۔" اس کے بعد آپ نے آیۃ "ومن یتق الله" کی تلاوت فرمائی اور اس کی بار بار تکرار فرماتے رہے[۱]

ایک اور حدیث میں رسولِ خداؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

"من شبهات الدنیا و من غمرات الموت و شدائد یوم القیامة۔"

"خدا پرہیزگاروں کو دنیا کے شبہات، موت کی سختی اور روزِ قیامت کے شدائد سے رہائی بخشے گا۔"[۲]

یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ تقوےٰ کے لیے امور کی کشائش دنیا میں ہی منحصر نہیں بلکہ قیامت کو بھی شامل ہے۔

ایک اور حدیث میں بھی آنحضرتؐ سے آیا ہے:

"من اکثر الاستغفار جعله الله له من کل همّ فرجًا و من کل ضیق مخرجًا۔"

۱۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶ ۲۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۶ حدیث ۴۴

"جو شخص کثرت سے استغفار کرے گا (اور لوحِ دل کو گناہوں کے زنگ سے دھوئے گا) تو خدا اس کے لیے ہر غم و اندوہ سے کشائش اور ہر تنگی سے نجات کی راہ قرار دے گا"۔[1]

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اوپر والی پہلی آیت عوف بن مالک کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اصحابِ پیغمبر میں سے تھا اور دشمنانِ اسلام نے اس کے بیٹے کو قید کر لیا تھا۔ وہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا، اس واقعے اور فقر و فاقہ، نیز تنگدستی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا تقوٰی اختیار کر، صبر کر اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کا بہت زیادہ ذکر کیا کر۔ اس نے اس کام کو انجام دیا تو اچانک جبکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اس کا بیٹا دروازے سے اندر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دشمن کی غفلت کے ایک لمحہ سے فائدہ اٹھا کر بھاگ آیا ہے، یہانتک کہ دشمن کا اونٹ بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ یہ وہ مقام تھا جس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس باتقوٰی شخص کی مشکل کی کشائش اور جہاں سے توقع نہیں تھی وہاں سے روزی کی خبر دی۔[2]

اِس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان سعی و کوشش کو بالکل ہی ترک کر دے اور یہ کہے کہ میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا، تقوٰی اختیار کروں گا اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ذکر کرونگا یہاں تک کہ جہاں سے مجھے گمان بھی نہیں ہے میری روزی پہنچ جائے گی۔ نہیں! آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ تقوٰی و پرہیزگاری کا مقصد سعی و کوشش کے ساتھ ہے۔ اگر اس حالت میں انسان پر دروازے بند ہوں گے تو خدا نے انکے کھولنے کی ضمانت لی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کا صحابی عمر بن مسلم ایک مدت تک آپ کی خدمت میں نہ آیا۔ حضرت نے اس کے حالات دریافت فرمائے تو لوگوں نے بتلایا کہ اس نے تجارت چھوڑ دی، اور عبادت کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا: وائے ہو اس پر:

"اما علم ان تارك الطلب لا يستجاب له"

"کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ جو شخص سعی و کوشش اور روزی طلب کرنے کو ترک کر دے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی"۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۷ حدیث ۴۵

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶، یہی ماجرا "تفسیر فخر رازی" اور روح البیان میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ آیا ہے اور بعض نے ایک سو اونٹ کی تعداد لکھی ہے۔

"اصحاب رسول میں سے ایک جماعت نے جب آیت "و من یتق الله یجعل له مخرجًا و یرزقه من حیث لا یحتسب" نازل ہوئی تو اپنے دروازے بند کر لیے، عبادت میں مصروف ہو گئے، اور انھوں نے کہا: "خدا نے ہماری روزی کا ذمّہ لے لیا ہے۔" اس واقعہ کی اطلاع پیغمبرؐ کو ہوئی تو آپ نے کسی کو ان کے پاس بھیج کر بلوایا اور اُن سے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یا رسولؐ اللہ! چونکہ خدا ہماری روزی کا کفیل ہو گیا ہے لہٰذا ہم عبادت میں مشغول ہو گئے ہیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انه من فعل ذالك لم يستجب له، عليكم بالطلب"۔

"جو شخص ایسا کرے گا اس کی دُعا قبول نہیں ہو گی۔ تم پر لازم ہے کہ سعی و کوشش اور جدّ و جہد کرو۔"[1]

❋ ❋ ❋

۲: روحِ توکّل

خدا پر توکّل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کام کی سعی و کوشش کو اس کے سپرد کر دے اور اور اپنی مشکلات کا حل اسی سے چاہے۔ وہ خدا جو اس کی تمام احتیاجات سے آگاہ ہے، وہ خدا جو اس کے بارے میں رحیم و مہربان ہے، اور وہ خدا جو ہر مشکل کو حل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اب جو شخص روحِ توکّل کا حامل ہے، وہ ہرگز یاس و ناامیدی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ مشکلات کے مقابلہ میں ضعف و زبوں حالی کا احساس نہیں کرتا اور سخت حوادث کے مقابلے میں ڈٹا رہتا ہے۔ اس کا یہی علم و عقیدہ اسے ایسی رُوحانی طاقت دیتا ہے جس سے وہ مشکلات پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری طرف سے غیبی امدادیں کہ توکّل کرنے والوں کو جن کی خوشخبری دی گئی ہے، وہ اس کی مدد کو آ جاتی ہیں اور اُسے شکست و ناتوانی سے نجات بخشتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے خدا کی وحی پہنچانے والے فرشتے جبرئیل سے پوچھا: توکّل کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

العلم بان المخلوق لا يضر ولا ينفع، ولا يعطى ولا يمنع، و استعمال اليأس من الخلق، فاذا كان العبد كذالك لم يعمل لاحد سوى الله و

---

[1] تفسیر صافی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۴ (حدیث ۳۵)

ولم یرج ولم یخف سوی الله ولم یطمع فی احد سوی الله فهٰذا هو التوکل۔"

"توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ مخلوق نہ نقصان پہنچا سکتی ہے نہ ہی نفع، نہ کچھ عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے۔ مخلوق سے کوئی اُمید نہ رکھنا (اور خدا ہی سے لو لگانا) جس وقت ایسا ہو جائے تو پھر انسان خدا کے علاوہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا اور اس کے غیر سے اُمید نہیں کرتا، نہ اس کے غیر سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ دل لگاتا ہے۔ یہ ہے توکل کی روح۔[1]

اس عمیق مضمون کے ساتھ، توکل انسان کو ایک نئی شخصیت بخشتی ہے اور اس کے تمام اعمال میں اثر پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے شب معراج بارگاہِ خداوندی میں سوال کیا

پروردگارا: ای الاعمال افضل؟

"کون سا عمل سب سے افضل و برتر ہے؟"

خداوند متعال نے فرمایا:

"لیس شیء عندی افضل من التوکل علیّ والرضا بما قسمت

"میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے اور جو کچھ میں نے تقسیم کیا ہے اس پر راضی رہنے سے افضل و برتر کوئی چیز نہیں ہے۔"[1]

یہ بات واضح ہے کہ اس معنیٰ میں توکل ہمیشہ جہاد اور سعی و کوشش کے ساتھ ہوتی ہے۔ سستی اور ذمّہ داریوں سے فرار کے ساتھ نہیں ہوتی۔

ہم نے اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں (سورۂ ابراہیمؑ کی آیت ۱۲ کے ذیل میں) ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۶۹ ص ۳۷۳ حدیث ۱۹

وَالّٰٓـِٔي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ④
ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔي لَمْ يَحِضْنَ ؕ
وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ
يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ○
ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ ⑤
يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ○
اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ ⑥
وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ
حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ
اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ
بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ○ؕ
لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ ⑦
رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا
اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ○ع

ترجمہ

(۴) تمھاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے نا امید ہیں، اگر تمھیں ان کی وضع میں (حاملہ حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور اسی طرح سے وہ عورتیں جنھوں نے ابھی ماہانہ عادت نہیں دیکھی ہے۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں۔ اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا، خدا اس پر کام کو آسان کر دے گا۔

(۵) یہ خدا کا فرمان ہے جو اُس نے تم پر نازل کیا ہے اور جو شخص خدائی تقویٰ اختیار کرے گا تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے اجر و ثواب کو بڑھا دے گا

(۶) جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور جو تمھارے اختیار میں ہے، وہاں ان (مطلقہ عورتوں) کو سکونت دو، اور انھیں ضرر نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر تنگ نہ کردو (اور وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں) اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کو نفقہ دو یہاں تک کہ وہ وضع حمل کریں اور اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو تم اس کی اُجرت دو (اور بچوں کے بارے میں معاملے کو) شائستہ مشورے کے ذریعے انجام دو، اور اگر تم میں باہم موافقت نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے کا کام دوسری عورت اپنے ذمہ لے گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس وسیع ذرائع و وسائل ہیں وہ تو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کریں لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خُدا نے انھیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔ خدا کسی شخص کو اس توانائی سے زیادہ جو اس نے اُسے دی ہے تکلیف نہیں دیتا۔ خدا عنقریب سختی کے بعد آسانی قرار دے گا۔

تفسیر

مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق

منجملہ ان احکام کے جو گزشتہ آیات سے معلوم ہوئے ہیں، طلاق کے بعد عدّت پوری کرنے کا ضروری ہونا ہے۔ چونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں عدّت کے مسئلہ میں ان عورتوں کا حکم واضح ہوگیا ہے جو ماہانہ عادت دیکھتی ہیں کہ انھیں تین بار پاکیزہ ہوکر ماہانہ عادت دیکھنی چاہیے۔ جب وہ تیسری مرتبہ ماہانہ عادت میں وارد ہوں تو ان کی عدّت ختم ہو جائے گی، لیکن انھیں میں سے کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو کئی اسباب کی بنا پر ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں یا وہ حاملہ ہوتی ہیں، تو اوپر والی آیات ان عورتوں کے حکم کو واضح کرتے ہوئے عدّت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "تمھاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے نا امید ہوگئی ہیں اگر ان کی وضع وکیفیت میں (حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک کرو تو ان کی عدّت تین ماہ ہے"۔ (واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثة اشھر)۔

اور اسی طرح سے وہ عورتیں بھی جنھوں نے ماہانہ عادت دیکھی ہی نہیں وہ بھی تین ماہ عدّت رکھیں"۔ (واللائی لم یحضن)۔

اس کے بعد تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "حاملہ عورتوں کی عدّت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں"۔ (و اولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن)۔

اس طرح سے اوپر والی آیت میں عورتوں کے دوسرے تین گروہوں کے لیے حکم مشخص ہوگیا ہے۔ یعنی دو گروہوں کو تو تین ماہ تک عدّت رکھنی چاہیے اور تیسرے گروہ، یعنی حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے چاہے وہ طلاق کے ایک لمحہ بعد یا آٹھ ماہ بعد وضع حمل کریں۔

"ان ارتبتم" (اگر تمھیں شک اور تردّد ہو) کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں تین احتمال بیان کیے گئے ہیں:

۱: اس سے مراد وجود "حمل" میں احتمال اور شک ہے، اس معنی میں کہ اگر سن یاس (عام عورتوں میں پچاس سال کے سن اور قرشی عورتوں میں ساٹھ سال کے سن) کے بعد کسی عورت میں وجود حمل کا احتمال ہو تو اُسے عدّت گزارنی چاہیے۔ اگرچہ اس بات کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، لیکن بعض ... ایسا ہُوا ہے (توجہ رہے کہ روایات اور کلمات فقہا میں لفظ "ریبة" حمل میں شک کے معنی میں بارہا آیا ہے) ۔ لہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲ : ایسی عورتیں مُراد ہیں جن کے بارے میں ٹھیک طرح سے معلوم نہ ہو کہ سن یاس کو پہنچی ہیں کہ نہیں۔

۳ : اس مسئلہ کے حکم میں شک اور تردّد مراد ہے۔ اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ اگر تم حکم خدا کو نہیں جانتے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کی عورتیں عدت گزاریں۔ لیکن ان تمام تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ والی یئسن کے جملہ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ عورتیں سن یاس کو پہنچ گئی ہیں۔ ضمناً جب عورتوں کی ماہانہ عادت بیماریوں یا دُوسرے عوامل کی بناء پر منقطع ہو جائے تو وہ اس حکم کی مشمول ہیں یعنی انھیں چاہیے کہ تین ماہ تک عدت گزاریں۔ (اس حکم کو قاعدہ اولویت کے طریق سے یا لفظ آیت کے مشمول سے معلوم کیا جا سکتا ہے) [1]

واللائی لم یحضن" (وہ عورتیں جنھوں نے ماہانہ عادت نہیں دیکھی) کا جملہ ممکن ہے اِس معنی میں ہو کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ گئی ہیں لیکن ابھی ماہانہ عادت شروع نہیں ہوئی۔ اس صورت میں بلاشک وشبہ انھیں تین ماہ تک عدت گزارنی چاہیئے۔ ایک اور احتمال جو علماء نے آیت کی تفسیر میں دیا وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عورتیں ہیں جو ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں، چاہے وہ سن بلوغ تک پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں۔

لیکن ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ اگر عورت سن بلوغ کو نہ پہنچی ہو تو طلاق کے بعد اس کی عدت نہیں ہے، لیکن اس مسئلہ کے مخالف بھی ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں بعض روایات سے استدلال کیا اور اوپر والی آیت کا ظاہر بھی ان کے موافق ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید تشریح کا بھی فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیئے) [2]

وہ شان نزول جو آخری جُملوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اس سے بھی اوپر والی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ شان نزول یہ ہے کہ ابی بن کعب نے حضرت رسولؐ سے عرض کیا کہ بعض عورتوں کی عدت قرآن میں نہیں آئی ہے ان میں غیر بالغ لڑکیاں، کبیرہ (یائسہ) عورتیں اور حاملہ عورتیں ہیں۔ تو اوپر والی آیت نازل ہُوئی اور ان کے احکام بیان کیے گئے۔ [3]

عدت اس صورت میں ہے کہ اس بارے میں حمل کا احتمال ہو، کیونکہ اوپر والی آیت میں یائسہ عورتوں پر عطف ہُوا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دونوں کا حکم یکساں ہے۔ [4]

(حاشیہ صفحہ سابقہ) [1] جواہر جلد ۳۲ ص ۲۴۹۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ باب ۴، از ابواب عدد، حدیث ۷

[1] البتہ فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ عورت جب سن یاس کو پہنچ جائے تو اس کی عدت بالکل نہیں ہے، لیکن اس قول کے مقابلے میں علماءِ قدیم کی ایک تھوڑی سی تعداد عدت کی قائل ہے۔ اور بعض روایات بھی اس پر شاہد ہیں۔ اگرچہ دوسری روایات اس سے معارضہ کرتی ہیں جو بات اوپر والی آیت کے ظاہر سے موافق ہے وہ یہ ہے کہ احتمالِ حمل کی صورت میں وہ عدت رکھتی ہیں۔ اس موضوع کی مزید تشریح فقہی کتابوں میں دیکھنی چاہیے۔

[2] "جواہر الکلام" جلد ۳۲ ص ۲۳۲، اور فقہ کی دوسری کتابیں۔

[3] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۶۰

[4] مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں: تقدیرہ واللائی لم یحضن ان ارتبتم فعدتھن ایضًا ثلاثة اشھر؛

پھر آیت کے آخر میں نئے سرے سے مسئلہ تقویٰ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : "اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا، خدا معاملے کو اس پر آسان کر دے گا۔" (ومن یتق الله یجعل له من امرہ یسرًا)۔

وہ اس کی مشکلات کو اس جہان میں اور دوسرے جہان میں بھی چاہے وہ علیٰحدگی، مسئلہ طلاق اور اس کے احکام سے مربُوط ہوں اور چاہے دوسرے مسائل سے تعلق رکھتی ہوں، اپنے لطف و کرم سے حل کر دے گا۔

٭ ٭ ٭

نیز بعد والی آیۃ میں تاکید کے لیے ان احکام کے بارے میں جو طلاق اور عدّت کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں آئے ہیں، مزید کہتا ہے : "یہ خدا کا حکم ہے جسے اس نے تم پر نازل کیا ہے۔" (ذالك امر الله انزله الیکم)۔

"اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا اور اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کرے گا خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اس کے اجر و ثواب کو بہت بڑھا دے گا۔" (ومن یتق الله یکفر عنه سیئاته ویعظم له اجرًا)۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ یہاں 'سیئات' سے مُراد "گناہانِ صغیرہ' ہیں اور تقویٰ سے مُراد "گناہانِ کبیرہ" سے پرہیز ہے۔ اور اس طرح گبائر سے پرہیز صغائر کے بخشے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بات اُس کے مشابہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت ۳۱ میں بیان ہوئی ہے، اس گفتگو کا لازمہ یہ ہے کہ طلاق اور عدت کے سلسلہ میں گزشتہ احکام کی مخالفت گناہانِ کبیرہ میں شمار ہوتی ہے۔ [1]

البتّہ یہ درست ہے کہ بعض اوقات 'سیئات' صغیرہ گناہوں کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن قرآن مجید کی بہت سی آیات میں تمام گناہوں کے لیے، چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ لفظ سیئات کا اطلاق ہُوا ہے۔ مثلاً سورہ مائدۃ کی آیت ۶۵ میں آیا ہے : ولو ان اهل الکتاب امنوا واتقوا لکفرنا عنهم سیئاتهم "اگر اہلِ کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان ہم ان کے تمام گذشتہ گناہوں کو بخش دیں گے۔" (یہ معنی دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔)

مُسلّمہ طور پر ایمان اور قبولِ اسلام تمام گذشتہ گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت طلاق کے بعد عورت کے حقوق کے بارے میں 'مسکن' اور 'نفقہ' کے لحاظ سے اور دوسرے جہات سے بھی وضاحت کرتی ہے۔

پہلے مطلقہ عورتوں کے مسکن کی کیفیت کے بارے میں فرماتا ہے : "جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور تمہارے

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۳۶۷

وسائل تقاضا کرتے ہیں انھیں بھی وہیں سکونت دو" (اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم)۔

"وجد" (بروزن حکم) توانائی اور تمکن کے معنی میں ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی اور تفاسیر بھی بیان کی ہیں، جونتیجہ میں اسی معنی کی طرف لوٹتی ہیں۔ "راغب" بھی مفردات میں یہی کہتا ہے کہ "من وجدکم کی تعبیر کا مفہوم یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی توانائی اور مقدور کے مطابق رہنے کے لیے مناسب مکان دو۔

فطری طور پر جب مکان شوہر کے ذمّہ ہے تو باقی اخراجات بھی اسی کے ذمّہ ہوں گے۔ آیت کا آخری حصّہ جو حاملہ عورتوں کے نفقہ کے بارے میں ہے،وہ اسی مدعا پر شاہد ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے حکم کو پیش کرتے ہُوئے کہتا ہے : "انھیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر ایسا تنگ کر دو کہ وہ تمھارے مکان کو چھوڑنے اور نفقہ کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں" (ولا تضارّوھن لتضیقوا علیھن)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کینہ پروری ، عداوت اور نفرت تمھیں حق اور عدالت کے راستہ سے منحرف کر دے، تم انھیں ان کے مسلّہ حقوقِ مسکن ونفقہ سے محرُوم کردو اور ان پر اتنا دباؤ پڑے کہ وہ ہر چیز کو چھوڑ کر نکلے کھڑی ہوں۔

تیسرے حکم میں حاملہ کے بارے میں کہتا ہے :" اور اگر وہ حاملہ ہوں تو جب تک وہ وضع حمل نہ کرلیں ان کے اخراجات دیتے رہو" (و ان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتّٰی یضعن حملھن)۔

کیونکہ جب تک انھوں نے وضع حمل نہیں کیا وہ حالتِ عدّت میں ہیں اور ان کا نفقہ اور مسکن شوہر پر واجب ہے۔

چوتھے حکم میں دودھ پلانے والی عورتوں کے حقوق کے بارے میں فرماتا ہے :"اگر وہ علیٰحدگی کے بعد بچّوں کو دودھ پلانے پر رضامند ہو جائیں تو ان کی اُجرت انھیں دے دو" (فان ارضعن لکم فاٰتوھن اجورھن)۔

اتنی اُجرت جو عرف وعادت کے لحاظ سے دودھ پلانے کی مقدار اور وقت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔

چونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد شوہر اور بیوی میں نوزاد بچے کے سلسلے میں مصالحت کرنے پر اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں ، لہٰذا پانچویں حکم میں اس سلسلے میں ایک قاطع حکم صادر فرماتے ہوئے کہتا ہے :" اولاد کی سرنوشت کے سلسلے میں ایک دوسرے کے مشورے سے شائستہ فیصلہ کرو" (واْتمروا بینکم بمعروف)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر اور بیوی کے اختلافات بچوں کے منافع پر ایسی ضرب لگائیں کہ جس سے وہ جسمانی اور ظاہری لحاظ سے خسارے میں گرفتار ہو جائیں یا عاطفی لحاظ سے ضروری محبت اور شفقت سے محروم رہ جائیں۔ والدین کی ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کو نظر میں رکھیں اور دفاع نہ کرسکنے والے نومولود کو اپنے اختلافات اور اغراض پر قربان نہ کردیں۔

"وأتمروا" کا جُملہ "ایتمار" کے مادہ سے بعض اوقات تو کسی دستور کو قبول کرنے اور کبھی مشاورت کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ نیز معروف کی تعبیر بڑی جامع ہے جو ہر قسم کے مشورے کو شامل ہے کہ جس میں خیر و صلاح ہو۔

چونکہ بعض اوقات طلاق کے بعد بچے کے مصالح اور اُسے دُودھ پلانے کے سلسلے میں بیوی اور شوہر میں ضروری اور لازمی موافقت پیدا نہیں ہوتی، لہٰذا چھٹے حکم میں فرماتا ہے: "اور اگر تم ایک دُوسرے کے لیے سخت ہو جاؤ اور موافقت نہ کرو، تو پھر کوئی دوسری عورت بچے کو دودھ پلانے کی ذمّہ داری لے سکتی ہے۔ تاکہ کشمکش جاری نہ رہے۔" (وان تعاسرتم فسترضع له اخری)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اختلافات طول پکڑ جائیں تو اپنے آپ کو مُعطّل نہ رکھو اور بچے کو کسی دوسری عورت کے سپرد کر دو۔ پہلے درجہ میں تو ماں ہی کا حق تھا کہ وہ اس بچے کو دودھ پلائے، لیکن جب سخت گیری اور کش مکش کی بناء پر یہ امر امکان پذیر نہیں رہا تو بچے کے منافع کو فراموشی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے، لہٰذا اس کی ذمّہ داری کسی دایہ کے سپرد کر دو۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت اس سلسلہ میں ساتویں اور آخری حکم کو بیان کرتے ہُوئے مزید کہتی ہے: "وہ لوگ جو وسیع وسائل رکھتے ہیں وہ اپنے وسائل اور امکانات کے مطابق خرچ کریں، لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔ خدا کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا کہ جو اس کو عطا کیا ہُوا ہے۔" (لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اٰتاه الله لا یکلف الله نفسًا الّا ما اٰتاها)۔

کیا یہ حکم یعنی طاقت کے مطابق خرچ کرنا ان عورتوں سے مربُوط ہے جو طلاق کے بعد بچوں کو دودھ پلانے کی ذمّہ داری قبول کر لیتی ہیں یا عدت کے دنوں کے ساتھ مربُوط ہے کہ جس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر اشارہ ہوا یا یہ دونوں کے ساتھ مربُوط ہے؟

آخری معنی سب سے مناسب ہے۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اسے صرف دُودھ پلانے والی عورتوں سے مربُوط سمجھتی ہے۔ حالانکہ گزشتہ آیات میں اس بارے میں اُجر (اجرت) کی تعبیر آئی ہے، نفقہ اور انفاق کی تعبیر نہیں آئی۔

بہرحال جن لوگوں میں کافی طاقت اور توانائی ہے انھیں تنگ دلی اور سخت گیری نہیں کرنی چاہیے۔ جن میں کچھ زیادہ مالی طاقت نہیں ہے وہ اپنی توانائی سے زیادہ پر مامور نہیں اور عورتیں ان پر اعتراض نہیں کر سکتیں۔

اِسی طرح جو وسعت رکھتے ہیں انھیں بخل نہیں کرنا چاہیے، اور جو وسعت نہیں رکھتے، وہ ملامت کے لائق نہیں ہیں۔

معیشت کی تنگی لوگوں کے حق و عدالت کے راستہ سے خارج ہونے کا سبب نہ بنے اور کوئی بھی شخص شکایت کے لیے زبان نہ کھولے۔ اس بناء پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا عنقریب سختی کے بعد راحت اور آسانی قرار دے گا" (سیجعل اللہ بعد عسر یسرًا)۔

یعنی غم نہ کھاؤ، بیتابی نہ کرو، دنیا ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ منقلع ہو جانے والی اور جلدی سے گزر جانے والی مشکلات تمھارے صبر و شکیبائی کے رشتہ کو توڑ کر پارہ پارہ نہ کر دیں۔

یہ تعبیر ہمیشہ کے لیے، خصوصاً ان آیات کے نزول کے وقت کہ جب مسلمان معیشت کے لحاظ سے سخت تنگی میں تھے، صابرین کے مستقبل کی ایک اُمید بخش بشارت ہے، پھر اتفاق سے کچھ زیادہ دیر گزری تھی کہ خدا نے اپنی رحمت و برکت کے دروازے ان پر کھول دیئے۔

✦ ✦ ✦

چند نکات

۱: طلاقِ رجعی کے احکام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "طلاقِ رجعی" وہ ہے کہ جس میں شوہر عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے جس وقت چاہے رجوع کر سکتا ہے اور میاں بیوی کے رشتہ کو بحال کر سکتا ہے۔ اور اس میں کسی نئے عقد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رجوع کم سے کم بات اور عمل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو بازگشت کی علامت ہو۔

بعض احکام جو اوپر والی آیات میں بیان کیے گئے ہیں، جیسے نفقہ اور مسکن کے احکام، وہ طلاقِ رجعی کی عدت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح عدت کی حالت میں عورت کا اپنے شوہر کے گھر سے نہ نکلنے کا مسئلہ بھی ہے۔ لیکن طلاق بائن یعنی وہ طلاق جو قابلِ رجوع نہیں (مثلاً تیسری طلاق) تو اس میں اوپر والے احکام کا وجود نہیں ہے۔

صرف حاملہ عورت کے بارے میں وضع حمل کے وقت تک نان و نفقہ اور مسکن کا حق ثابت ہے۔

"لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذالك امرًا" (تو نہیں جانتا شاید خدا کوئی نئی وضع و کیفیت پیدا کر دے) کی تعبیر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب یا اوپر والے احکام کا ایک حصہ طلاق رجعی کے ساتھ مربوط ہے۔[1]

✦ ✦ ✦

---

[1] مزید وضاحت کے لیے فقہ کی کتابوں منجملہ "جواہر الکلام" جلد ۳۲ ص ۱۲۱ کی طرف رجوع کریں۔

۲ : خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا

نہ صرف عقل کا حکم یہی ہے ، بلکہ حکم شریعت بھی اسی مطلب کا گواہ ہے کہ انسانوں کی ذمہ داریاں ان کی طاقت کے مطابق ہونی چاہئیں : لا یکلف اللہ نفسًا الّا ما اٰتاھا کا جملہ جو اوپر والی آیات کے ضمن میں آیا ہے اس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ ما اٰتاھا سے مراد ما اعلمھا ہے۔ یعنی ہر شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتا ہے جتنی اسے تعلیم دی ہے۔ اسی لیے علماء نے "علم اصول" میں "اصل برأت" کے مباحث میں ، اس آیت کے ساتھ استدلال کیا ہے کہ اگر انسان کسی حکم کو نہیں جانتا تو وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

لیکن چونکہ عدم آگاہی بعض اوقات عدم توانائی کا سبب بن جاتی ہے ، للذا ممکن ہے اس سے مراد وہ جہالت ہو جو عجز و ناتوانی کا سرچشمہ ہے۔

اس بناء پر ممکن ہے یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو کہ جو عدم قدرت کو اور اس جہالت کو بھی شامل ہو ، جو کسی کام کے انجام دینے میں عدم قدرت کی موجب ہو۔

۳ : گھرانے کے نظام کی اہمیت

وہ باریکی اور عمدگی جس سے مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق بیان کرنے کے سلسلہ میں اوپر والی آیت میں کام لیا گیا ہے ، یہاں تک کہ آیات قرآن میں اس مسئلہ کی بہت ساری جزئیات بیان ہوئی ہیں کہ جو حقیقت میں اسلام کا بنیادی قانون ہے ، اس اہمیت کی ایک واضح دلیل ہے کہ گھریلو نظام نیز عورتوں اور بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اسلام س کا قائل ہے۔

جہاں تک ہو سکتا ہے اسلام طلاق سے روکتا ہے اور اس کی جڑوں کو کاٹتا ہے لیکن جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ ہر طرف کے راستے بند ہو جائیں اور طلاق و علیحدگی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو تو پھر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کشمکش میں اولاد یا عورتوں کے حقوق پامال ہو جائیں ، یہاں تک کہ علیحدگی کا طریقہ کار بھی اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ عام طور پر رجوع اور بازگشت کا امکان موجود رہے۔

معروف طریقہ سے روکے رکھنا اور معروف سے جدائی ، عورتوں کو نقصان اور ضرر کا نہ پہنچانا اور تنگی اور سخت گیری نہ کرنا ، نیز بچوں کی سرنوشت کو محفوظ کرنے کے لیے شائستہ اور مناسب مشورہ کرنا ، اور اسی قسم کے دوسرے احکام جو اوپر والی آیات میں آئے ہیں ، وہ سب اس بات کے گواہ ہیں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان امور سے بہت سے مسلمانوں کی لاعلمی یا علم کے باوجود عمل نہ کرنا ، اس بات

کا سبب ہوتا ہے کہ طلاق اور علیٰحدگی کے وقت گھرانوں اور خصوصًا اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان قرآن کے فیض بخش چشمہ سے دور ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس بات کے باوجود کہ قرآن صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ عورتیں عدت کے دوران شوہر کے گھر سے باہر نہ جائیں، اور نہ ہی شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ انھیں گھر سے نکالے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ اگر اسی طرح انجام پا جائے تو اکثر عورتوں کے ازدواجی زندگی کی طرف لوٹ آنے کی بہت زیادہ اُمید ہے۔ لیکن آپ بہت کم مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو دیکھیں گے، جو طلاق و جُدائی کے بعد اس اسلامی حکم پر عمل کرتے ہوں۔ یہ امر واقعی طور پر قابلِ افسوس ہے ۔

۞ ۞ ۞

۸ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا
وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا
عَذَابًا نُّكْرًا ○
۹ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ
اَمْرِهَا خُسْرًا ○
۱۰ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
يٰاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ○ۙ
۱۱ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ○

ترجمہ

۸ کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی ہیں جن کے رہنے والوں نے خدا اور اس

کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی تو ہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انھیں بہت ہی بُرے عذاب میں گرفتار کر دیا۔

(۹) انھوں نے اپنے کردار و عمل کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا

(۱۰) خُدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کیا، پس اے صاحبانِ ایمان وعقل! تم خُدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو، (کیونکہ) خُدا نے تم پر وہ چیز نازل کی ہے جو تمھارے لیے ایک نصیحت ہے۔

(۱۱) تمھاری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جو خدا کی واضح آیات کی تم پر تلاوت کرتا ہے تاکہ ان لوگوں کی جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے۔ اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا، اور عمل صالح انجام دیتا ہے، خدا اسے اس جنّت کے باغات میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور خدا نے ان کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے۔

❁ ❁ ❁

تفسیر

سرکشوں کا دردناک انجام

قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ اکثر مواقع پر عملی احکام کے ایک سلسلے کو بیان کرنے کے بعد گذشتہ اُمتوں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تاکہ مسلمان ان کی سرگذشت میں اطاعت وعصیاں کا نتیجہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور یہ مسئلہ بطور خود ایک حسی صورت اختیار کرلے۔ اسی لیے اس سورہ میں بھی طلاق وعلیحدگی کے موقع پر مردوں اور عورتوں کے وظائف اور ذمّہ داریاں بیان کرنے کے بعد اسی مطلب کو پیش کرکے گنہگاروں اور سرکشی کرنے والوں کو خبردار کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی تھیں جن کے رہنے والوں نے خُدا اور اس کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی تو ہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انھیں بہت ہی بُرے عذاب میں

گرفتار کر دیا"۔ (وکأین من قریة عتت عن امر ربها و رسله فحاسبناها حسابًا شدیدًا وعذبناها عذابًا نکرًا)۔ [1]

"قریة" سے مُراد، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، انسانوں کے اجتماع کی جگہ ہے، چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں۔ اور یہاں مُراد اس میں رہنے والے ہیں۔

"عُتت"، "عتو" (بروزن غلو) کے مادّہ سے اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے۔

"نُکر"، (بروزن شکر) ایسی مشکل کے معنی میں ہے کہ جس کی مثال نہ ہو یا بہت کم پائی جاتی ہو۔

"حسابًا شدیدًا" یا تو دقیق اور سخت گیری کے ساتھ حساب لینے کے معنی میں یا شدید عذاب کے معنی میں ہے کہ جو دقیق حساب کا نتیجہ ہے۔ بہرحال یہ ان سرکش اقوام کے اس دنیا میں عذاب کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی قوم کی طوفان کے ساتھ، کبھی گروہ کی تباہ کرنے والے زلزلے کے ساتھ اور کسی گروہ کی صاعقہ یعنی بجلی اور اسی قسم کی چیزوں کے ساتھ بیخ کنی کی گئی، اور ان کے تباہ اور ویران شدہ شہر و دیار آنے والے لوگوں کے لیے درسِ عبرت کی صُورت میں باقی رہ گئے۔

❖ ❖ ❖

لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "انھوں نے اپنے کفر و گناہ کا عذاب چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا"۔ (فذاقت وبال امرها وکان عاقبة امرها خسرًا)۔

اس سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہوگا کہ وہ خداداد سرمایہ کو ہاتھ سے گنوا بیٹھے اور اس دُنیا کے بازار تجارت سے نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی مال و متاع نہیں خریدا بلکہ انجام کار عذاب الٰہی سے نابود ہو گئے۔

بعض نے یہاں "حساب شدید" اور "عذاب نکر" کو عذاب قیامت کی طرف اشارہ سمجھا، اور فعل ماضی کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی سبب موجود نہیں ہے، بالخصوص جبکہ عذاب قیامت کے سلسلہ میں بعد والی آیت میں بات کی جائے گی اور یہ بات خود ایک زندہ گواہ ہے کہ یہاں عذاب سے مُراد عذاب دنیا ہی ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اُن کے اُخروی عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "خدا نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ (اعدّ اللّٰہ لھم عذابًا شدیدًا)۔

---

[1] "کأین" مشہور عُلمائے ادب کے نظریہ کے مطابق یہ ایک مرکب اسم ہے۔ "کاف" تشبیہ اور 'ای' سے جو تنوین کے ساتھ توام ہے۔ چونکہ تنوین اس اسم کی بناء میں داخل ہے اس لیے حالتِ وقف میں بھی پڑھی جاتی ہے، اور قرآن کی کتابت میں بھی لکھی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی 'کم' خبریہ کے مانند ہے، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ فرق ہے، ایک غیر مشہور نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک اسم بسیط ہے اور اس کا 'کاف' اور 'نون' جزو کلمہ ہے۔

ایک دردناک، شدید، وحشت انگیز، ذلیل کرنے والا اور رُسوا کرنے والا عذاب اور ان کے لیے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی جگہ ابھی سے فراہم ہے۔

جب یہ بات ہے تو "اے صاحبانِ عقل و خرد اور اے ایمان لانے والو! خُدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو"۔ (فاتقوا اللّٰہ یا اولی الالباب الذین اٰمنوا)۔

ایک طرف سے غور و فکر اور دُوسری طرف سے ایمان اور آیاتِ الٰہی تمھیں خبردار کرتی ہیں کہ تم سرکش اور رُوگردانی کرنے والی قوموں کی سرنوشت کو دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کی صف میں جا کھڑے ہو، پھر خدا تمھیں اس جہان میں بھی ہولناک اور بے سابقہ عذاب میں گرفتار کر دے گا اور آخرت کا شدید عذاب بھی تمھارے انتظار میں ہو گا۔

اس کے بعد غور و فکر کرنے والے مومنین کو مخاطب کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: "خُدا نے تم پر ایسی چیز نازل کی ہے جو تمھارے لیے باعثِ نصیحت ہے"۔ (قد انزل اللّٰہ الیکم ذکرا)۔

٭ ٭ ٭

"اور ایک رسُول تمھاری طرف بھیجا ہے، جو خدا کی واضح آیات کی تمھارے سامنے تلاوت کرتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور عملِ صالح بجا لانے والوں کی تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے"۔ (رسولاً یتلوا علیکم اٰیات اللّٰہ مبینات لیخرج الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الی النور)۔

یہاں ذکر سے کیا مُراد ہے؟ اور رسُول سے کون مُراد ہے؟ اس بارے میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔

مفسّرین کا ایک گروہ 'ذکر' کو قرآن کے معنی میں لیتا ہے، جبکہ ایک جماعت نے اس کی رسُولِ خدا کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ آپ لوگوں کے لیے یاد آوری کا سبب ہیں۔ اس تفسیر کے مُطابق اس کے بعد جو لفظ رسولاً آیا ہے اس سے پیغمبرؐ کی ذات مُراد ہے۔ (اور اس کلام میں کوئی محذوف نہیں ہے۔) لیکن یہاں "نازل کرنے سے مُراد" خدا کی طرف سے امّت کو پیغمبرؐ کے وجود کا عطا کرنا ہے۔

لیکن اگر ذکر کو قرآن مجید کے معنی میں لیں تو 'رسولاً' اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس جملے میں ایک محذوف ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے: "انزل اللّٰہ الیکم ذکرا وارسل رسولاً" خُدا نے ایک نصیحت والی چیز نازل کی اور ایک رسُول بھیجا۔

بعض نے 'رسُول' کی 'جبرئیل' کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ اس صُورت میں اس کا نزول نزولِ حقیقی ہو گا، کیونکہ وہ آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ لیکن یہ تفسیر "یتلوا علیکم اٰیات اللّٰہ" "وہ خدا کی آیات تمھارے سامنے پڑھتا ہے" کے جُملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے، کیونکہ جبرئیل براہِ راست مومنین کے سامنے نہیں پڑھتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک تفسیر میں ایک اضافہ اور ایک مشکل موجود ہے، لیکن مجموعی طور پر پہلی

تفسیر (یعنی ذکر کا معنی قرآن اور رسول کا معنی پیغمبر اکرمؐ ہیں) سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں لفظ ذِکر کا قرآن پر اطلاق ہُوا ہے، خصوصًا جہاں لفظ 'انزال' کے ساتھ ہو، اِس طرح سے کہ جب "نزولِ ذکر کہا جائے تو یہ قرآن کے معنی کا ہی ادعا کرتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں آیا ہے: و انزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم: "ہم نے ذکر کو تجھ پر نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو بیان کرے جو ان پر نازل ہُوئی ہے۔"

نیز سورۂ حجر کی آیت ۶ میں آیا ہے: "وقالوا یاایھا الذی نزل علیه الذکر انك لمجنون"۔ دشمنوں نے کہا: "اے وہ شخص کہ جس پر ذکر نازل ہُوا ہے تو ایک دیوانہ ہے۔"

اگر آئمہ اہلِ بیتؑ سے بعض روایات میں آیا ہے کہ ذکر سے مُراد حضرت رسُول ہیں اور ہم 'اہلِ ذکر' ہیں، تو ممکن ہے کہ یہ آیت کے بطون کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ 'اہلِ الذکر' جو آیت فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو) (نحل ۴۳) میں آیا ہے یہ خاص طور پر اہلِ بیت کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کی شانِ نزول میں علماء اہلِ کتاب آتے ہیں۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھتے ہُوئے کہ 'ذکر' ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کو شامل ہے تو یہ بھی اس کا ایک مصداق ہو گا۔[1]

بہرحال اس رسُول کے بھیجنے اور اس کتاب آسمانی کے نازل کرنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ انھیں آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے ذریعے کفر و جہالت، معصیت اور اخلاقی فساد کی تاریکیوں سے باہر نکالتے ہُوئے ایمان، توحید اور تقوٰی کے نُور کی رہنمائی کرے۔ جبکہ حقیقت میں بعثتِ پیغمبرؐ اور نزولِ قرآن کے تمام اہداف و مقاصد کا خلاصہ اسی ایک جملہ میں آگیا ہے: یعنی تاریکیوں سے باہر نکال کر نور کی طرف لانا۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ 'ظلمات' کا صیغہ جمع کے ساتھ اور نور کا صیغہ واحد کے ساتھ ذکر ہُوا ہے۔ کیونکہ شرک و کفر و فساد، پراگندگی و کثرت کے عامل ہیں، جبکہ ایمان و توحید و تقوٰی، وحدت و یگانگت کے عامل ہیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے اجر و ثواب کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے جو ایمان و عملِ صالح رکھتے ہیں، مزید کہتا ہے: "جو شخص خدا پر ایمان لائے، عمل صالح بجا لائے اور اسی راستے پر چلتا رہے، تو خُدا اُسے جنّت کے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں پر رہے گا، اور خُدا نے اس کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے": (ومن یؤمن باللّٰه ویعمل صالحًا یدخله جنّات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدًا قد احسن اللّٰه له رزقًا)۔

'یؤمن' اور 'یعمل' کی تعبیر فعل مضارع کی صُورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان اور عملِ صالح کسی خاص زمانہ کے ساتھ محدُود نہیں بلکہ استمرار و دوام رکھتا ہے۔[2]

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۶ سے رجوع کریں۔ [2] توجہ رکھنی چاہیے کہ جو ضمیریں آیت میں استعمال ہُوئی ہیں بعض تو جمع کی صورت میں ہیں اور بعض مُفرد کی صورت میں ہیں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جہاں مفرد کی صورت میں ہیں وہاں وہ جنس اور جمع کے معنی میں ہیں۔

خالدین کی تعبیر جنّت کی ہمیشگی کی دلیل ہے۔ اس بناء پر اس کے بعد 'ابدًا' کے لفظ کا ذکر "خلود" کے لئے ایک تاکید شمار ہوتا ہے۔

"رزقًا" کی تعبیر "نکرہ" کی صورت میں ان اچھی اچھی روزیوں کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے جو خدا ان لوگوں کے لیے فراہم کرے گا، یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو آخرت میں ہر قسم کی خدائی نعمت، یہاں تک کہ دنیاوی موہبت کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے، کیونکہ ایمان و تقوٰی کا نتیجہ صرف آخرت کے ساتھ مربوط نہیں بلکہ مومن و پرہیز گار لوگ اس دنیا میں بھی پاکیزہ تر، آرام دہ اور زیادہ لذت بخش زندگی رکھتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

(۱۲) اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۬ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ﴿۱۲﴾

ترجمہ

(۱۲) خدا نے ہی ساتوں آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور اتنی ہی زمینیں (پیدا کی ہیں) اس کا حکم ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، اور اس کا علم ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے۔

تفسیر

خلقت عالم کا مقصد معرفت ہے

سورۂ طلاق کی یہ آخری آیت آسمانوں اور زمینوں کی خلقت میں اللہ کی قدرت کی عظمت اور اس خلقت کے مقصدِ اصلی کی طرف ایک پُرمعنی اور واضح اشارہ ہے۔ نیز یہ ان مباحث کی تکمیل کر رہا ہے جن میں پرہیزگار مومنین کے لیے ثوابِ عظیم کے وعدے کے سلسلے میں اور اسی طرح ان وعدوں کے سلسلے میں جو ان کی مشکلات کی گرہ کھولنے کے بارے میں کیے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ خُدا جو اس عظیم خلقت پر قدرت رکھتا ہے، وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی ان وعدوں کو پورا کرنے کی طاقت اور قوت رکھتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا وہی ہے جس نے ساتوں آسمان پیدا کیے"۔ (اللہ الذی خلق سبع سماوات)۔

"اور اتنی ہی زمینیں پیدا کی ہیں"۔ (ومن الارض مثلھن)۔

یعنی جس طرح آسمان سات ہیں اسی طرح زمینیں بھی سات ہیں ۔
یہ قرآن مجید کی واحد آیت ہے جو سات زمینوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سات آسمانوں اور اتنی ہی زمینوں سے کیا مُراد ہے ؟ اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد اوّل میں ،سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں اور جلد ۱۱ میں سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۲ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔ لہٰذا یہاں ایک مختصر سے اشارہ پر قناعت کرتے ہیں اور وہ یہ ہے :

ممکن ہے کہ سات کے عدد سے مُراد وہی کثرت ہو ، کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں اور اس کے علاوہ بھی کثرت کے معنی میں آتی ہے ، جیسے ہم کہتے ہیں اگر تم سات سمندر بھی لے آؤ تو کافی نہیں ہوں گے۔

اس بنا پر سات آسمانوں اور سات زمینوں سے مُراد آسمانی کواکب اور زمین سے مشابہ کُرّوں کی عظیم و کثیر تعداد ہے۔

لیکن اگر ہم سات کے عدد کو تعداد اور گنتی کے لیے سمجھیں تو اس کا مفہوم سات آسمانوں کا وجود ہو گا۔ چنانچہ سورۂ صافات کی آیت ۶ کہتی ہے : "انا زینا السماء الدنیا بزینة ٍالکواکب : ہم نے نزدیکی آسمان (پہلے آسمان) کو کواکب اور ستاروں سے زینت بخشی ہے" اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اور انسانی علم و دانش جس پر احاطہ رکھتی ہے وہ سب کچھ پہلے آسمان سے مربُوط ہے۔ لیکن ان ثوابت و اشارات کے علاوہ اور بھی چھ عالم موجود ہیں جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔

یہ بات تو سات آسمانوں کے بارے میں تھی۔ باقی رہا سات زمینوں کے بارے میں تو ممکن ہے کہ یہ کرہ زمین کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اِس وقت یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زمین طرح طرح کے پردوں اور تہوں سے بنی ہے۔ یا یہ زمین کے سات بر اعظموں کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ آج کے زمانے میں اور گزشتہ زمانے میں بھی کرۂ زمین کو سات منطقوں میں تقسیم کرتے تھے۔ (البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے کے طرز تقسیم میں فرق ہے۔ موجودہ زمانہ میں دو منجمد منطقوں شمالی وجنوبی ، دو معتدل منطقوں ، دو گرم منطقوں اور ایک استوائی منطقہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانہ میں سات اقلیمیں (بر اعظم) دوسری شکل میں تقسیم ہوتی تھیں)

لیکن ممکن ہے کہ یہاں بھی سات کا عدد جو "مثلھن" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے تکثیر کے لیے ہی ہو ، اور یہ بھی متعدد زمینوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو عالم ہستی میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ کرۂ زمین سے مشابہ وہ کرے جو اس عظیم عالم میں مختلف آفتابوں کے گرد گردش کر رہے ہیں ، ان کی کم از کم تعداد تین سو ملین ہے۔ [1]

اگرچہ منظومۂ شمسی کے علاوہ اجرام کے بارے میں ہم جو معلومات رکھتے ہیں۔ ان کے ناکافی ہونے کے باعث

---

[1] "تفسیر مراغی" جلد ۲۸ ص ۱۵۱ - ایک حدیث جو امیر المومنین حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے ، اس میں بھی آیا ہے : (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی تعداد مقرر کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن بہر حال دوسرے ماہرین فلکیات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اس کہکشاں میں کہ منظومہ شمسی جس کا ایک جزء ہے، کئی ملین کرے موجود ہیں، جو کرۂ زمین سے مشابہ اور حیات و زندگی کا مرکز ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ آگے چل کر علم و دانش میں انسان کی پیش رفت، اس قسم کی آیات کے بارے میں ہمیں مزید اطلاعات مہیا کر سکے۔

اس کے بعد خدا کے حکم و فرمان کے ذریعے اس عظیم عالم کی تدبیر کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس کا حکم و فرمان ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے": (یتنزل الامر بینھن)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امر سے مراد وہی خدا کا حکم و امر تکوینی ہے جو وہ اس عالم بزرگ اور ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی تدبیر کے سلسلے میں جاری کرتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے مخصوص حکم کے ساتھ ایک منظم طریقے سے ہدایت و رہبری کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ آیت سورہ سجدہ کی آیت ۴ کے مشابہ ہے جس میں فرماتا ہے: "یدبّر الامر من السّماء الی الارض: "وہ آسمان سے لے کر زمین تک تدبیر امور کرتا ہے"۔

بہر حال اگر اس کی تدبیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس عالم سے جدا ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے، اور سب کے سب فنا ہو جائیں۔

آخر میں اس عظیم خلقت کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ سب کچھ اس بناء پر ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم و آگہی ہر چیز پر محیط ہے"۔ (لتعلموا ان اللّٰہ علیٰ کل شیء قدیر و ان اللّٰہ قد احاط بکل شیء علما)۔

کتنی عمدہ تعبیر ہے کہ وہ اس عظیم خلقت کا ہدف یہ قرار دیتا ہے کہ انسان خدا کے علم اور اس کی قدرت کی صفات سے آگاہ ہو جائے کیونکہ ان دو صفات سے آگاہی انسان کی تربیت کے لیے کافی ہے۔

انسان کو یہ جان لینا چاہیے کہ خدا اس کے وجود کے تمام اسرار پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ نیز اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ معاد و قیامت، جزاء و سزا اور مومنین کی کامیابی کے بارے میں خدا کے وعدوں میں کبھی تخلف کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ہاں! وہ خدا جو اس قسم کا علم و قدرت رکھتا اور عالم ہستی کے نظام کا ادارہ کرتا ہے۔ اگر اس نے انسانوں کی زندگی کے بارے میں طلاق اور عورتوں کے حقوق سے مربوط کچھ احکام صادر فرمائے ہیں تو وہ سب کے سب دقیق اور پختہ حساب پر مبنی ہیں۔

---

۱ ...ۂ سابقہ) لھذہ النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض: "ان ستاروں میں بھی جو آسمان پر ہیں روئے زمین کے شہروں کی طرح سے شہر ہیں"۔ (تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۵)۔

"ہدفِ آفرینش" کے سلسلے میں ہم نے تفسیرِ نمونہ کی جلد ۱۲ سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کی ہے۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں انسان کی خلقت کے ہدف کی طرف یا اس جہان کی خلقت کے ہدف کی طرف ایسے اشارے ہُوئے ہیں جو ابتداء میں مختلف دکھائی دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو وہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

۱ : سورۂ ذاریات کی آیت ۵۶ میں انسان اور جن کی خلقت کا مقصد "عبادت" کو قرار دیا ہے۔ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔

۲ : سورہ ہود کی آیت ۷ میں آسمانوں اور زمین کی عظیم خلقت کا ہدف و مقصد انسان کی آزمائش بتائی گئی ہے۔ "وھو الذی خلق السماوات والارض فی ستة ایام وکان عرشه علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملاً"

۳ : سورہ ہود کی آیت ۱۱۹ میں ہدف و مقصد خدا کی رحمت کو قرار دیا ہے۔ "ولذالك خلقھم"

۴ : آخر میں زیرِ بحث آیت میں خدا کی صفات کے علم و آگہی کو ہدف بتایا ہے۔ (لتعلموا...)

ان آیات میں تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے لیے مقدمہ ہیں۔ آگاہی معرفت، بندگی و عبادت کے لیے ایک مقدمہ ہے۔ وہ انسان کی آزمائش اور تربیت کے لیے ایک مقدمہ ہے اور وہ خدا کی رحمت سے فیض یاب ہونے کے لیے ایک مقدمہ ہے (غور کیجئے)

۞ ۞ ۞

خداوندا ! اب جبکہ تو نے ہمیں اپنی عظیم خلقت کے ہدف سے آشنا کر دیا ہے اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے سلسلہ میں ہماری مدد فرما!

پروردگارا ! تیرا علم و قدرت بے پایاں ہے اور تیری رحمت بھی غیر متناہی ہے، ہمیں اس بے انتہا رحمت کا ایک حصّہ عنایت فرما !

بارِ الٰہا ! تو نے قرآن و پیغمبرؐ کو ظلمات سے نور کی طرف لانے والے بنا کر بھیجا ہے۔ ہمیں گناہ اور ہوائے نفس کی ظلمت اور تاریکی سے باہر نکال لے اور ہمارے دلوں کو نورِ ایمان و تقویٰ سے منوّر کر دے!

آمین یا رب العالمین

۞ ۞ ۞

سورۂ طلاق کا اختتام : ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتامِ ترجمہ ۲ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ، مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۸۷ء

بروز بدھ صبح ۵ بجکر ۴۱ منٹ، ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور

سورۂ تحریم

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز

آخر رمضان المبارک، ۱۴۰۶ھ

سورۂ تحریم کے مضامین

اِس سورہ کے بنیادی طور پر چار حصّے ہیں :

پہلا حصّہ : یہ پہلی آیت سے پانچویں آیت تک ہے جو پیغمبرؐ اور ان کی بعض بیویوں کے ایک واقعہ سے مربُوط ہے ۔ آنحضرتؐ نے حلال غذاؤں میں سے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تو مذکورہ آیات نازل ہُوئیں اور پیغمبرؐ کی ان بیویوں کو ملامت ہُوئی کہ جس کی تفصیل انشاء اللہ شانِ نزول میں بیان ہوگی ۔

دوسرا حصّہ : یہ آیت ۶ سے شروع ہو کر آیت ۸ تک جاتا ہے ، اور تمام مومنین سے ایک کلی خطاب ہے ۔ یہ گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے مُعاملے میں نگران رہنے اور گناہوں سے توبہ کے ضروری ہونے کے بارے میں ہے ۔

تیسرا حصّہ : یہ صرف ایک ہی آیت ہے جس میں پیغمبرؐ کو کفار و منافقین سے جنگ اور جہاد کرنے کے بارے میں خطاب ہُوا ہے ۔

چوتھا حصّہ : یہ سُورۃ کا آخری حصّہ ہے جو آیت ۱۰ سے آیت ۱۲ تک ہے ۔ اس میں خدا نے گزشتہ بحث کو واضح کرنے کے لیے دو صالح اور نیک خواتین (مریمؑ اور آسیہ زوجۂ فرعون) اور دو غیر صالح خواتین (زوجۂ نوحؑ اور زوجۂ لُوطؑ) کے حالات کی تفصیل بیان فرمائی ہے ۔ اس میں درحقیقت تمام مسلمانوں کی بیویوں اور خصوصیت سے پیغمبرؐ کی بیویوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ خود کو پہلے گروہ (مریمؑ و آسیہ زوجہ فرعون) سے ہم آہنگ کریں ، دُوسرے گروہ کے ساتھ نہیں ۔

❁ ❁ ❁

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں رسُولِ خُدا سے اس طرح نقل ہُوا ہے :

"جو شخص سورہ تحریم کو پڑھے گا ۔ اعطاہ اللہ توبۃ نصوحًا : تو خدا اسے خالص توبہ کی توفیق عطا فرمائے گا ۔"[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۱

"جو شخص سورہ طلاق وتحریم کو واجب نماز میں پڑھے گا، خدا اُسے قیامت میں خوف وہراس سے پناہ دے گا، جہنم کی آگ سے رہائی بخشے گا، اور اُسے اس سورہ کی تلاوت اور اس پر مداومت کی بناء پر جنت میں داخل کرے گا، کیونکہ یہ دونوں سورتیں پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص ہیں"۔ [1]

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] "ثواب الاعمال" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۳۶۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ
اَزۡوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ○

(۲) قَدۡ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمۡ تَحِلَّةَ اَیۡمَانِكُمۡ ۚ وَ اللّٰهُ مَوۡلٰىكُمۡ ۚ
وَ هُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَكِیۡمُ ○

(۳) وَ اِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِهٖ حَدِیۡثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتۡ
بِهٖ وَ اَظۡهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَ اَعۡرَضَ عَنۡۢ
بَعۡضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ
الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ○

(۴) اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُكُمَا ۚ وَ اِنۡ تَظٰهَرَا
عَلَیۡهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوۡلٰىهُ وَ جِبۡرِیۡلُ وَ صَالِحُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ
وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِیۡرٌ ○

(۵) عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَكُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَهٗۤ اَزۡوَاجًا خَیۡرًا
مِّنۡكُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ
ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبۡكَارًا ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) اے پیغمبرؐ! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اُوپر حرام کیوں کرتے ہو اور خدا غفور و رحیم ہے۔

(۲) خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمھاری قسموں کے کھولنے کی راہ کو واضح کر دیا ہے اور خدا ہی تمھارا مولا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔

(۳) اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب پیغمبرؐ نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن جب اس نے اس راز کو افشا کر دیا تو خُدا نے پیغمبرؐ کو اِس سے آگاہ کیا اور پیغمبرؐ نے اس کا ایک حصّہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصّہ بیان نہ کیا۔ جب پیغمبرؐ نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ علیم و خبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔

(۴) اگر تم دونوں اپنے فعل سے توبہ کر لو (تو اس میں تمھارا نفع ہے) کیونکہ تمھارے دل حق سے پھر گئے ہیں، اور اگر تم دونوں اس کے برخلاف ایک دوسری کی مدد کرتی رہو گی (تب بھی تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی) کیونکہ خُدا اس کا مددگار ہے۔ اور اسی طرح جبرئیل اور صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔

(۵) اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو قریب ہے کہ اس کا پروردگار تمھاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے جو مُسلمان، مُومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گذار اور ہجرت کرنے والیاں ہوں گی اور بیوہ اور باکرہ ہوں گی۔

شانِ نزول

اوپر والی آیات کے شانِ نزول کے بارے میں شیعہ اور اہلِ سُنّت کی تفسیر، حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔اُن میں سے جو زیادہ مشہور اور زیادہ مُناسب نظر آتی ہیں وہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

پیغمبرؐ بعض اوقات (اپنی ایک بیوی) زینب بنت جحش کے پاس جاتے تو زینب آپ کو بٹھا لیتیں اور جو شہد اُن کے پاس موجود ہوتا وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتیں۔یہ بات بی بی عائشہ کے کانوں تک پہنچی تو اُن پر بہت گراں گزری، وہ کہتی ہیں: میں نے حفصہ (پیغمبرؐ کی دوسری بیوی) کے ساتھ یہ طے کیا کہ جب بھی پیغمبرؐ ہمارے قریب آئیں تو ہم فوراً یہ کہیں: کیا آپ نے "مغافیر" کھائی۔ (مغافیر ایک گوند تھی جو حجاز کے ایک درخت 'عُرفط' (بروزن ہرمز) سے نکلتی تھی اور اس کی بُو خوشگوار نہیں تھی) پیغمبرؐ اس بات کے پابند تھے کہ آپ کے دہن مُبارک یا لباس سے ہرگز کوئی نامُناسب بو نہ آئے بلکہ اس کے برعکس آپ پابندی کے ساتھ خوشبو لگاتے اور مُعطر رہتے تھے۔

اس طرح ایک دن پیغمبرؐ حفصہ کے پاس آئے تو اس نے پیغمبرؐ سے یہی بات کہی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "میں نے مغافیر نہیں کھائی بلکہ زینب بنت جحش کے ہاں سے شہد نوش کیا ہے اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اب اس کے بعد وہ شہد نہیں پیوں گا۔ (ممکن ہے کہ شہد کی مکھی کسی نامناسب نبات یا شاید مغافیر پر ہی بیٹھی ہو) لیکن تم یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ (کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچے تو وہ کہیں کہ پیغمبرؐ نے ایک حلال غذا کو اپنے اوپر حرام کیوں کر لیا ہے؟ یا وہ اس سلسلے میں یا اس سے مشابہ امور کے بارے میں پیغمبرؐ کے اس عمل کی پیروی کرنے لگیں، یا یہ بات زینب کے کان تک پہنچ جائے تو وہ شکستہ دل ہو)

لیکن انجام کار یہ راز اس نے فاش کر دیا اور بعد میں معلوم ہو گیا کہ اصل میں یہ معاملہ تو ایک سازش تھی۔ اس پر پیغمبرؐ کو بہت رنج ہوا تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس ماجرے کو اس طرح سے ختم کیا گیا کہ پھر پیغمبرؐ کے گھر میں اس قسم کے امُور کا تکرار نہ ہُوا۔[1]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ پیغمبرؐ اس ماجرے کے بعد ایک ماہ تک اپنی ازواج سے الگ رہے۔ یہاں تک کہ آنحضرتؐ کی طرف سے ان کو طلاق دینے کے ارادہ کی خبر منتشر ہو گئی۔اس طرح ازواج سخت پریشان اور وحشت زدہ ہو گئیں اور اپنے فعل پر پشیمان ہوئیں۔

---

[1] اس اصل حدیث کو بخاری نے اپنی صحیح کی جلد ۶ ص ۱۹۶ میں نقل کیا ہے اور جو وضاحتیں ہم نے قوسین میں لکھی ہیں وہ دوسری کتب سے معلوم ہُوئی ہیں۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی بعض ازواج کی شدید سرزنش

اِس میں شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جیسے عظیم انسان صرف اپنی ذات سے ہی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق پورے اسلامی مُعاشرے اور عالمِ انسانیت سے تھا۔ اس بناء پر اگر ان کے گھر کے اندر ان کے خلاف سازشیں ہوں، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہوں، تو اُن کے قریب سے آسانی کے ساتھ نہیں گذر جانا چاہیئے۔ یعنی پیغمبرؐ کی حیثیت، مقام اور مرتبہ کو نعوذ باللہ کسی کے بھی ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہیئے۔ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ پیش آئے تو قاطعیت کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔

اوپر والی آیات حقیقت میں خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے اس قسم کے واقعہ کے مقابلے اور اپنے پیغمبرؐ کی حیثیت و مقام کی حفاظت کے لیے ایک قطعی اور دو ٹوک فیصلہ ہے۔

سب سے پہلے خود پیغمبرؐ کی طرف رُوئے سخن کرتے ہُوئے کہتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جو چیز خُدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو"؟ (یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لك تبتغی مرضات ازواجك)۔

معلوم ہے کہ یہ شرعی تحریم نہیں تھی بلکہ جیسا کہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے پیغمبرؐ کی طرف سے قسم کھائی گئی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض مباح چیزوں کے ترک کرنے کی قسم کھانا کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس بناء پر "لم تحرم" (اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو) کا جملہ عتاب اور سرزنش کے عنوان سے نہیں بلکہ ایک قسم کی ہمدردی اور شفقت کا اظہار ہے۔

ٹھیک اس طرح کہ جیسے ایک شخص جو اپنی معاش حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن خُود اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں لیتا، ہم اس سے کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو اتنی زحمت کیوں دیتے ہو، اور اس زحمت کے ثمرے سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے۔

بعدہٗ آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا غفور و رحیم ہے۔" (واللہ غفور رحیم)۔

یہ عفو و رحمت کی بات ان بیویوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اس واقعہ کے اسباب مُہیا کیے ہیں۔ یعنی اگر واقعی وہ توبہ کر لیں تو وہ اس کی مشمول ہوں گی۔ یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہتر تھا پیغمبر اس کی قسم نہ کھاتے، کیونکہ یہ ایک ایسا کام تھا جو احتمالاً آنحضرتؐ کی بعض بیویوں کی جُرأت اور جسارت کا سبب بن جاتا۔

بعد والی آیت میں اضافہ کرتا ہے: "خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمہاری قسموں کے کھولنے کی

راہ کو واضح کر دیا ہے۔" (قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم)۔ [1]

البتہ اگر قسم کسی ایسے امر کے لیے ہو جس میں کسی کام کا ترک کرنا برتری رکھتا ہو تو پھر قسم پر عمل کرنا چاہیے اس کا توڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ ہے۔ لیکن اگر وہ قسم کسی ایسی چیز کے لیے ہو جس کا ترک کرنا مناسب نہ ہو (زیر بحث آیت کی مانند) تو پھر اس صورت میں اس کا توڑنا جائز ہے، لیکن اس قسم کے احترام کی حفاظت کے لیے بہتر ہے کہ کفارہ بھی دیا جائے۔ [2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا تمھارا مولا اور تمھارا محافظ و مددگار ہے اور وہ علیم و حکیم ہے"۔ (واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم)۔

اسی لیے اس نے اس قسم کی قسموں سے نجات کی راہ تمھارے لیے ہموار کر دی ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق تمھارے لیے مشکل کشائی کی ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک غلام آزاد کیا، اور جو کچھ اپنے اوپر قسم کی وجہ سے حرام کیا ہوا تھا، اُسے حلال کر لیا۔

ٰ ٰ ٰ

بعد والی آیت میں اس واقعہ کے سلسلے میں مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب پیغمبرؐ نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن اس نے راز داری نہ کی اور دوسری کو خبر دے دی، خدا نے پیغمبرؐ کو اس افشائے راز سے آگاہ کیا تو پیغمبرؐ نے اس کا ایک حصّہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصّہ بیان نہ کیا"۔ (واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً فلما نبأت بہ واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض)۔

یہ راز کیا تھا جو پیغمبرؐ نے اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا تھا اور اس نے راز داری نہ کی: مذکورہ شانِ نزول کے مُطابق یہ راز دو مطالب پر مشتمل تھا، ایک اپنی بیوی زینب بنتِ جحش کے پاس شہد کا پینا اور دوسرا آئندہ کے لیے اس کے پینے کو اپنے اوپر حرام کر لینا۔ اس آیت میں اس بیوی سے مراد بی بی حفصہ تھی جو راز داری نہ کر سکی اور اس نے یہ بات سن کر بی بی عائشہ سے بیان کر دی۔

پیغمبرؐ چونکہ وحی کے ذریعے اس افشائے راز سے آگاہ ہو چکے تھے، لہٰذا آپ نے اس کا ایک حصّہ

---

[1] راغب 'مفردات' میں کہتا ہے: "جہاں کہیں 'فرض' 'علیٰ' کے ساتھ ہو وہاں "وجوب" کے معنی دیتا ہے اور جہاں لام کے ساتھ ہو، وہاں عدم ممنوعیت کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر زیر بحث آیت میں 'فرض' وجوب کے معنی میں نہیں بلکہ اجازت کے معنی میں ہے۔ تحلۃ (باب تفعیل کا مصدر ہے) حلال کرنے کے معنی میں ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسا کام جو قسم کی گرہ کو کھول دے یعنی کفارہ۔

[2] جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۳ سورۃ مائدہ کی آیت ۸۹ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے، قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا دس افراد کو لباس پہنانا، یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ جو ان میں سے کوئی کام نہ کر سکتا ہو وہ تین روزے رکھے۔

بی بی حفصہ سے بیان کیا اور اس بناء پر کہ وہ زیادہ شرمندہ نہ ہو دوسرا حصہ بیان نہ کیا۔ (ممکن ہے پہلا حصہ اصل شہد کا پینا ہو، اور دوسرا حصہ اسے اپنے اوپر حرام کرنا ہو۔)

بہرحال جب پیغمبرؐ نے بی بی حفصہ کو اس افشائے راز کی خبر دی تو اس نے کہا: "آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا؟" (فلما نبأها به قالت من انبأك هٰذا)۔

آپ نے فرمایا: "علیم وخبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔" (قال نبأني العليم الخبير)۔

اس تمام آیت سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی بیویوں میں سے بعض، نہ صرف انھیں اپنی باتوں سے دکھ پہنچاتی تھیں، بلکہ رازداری کا مسئلہ جو ایک باوفا بیوی کی اہم ترین خوبیوں میں ہے، وہ بھی ان میں نہیں تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود، ان کے ساتھ پیغمبرؐ کا سلوک ایسا فراخدلانہ تھا کہ آنحضرتؐ اس تمام راز کو جو اس نے فاش کیا تھا اس کے منہ پر کہنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور صرف اس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے:

ما استقصى كريم قط، لان الله يقول عرف بعضه واعرض عن بعض۔

"شریف اور بڑے آدمی اپنے احقاق حق کے لیے آخری مرحلے تک آگے نہیں جاتے کیونکہ خدا اس مقام پر پیغمبرؐ کے متعلق کہتا ہے، انھوں نے ایک حصے کی خبر دی اور ایک حصہ بیان نہ کیا۔"[1]

❖ ❖ ❖

اس کے بعد ان دو بیویوں کی طرف، جو اوپر والی سازش میں شریک تھیں، روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے: "اگر تم اپنے فعل سے توبہ کرلو اور پیغمبرؐ کو دکھ دینے اور آزار پہنچانے سے دستبردار ہو جاؤ تو یہ بات تمھارے فائدہ میں ہے، کیونکہ تمھارے دل اس عمل کی بناء پر حق سے منحرف اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں۔" (ان تتوبا الى الله فقد صغت قلوبكما)۔

ان دو بیویوں سے مراد بالاتفاق مفسرین شیعہ و اہل سنت بی بی حفصہ اور بی بی عائشہ ہیں جو بالترتیب عمر بن خطاب اور ابوبکر بن قحافہ کی بیٹیاں تھیں۔

"صغت" (صغو، کے مادہ سے (عفو کے وزن پر) کسی چیز کی طرف متمائل ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں: صغت النجوم "یعنی ستارے مغرب کی طرف متمائل ہوئے۔" اور اسی لیے 'اصغاء' کسی دوسرے کی بات کان دھر کے سننے کے معنی میں آیا ہے۔

زیر بحث آیت میں 'صغت قلوبکما' سے مراد ان کے دلوں کا حق سے گناہ کی طرف انحراف تھا۔[2]

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۳۹۲

[2] اس تفسیر کے مطابق جو ہم نے اوپر بیان کی اور جسے بہت سے مفسرین نے اختیار کیا ہے، اس آیت میں کچھ محذوف ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اِس کے بعد مزید کہتا ہے : "اگر تم دونوں نے اس (پیغمبرؐ) کے برخلاف اتفاق کر لیا تو بھی تم کچھ نہ کر سکو گی کیونکہ خدا اس کا مولا و یاور و مددگار ہے، اِسی طرح جبرئیل، صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔ (و ان تظاهرا علیه فان الله هو مولاه و جبریل و صالح المؤمنین والملائکة بعد ذالك ظهیر)

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس ماجرے نے پیغمبرؐ کے پاک دِل اور عظیم رُوح میں کس حد تک منفی اثر چھوڑا تھا، یہانتک کہ خود خدا کو ان کا دفاع کرنا پڑا۔ نیز باوجود اس کے کہ اس کی قدرت ہر لحاظ سے کافی ہے جبرئیل، صالح المومنین اور دُوسرے فرشتوں کی حمایت کا بھی اعلان کر رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ 'صحیح بخاری' میں ابن عباس سے نقل ہُوا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا: میں نے عمر بن خطاب سے پوچھا: پیغمبرؐ کی وہ دو بیویاں کون تھیں جنھوں نے آنحضرتؐ کے خلاف اتفاق کر لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا وہ حفصہ اور عائشہ تھیں۔ اس کے بعد مزید کہا: خدا کی قسم! ہم جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کے لیے کسی چیز کے قائل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ خُدا نے ان کے بارے میں آیات نازل کر دیں اور ان کے لیے کچھ حقوق مقرر کر دیئے (اور وہ جسور ہو گئیں) [1]

تفسیر 'دُرالمنثور' میں بھی ابن عباس سے ایک مفصّل حدیث میں ہے کہ عمر بن خطّاب کہتے ہیں: "اس ماجرے کے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ پیغمبرؐ نے سب بیویوں سے کنارہ کشی کر لی ہے اور 'مشربۂ امّ ابراہیم' نامی مقام پر ٹھہرے ہُوئے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟" آپ نے فرمایا: "نہیں"! میں نے عرض کیا: "اللہ اکبر! ہم جمعیت قریش ہمیشہ اپنی بیویوں پر مُسلّط رہتے تھے، لیکن جب سے ہم مدینہ میں آئے ہیں تو ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر مُسلّط ہیں اور ہماری عورتوں نے بھی اُن سے یہ چیز سیکھ لی ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میری بیوی مجھ سے جھگڑ رہی ہے تو میں نے اس عمل کو عجیب اور بُرا سمجھا۔ اس نے کہا کہ تجھے تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ خدا کی قسم! پیغمبرؐ کی بیویاں بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ یہاں تک بعض اوقات ان سے زیادتی کرتی ہیں۔ تب میں نے اپنی بیٹی حفصہ کو نصیحت کی کہ وہ ایسا نہ کرے اور میں نے اس سے کہا کہ اگر تیری ہمسائی (مراد بی بی عائشہ ہے) ایسا کرے، تو بھی تو ایسا

(بقیہ سابقہ صفحہ) اور تقدیر میں اس طرح تھی: ان تتوبا الی اللّٰہ کانت خیرلکما (یا اسی معنی کے مشابہ کوئی اور دوسری تقدیر) لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ شاید آیت میں کوئی محذوف نہ ہو اور صفت قلوبکما کا جملہ شرط کی جزاء ہو (اس قید کے ساتھ کہ جُملہ کا مفہوم حق کی طرف تمایل ہونے کو باطل کی طرف) لیکن یہ احتمال بہُت ہی بعید ہے، کیونکہ شرط تو فعل مضارع کی صورت میں ہے اور اکثر نحویوں کے نظریہ کے مُطابق یہ صحیح نہیں ہے۔ ضمناً قلوبکما کا ذکر جمع کے صیغہ کے ساتھ نہ کہ تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ اس بناء پر ہُوا ہے کہ دو تثنیوں کا ایک ساتھ ہونا فصاحت کے لحاظ سے نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ اِس لیے جمع کی صورت میں ذکر ہُوا اور اس کا معنی تثنیہ ہے۔

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵ (سورہ تحریم کے ذیل میں)

نہ کرنا، کیونکہ اس کے حالات تجھ سے مختلف ہیں"۔[1]

"صالح المومنین" کے بارے میں بھی ایک بحث ہے جو انشاء اللہ نکات کے بیان میں آئے گی۔

٭ ٭ ٭

آخری زیرِ بحث آیت میں خدا تمام ازواج پیغمبر کی طرف رُوئے سُخن کرتے ہُوئے تہدید آمیز لب ولہجہ میں فرماتا ہے: "اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو اُمید ہے کہ پروردگار تمھاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے۔ ایسی بیویاں جو مُسلمان، مومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، خدا کی اطاعت شعار، غیر باکرہ اور باکرہ عورتیں ہوں گی"۔ (عسٰی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجًا خیرًا منکن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات وابکارًا)۔

اِس طرح انھیں خبردار کرتا ہے کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ پیغمبر تمھیں ہرگز طلاق نہیں دے گا، اور یہ بھی تصور نہ کرنا کہ اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو تمھاری جگہ آنے والی بیویاں تم سے بہتر نہیں ہوں گی، لہٰذا تم سازش جھگڑے اور آزار واذیت سے باز آجاؤ ورنہ پیغمبر کی زوجیت کے اعزاز وافتخار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاؤ گی اور تم سے بہتر اور بافضیلت عورتیں تمھاری جگہ لے لیں گی۔

٭ ٭ ٭

چند نکات

۱: اچھی بیوی کے اوصاف

یہاں قرآن نے ایک اچھی بیوی کے لیے چھ صفات بیان کی ہیں تاکہ وہ سب مسلمانوں کے لیے بیوی کا انتخاب کرتے وقت نمُونہ بن سکیں۔

پہلی صفت "اسلام" ہے اور اس کے بعد "ایمان" ہے۔ یعنی ایسا اعتقاد جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں نفوذ کر جائے۔ اس کے بعد "قنوت" یعنی تواضع، انکساری اور شوہر کی اطاعت ہے۔ اس کے بعد "توبہ" یعنی اگر اس سے کوئی غلط کام سرزد ہو جائے تو وہ عُذر خواہی کرے اور اپنی غلطی پر اصرار نہ کرے۔ اس کے بعد خدا کی عبادت اور ایسی "عبادت" جو اس کی روح و جان کو سنوار دے، اور اسے پاک و پاکیزہ بنا دے۔ اس کے بعد "فرمانِ خدا کی اطاعت" اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کا ذکر ہُوا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہُت سے مفسرین نے 'سائحات' جمع 'سائح' کی تفسیر صائم (روزہ دار) کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا، روزہ دو قسم کا ہوتا ہے "حقیقی روزہ" جو کھانے پینے

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۲۴۳ (تلخیص کے ساتھ)

اور تعلق جنسی کو ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ دوسرا "حکمی روزہ" جس کا معنی بدن کے اعضاء و جوارح کو
گناہوں سے بچانا ہے یہاں اس کا دوسرا معنی مراد ہے۔
(راغب کا یہ قول مقام کی مناسبت کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت ہی عمدہ معلوم ہوتا ہے
لیکن جاننا چاہیے کہ مفسرین نے سائح کی تفسیر اس شخص کے لیے بھی کی ہے جو خدا کی اطاعت کی راہ میں
سیر کرتا ہے) [1]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے عورت کے باکرہ اور غیر باکرہ ہونے پر تکیہ نہیں کیا اور
اس کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ کیونکہ مذکورہ معنوی اوصاف کے مقابلہ میں اس مسئلہ کی کچھ زیادہ اہمیت
نہیں ہے۔

❊ ❊ ❊

۲: صالح المؤمنین سے کون مراد ہے؟

اس میں شک نہیں کہ "صالح المومنین" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام صالح باتقویٰ اور کامل الایمان
مومنین کو شامل ہے۔ اگرچہ صالح یہاں مفرد ہے جمع نہیں ہے، لیکن چونکہ جنس کا معنی رکھتا ہے۔ اس لیے
اس سے عمومیت کے معنی کا استفادہ ہوتا ہے۔ [2]

لیکن اس بارے میں کہ یہاں اس کا اتم و اکمل مصداق کون ہے؟ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ
اس سے مراد امیر المومنین علیؑ ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے:

لقد عرف رسول الله (ص) عليًا (ع) اصحابه مرتين: اما مرة فحيث قال: "من كنت مولاه فعلى مولاه" واما الثانية فحيث نزلت هذه الآية: "فان الله هو مولاه وجبريل وصالح المؤمنين ....." اخذ رسول الله (ص) بيد على (ع) فقال: ايها الناس هذا صالح المؤمنين!

---

[1] "سائح" "سیاحت" کے مادہ سے اصل میں ان جہانگرد سیاحوں کو کہتے ہیں جو بغیر توشہ و زادِ راہ کے چل پڑتے اور لوگوں کی مدد سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ روزہ دار اپنے آپ کو کھانے سے روکتا ہے یہاں تک کہ افطار کا وقت آجائے، اس لحاظ سے یہ بات سیاحت کرنے والوں کے مشابہ ہے لہٰذا اس لفظ کا اطلاق "صائم" یعنی روزہ دار پر ہوا ہے۔

[2] بعض نے صالح کو یہاں جمع سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "صالحوا" کی واؤ اضافت کے وقت حذف ہو جاتی ہے، لہٰذا قرآن کے رسم الخط میں بھی نہیں آئی لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

"حضرت رسُول نے امام علیؑ کا اپنے اصحاب سے دو مرتبہ (صراحت کے ساتھ) تعارُف کرایا۔ ایک مرتبہ تو اس وقت جبکہ آپ نے (غدیر خم میں) فرمایا :
من کنت مولاہ فعلی مولاہ : "جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کا علیؑ مولا ہے،
دوسری مرتبہ اس وقت جبکہ آیت ان اللہ ھو مولاہ .... نازل ہوئی، تب
حضرت رسُولؐ نے امام علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے لوگو! یہ صالح المومنین ہے"۔[1]

اس معنی کو بہت سے علماء اہلِ سُنّت نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان میں علامہ ثعلبی علامہ گنجی، ابوحیان اندلسی اور سبط ابن جوزی وغیرہ شامل ہیں۔[2]

بہت سے مفسرین اور منجملہ ان کے 'سیوطی' نے 'درالمنثور' میں، 'قرطبی' نے اپنی مشہور تفسیر میں اور اسی طرح 'آلوسی' نے 'روح المعانی' میں اسی آیت کی تفسیر میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

'روح البیان' کا مولف اس روایت کو 'مجاہد' سے نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: "اس حدیث کی تائید مشہور حدیث 'منزلت' سے ہوتی ہے کہ جس میں پیغمبرؐ نے امام علیؑ سے فرمایا: 'انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی': کیونکہ قرآن میں صالحین کا عنوان انبیاء کے لیے آیا ہے۔ منجملہ ان کے سُورۂ انبیاء کی آیت ۷۲ میں وکلاً جعلنا صالحین اور سورہ یُوسف کی آیت ۱۰۱ میں الحقنی بالصالحین ہے۔ (پہلی آیت میں 'صالح' کا عنوان انبیاء کی ایک جماعت کے لیے اور دوسری میں حضرت یوسف کے لیے آیا ہے۔ اور جب علیؑ بمنزلۂ ہارونؑ ہوں تو آپ بھی صالح کا مصداق ہوں گے۔ (غور کیجیے)

خلاصہ یہ کہ اِس سلسلے میں بہت زیادہ احادیث ہیں، جیسے مفسر معروف محدث 'بحرانی' تفسیر 'برہان' میں اس سلسلہ کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد محمد بن عباسؒ سے نقل کرتا ہے کہ اس نے اس بارے میں ۵۲ احادیث شیعہ اور اہلِ سُنّت کے طرق سے جمع کی ہیں۔ اس کے بعد وہ خود ان میں سے چند ایک احادیث نقل کرتا ہے۔[3][4]

۳: پیغمبرؐ کی اپنی بعض بیویوں سے ناراضی

طولِ تاریخ میں ایسے بہت سے بزرگ گزرے ہیں جن کی بیویاں ان کے شایانِ شان نہیں تھیں اور ان میں ضروری اوصاف نہ ہونے کی وجہ سے انھیں تکلیف اُٹھانا پڑتی تھی۔ ان میں سے کچھ نمونے بزرگ انبیاء کے بارے میں قرآنِ مجید میں بیان ہوئے ہیں :۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۶

[2] مزید وضاحت کے لیے "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۳۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد بن عباس وہی ابوعبداللہ ہے جو ابن الجحام کے نام سے مشہور ہے اور کتاب مانزل من القرآن من اھل بیتؑ کا مؤلف ہے۔ اس کتاب کے متعلق علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کی مثل کوئی کتاب ابھی تک تالیف نہیں ہوئی۔ (جامع الرواۃ جلد ۲ ص ۱۳۴)

[4] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵۳ حدیث ۲ کے ذیل میں۔

اوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام کی حالت بھی اپنی بعض بیویوں کی طرف سے ایسی ہی تھی - ان رقابتوں کی وجہ سے جو وہ ایک دوسری سے رکھتی تھیں، بعض اوقات وہ آنحضرتؐ کی روح پاک کو مجروح کرتی تھیں، کبھی وہ آپ پر اعتراض کرتی تھیں یا آپ کے راز کو فاش کر دیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدا نے انھیں سرزنش کی اور اپنے پیغمبرؐ کا دفاع کرتے ہوئے اس سلسلے میں تاکیدی فرمان دیا اور انھیں طلاق تک کی تہدید بھی کی۔ جیسا کہ ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ اوپر والی آیات میں مذکور واقعہ کے بعد آپ تقریباً ایک ماہ تک اپنی بیویوں سے ناراض رہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

اصولی طور پر آنحضرتؐ کی تاریخ زندگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبرؐ کی بعض بیویاں نہ صرف مقام نبوۃ کی ضروری اور لازمی معرفت نہیں رکھتی تھیں، بلکہ بعض اوقات آپ پر ایک عام آدمی کی طرح اعتراض کیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدانخواستہ آپ کی توہین بھی کرتی تھیں۔ اس بناء پر اوپر والی آیات کی صراحت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ اصرار کرنا کہ سب کی سب شائستہ اور کامل تھیں، بے دلیل نظر آتا ہے۔

تاریخ اسلام نے پیغمبرؐ کے بعد ان کی بیویوں کے بارے میں، خصوصاً داستانِ جنگ جمل نے اس بات کی نشاندھی کی ہے کہ یہ بات نہ صرف آنحضرتؐ کے زمانے میں تھی بلکہ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے بارے میں بھی دُہرائی گئی ہے۔ لیکن یہاں ان تمام مسائل کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اصولی طور پر اوپر والی آیات کی تعبیر جو یہ کہتی ہے: "اگر پیغمبرؐ تمھیں طلاق دے دے تو خدا اُسے تم سے بہتر بیویاں دے گا جو آیات میں مذکورہ چھ صفات کی حامل ہوں گی، اس واقعیت وحقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ کم از کم آنحضرتؐ کی بعض بیویاں ان اوصاف کی حامل نہیں تھیں۔

پیغمبرؐ کی بیویوں کے بارے میں سورۂ احزاب کی آیات کی طرف رجوع کرنے سے بھی اوپر والے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

۴ : افشائے راز

رازداری نہ صرف حقیقی مومنین کی صفات میں سے ہے بلکہ ہر بار ہر باحیثیت انسان کو راز دار ہونا چاہیے، پھر یہ بات قریبی دوستوں اور زوجہ وشوہر میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اوپر والی آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ پیغمبرؐ کی بعض بیویوں کو رازداری ترک کرنے کی بناء پر خدا نے کیسی شدت کے ساتھ ملامت اور سرزنش کی ہے۔

امام علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"جمع خیر الدنیا والأخرة فی کتمان السر ومصادقة الاخیار، وجمع الشر فی الاذاعة ومواخاة الاشرار"

"دنیا اور آخرت کی تمام خیر و خوبی ان دو چیزوں میں چھپی ہوئی ہے : راز کو پوشیدہ رکھنا اور نیک افراد سے دوستی۔ اور تمام شر ان دو چیزوں میں چھپا ہوا ہے : رازوں کا افشاء کرنا اور اشرار سے دوستی رکھنا۔

٭ ٭ ٭

۵: حلال خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے

وہ امور جو خدا کی طرف سے حلال یا حرام کر دیئے گئے ہیں وہ سب دقیق مصلحتوں کی بناء پر ہوئے ہیں۔ اسی بناء پر اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انسان کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام یا کسی حرام چیز کو اپنے اوپر حلال کرے، یہاں تک کہ اگر اس سلسلے میں قسم بھی کھا لے، جیسا کہ اوپر والی آیات میں آیا ہے تو اس قسم کو توڑ سکتا ہے۔

ہاں! اگر کوئی ایسا مباح فعل جس کے ترک کی قسم کھائی ہے، کوئی مکروہ فعل ہو یا کسی جہت سے اس کا ترک کرنا اولیٰ اور بہتر ہو تو اس صورت میں اُسے قسم کی پابندی کرنا چاہیے۔

۶ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ
اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝

۷ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

۸ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا عَسَىٰ
رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ
النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ
وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ
إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۶ اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ
جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وہ آگ جس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بہت ہی سخت گیر
اور تیز و تند ہیں۔ وہ کبھی بھی خدا کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے احکام و فرامین کی پوری پوری تعمیل کرتے

۷۔ اے کافرو! آج عذر خواہی نہ کرو، کیونکہ تمھیں توصرف تمھارے اعمال کا ہی بدلہ دیا جائے گا۔
۸۔ اے ایمان لانے والو! توبہ کرو۔ اللہ کے حضور خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمھارا پروردگار اس کی وجہ سے تمھارے گناہ بخش دے گا، اور تمھیں جنّت کے ان باغات میں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا۔ خدا اس دن پیغمبرؐ کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو ذلیل وخوار نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب چل رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے: پروردگارا! ہمارے نور کو کامل کر دے اور ہمیں بخش دے۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

خدا پیغمبرؐ کی بعض بیویوں کو خبردار کرنے اور انھیں سرزنش کرنے کے بعد زیربحث آیات میں رُوئے سُخن تمام مومنین کی طرف کرتے ہُوئے بیوی، اولاد اور گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ احکام دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔" (یاایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارًا وقودھا الناس والحجارۃ)۔

خود کو بچانا تو گناہوں کو ترک کرنے اور سرکش خواہشات کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کرنے کے ساتھ ہے، اور گھر والوں کو بچانا تعلیم و تربیت اور امربالمعروف ونہی از منکر کرنا نیز گھر اور گھرانے کی فضا میں ایک پاک اور ہر قسم کی آلودگی سے مبرّا ماحول فراہم کرنا ہے۔

یہ وہ طریقۂ کار ہے جو گھرانے کے سنگ بنیاد، یعنی ازدواج کے مقدمات سے اور اس کے بعد بچے کی پیدائش کے پہلے لمحہ سے شروع ہونا چاہیے۔ ان تمام مراحل میں صحیح لائحہ عمل ترتیب دے کر پورے انہماک سے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

دُوسرے لفظوں میں بیوی اور اولاد کا حق صرف ان کی ضروریاتِ زندگی، مکان اور کھانے پینے کی چیزوں کے فراہم کرنے سے پورا نہیں ہوجاتا۔ ان سے زیادہ اہم ان کی رُوح اور جان کی غذا کا مُہیا کرنا اور صحیح اصولِ تعلیم و تربیت کو

عمل میں لانا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "قوا" (بچاؤ) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم انھیں خود ان کی اپنی حالت پر چھوڑ دو گے تو وہ خواہ مخواہ جہنم کی آگ کی طرف بڑھیں گے، صرف تمھیں ان کو جہنم کی آگ میں گرنے سے بچا سکتے ہو۔

"وقود" (بروزن کبود) جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں "آتشگیر یعنی ایسے مادہ کے معنی میں ہے جو آگ پکڑنے کے قابل ہو۔ مثلاً ایندھن؛ (آگ لگانے والے مثلاً دیا سلائی کے معنی میں نہیں ہے) کیونکہ عرب اُسے 'زناد' (چقماق) کہتے ہیں۔

اِس لحاظ سے جہنم کی آگ دنیاوی آگ کی مانند نہیں ہے۔ اس کے شعلے خود انسان کے وجود کے اندر سے ہی بلند ہوتے ہیں۔ (اور پتھروں کے اندر سے بھی) نہ صرف گندھک کے پتھر سے جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے بلکہ ہر قسم کے پتھر سے، کیونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ موجودہ زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا ہر ٹکڑا ایٹم کے اربوں کھربوں ذرات سے مرکب ہے اور اگر ان کے اندر موجود ذخیرہ آزاد ہو جائے تو ایسی آگ پیدا کر دے کہ انسان دنگ رہ جائے۔

بعض مفسرین نے یہاں 'حجارۃ' کی تفسیر بتوں کے ساتھ کی ہے جو پتھر سے بنائے جاتے تھے اور مشرکین انھیں پوجا کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اِس آگ پر ایسے فرشتے مقرر کیے گئے ہیں جو بہت ہی سخت اور تند و تیز ہیں۔ وہ ہرگز خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ وہ انھیں جو بھی حکم دیتا ہے، اس کی بے چون وچرا تعمیل کرتے ہیں۔" (علیها ملائکة غلاظ شداد لا یعصون الله ما امرهم ویفعلون ما یؤمرون)۔

اِس طرح نہ تو بھاگنے کی ہی کوئی راہ ہے اور نہ ہی گریہ وزاری، التماس والتجا اور جزع وفزع ہی موثر ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر مامور جس بھی کام پر مقرر ہوتا ہے وہ اس لحاظ سے مناسب جذبات رکھتا ہے۔ **لہٰذا** عذاب پر مامور افراد کو طبعی طور پر سخت اور تند و تیز ہونا چاہیے۔ کیونکہ جہنم رحمت کا مرکز نہیں ہے بلکہ خدا کے **غیظ** و غضب کا مرکز ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مامورین ہرگز عدالت کی سرحد سے خارج نہیں ہوں گے اور حکم خدا کو بے کم وکاست جاری کریں گے۔

یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے ایک سوال پیش کیا ہے کہ اوپر والی آیت میں عدم عصیاں کی تعبیر قیامت میں عدم وجود تکلیف کے مسئلہ کے ساتھ کس طرح سازگار ہے؟

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فرشتوں کی اطاعت اور ترکِ عصیاں ایک قسم کی تکوینی اطاعت ہے نہ کہ تشریعی اور اطاعتِ تکوینی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ خدائی فرامین کا انتہائی میل و رغبت اور خاص لگاؤ کے ساتھ عین اختیار کے ساتھ اجراء کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں کُفّار کو مخاطب کرکے اس دن کی وضع وکیفیت بیان کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "اے کافرو آج عُذر و معذرت نہ کرو، کیونکہ تمھیں توصرف تمھارے اعمال ہی کی جزا دی جائے گی۔" (یاایها الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون)۔

اِس آیت کا گزشتہ آیت کے بعد قرار پانا کہ جس میں مخاطب مومنین تھے،اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی اولاد اور گھر والوں کی حالت کا خیال نہ رکھو گے تو ممکن ہے تمھارا مُعاملہ اس حد تک پہنچ جائے کہ قیامت کے دن اس خطاب سے مُخاطب کیے جاؤ۔

انما تجزون ما کنتم تعملون کی تعبیر دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ قیامت میں گنہگاروں کی جزاء خود انھیں کے اعمال ہیں جو ان کے سامنے ظاہر ہوں گے اور ان کے ساتھ ہوں گے۔ گزشتہ آیت کی تعبیر کہ جہنم کی آگ خود انسانوں کے اندر سے شعلہ زن ہوگی وہ اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہاں عذر و معذرت کا قبول نہ ہونا اس بناء پر ہے کہ عذرخواہی ایک قسم کی توبہ ہے اور توبہ صرف اس جہان میں ہی امکان پذیر ہے، نہ کہ دوسرے جہان میں اور نہ ہی جہنّم میں ورُود کے بعد توبہ کی کوئی گنجائش ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

بعد والی آیت حقیقت میں جہنّم کی آگ سے نجات کا راستہ بتاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: "اے ایمان لانے والو! اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور توبہ کرلو، خالص توبہ۔" (یاایها الذین اٰمنوا توبوا الی اللّٰه توبة نصوحا)۔

ہاں! نجات کے لیے پہلا قدم گناہ سے توبہ ہے، ایسی توبہ جو ہر لحاظ سے خالص ہو، ایسی توبہ جس کا مُحرّک حکمِ خدا اور خوفِ گناہ ہو، نہ کہ گناہ کے اجتماعی اور دنیاوی آثار سے وحشت! ایسی توبہ جو انسان کو ہمیشہ کے لیے معصیت اور نافرمانی سے دور کردے اور پھر اس میں گناہ کی طرف بازگشت رونما نہ ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت، وہی گناہ سے ندامت وپشیمانی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام تھا جس کی تلافی ہوسکتی ہے تو اس کی تلافی کی کوشش کرے۔ استغفار کرنا بھی اسی معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرح سے توبہ کے ارکان کا پانچ باتوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱ : ترکِ گناہ

۲ : ندامت

۳ : آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ

۴ : گزشتہ گناہوں کی تلافی

۵ : استغفار

'نصوح' 'نصح' (بروزن صلح) کے مادہ سے اصل میں خالص خیرخواہی کے معنی میں ہے۔ اسی لیے خالص شہد کو 'ناصح' کہا جاتا ہے۔ چونکہ حقیقی و واقعی خیرخواہی کو مضبوطی کے ساتھ توأم ہونا چاہیئے، لہذا 'نصح' کا لفظ بعض اوقات اس معنی کے لیے بھی آتا ہے۔

اسی بناء پر محکم عمارت کو 'نصاح' (بروزن کتاب) اور درزی کو 'ناصح' کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں معنی یعنی خالص ہونا' اور 'محکم ہونا' توبۂ 'نصوح' میں جمع ہونے چاہئیں۔[1]

اس بارے میں کہ توبۂ نصوح کیا ہوتی ہے، مفسرین نے بہت زیادہ تفاسیر بیان کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے ان تفاسیر کی تعداد ۲۳ بتائی ہے۔[2] لیکن وہ سب تفاسیر ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں یا وہ توبہ کی مختلف قسمیں اور مختلف اوصاف وصفات ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ 'توبۂ نصوح' وہ ہوتی ہے جس میں چار اوصاف و شرائط ہوں۔

۱ : قلبی پشیمانی

۲ : زبانی استغفار

۳ : ترکِ گناہ

۴ : آئندہ کے لیے ترک گناہ کا پختہ ارادہ

بعض نے کہا ہے کہ توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جس میں تین اوصاف و شرائط ہوں :

۱ : اس بات کا خوف کہ شاید قبول نہ ہو

۲ : اس بات کی اُمید کہ قبول ہو جائے گی۔

۳ : خدا کی اطاعت پر قائم رہنا۔

یا توبۂ نصوح یہ ہے کہ اپنے گناہ کو ہمیشہ اپنی نظر کے سامنے رکھے اور اس سے شرمندہ ہوتا رہے۔

یا توبۂ نصوح یہ ہے کہ جو چیزیں ظلم کے ساتھ لی ہیں وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دے، مظلوموں سے حلیت طلب کرے اور خدا کی اطاعت کا پابند رہے۔

یا توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جس میں یہ تین شرطیں ہوں :

۱ : کم بولنا۔ ۲ : کم کھانا۔ ۳ : کم سونا۔

یا توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جو رونے والی آنکھ اور گناہ سے بیزار دل سے توأم ہو .... اور دیگر اسی قسم کے

---

[1] بعض کا خیال یہ ہے کہ 'نصوح' ایک خاص شخص کا نام ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مفصل داستان توبۂ نصوح کے عنوان سے نقل کی ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ نصوح کسی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک وضعی معنی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ مشہور واقعہ صحیح ہو۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۶۷۶

اُور جو سب ایک ہی واقعیت کے شاخ و برگ ہیں اور یہ خالص و کامل توبہ ہے۔
ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے کہ جب 'معاذ بن جبل' نے توبۂ نصوح کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا :

"ان یتوب التائب ثم لا یرجع فی ذنب کما لا یعود اللبن الی الضرع"۔

"توبہ نصوح" یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر کسی طرح بھی گناہ کی طرف نہ لوٹے، جیسا کہ دُودھ کبھی پستان کی طرف نہیں لوٹتا۔[1]

یہ لطیف تعبیر اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ توبۂ نصوح انسان میں اس طرح سے انقلاب برپا کر دیتی ہے کہ اس پر پہلی حالت کی طرف بازگشت کی راہ کلی طور پر بند کر دیتی ہے، جیسا کہ دُودھ کی پستان کی طرف بازگشت قطعی طور پر ناممکن ہوتی ہے۔

یہ مطلب جو دوسری روایات میں بھی آیا ہے حقیقت میں توبۂ نصوح کے اعلیٰ ترین درجہ کو بیان کرتا ہے، ورنہ نچلے مراحل میں تو یہ ممکن ہے کہ گناہ کی طرف بازگشت ہو جائے اور توبہ کی تکرار کے بعد انجام کار دائمی ترک پر جا منتہی ہو۔

اس کے بعد توبۂ نصوح کے آثار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : "امید ہے کہ اس کام کی وجہ سے تمھارا پروردگار تمھارے گناہوں کو بخش دے اور ان کی پردہ پوشی کرے۔" (عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیّاٰتکم)۔

"اور تمھیں اس جنّت کے باغات میں داخل کرے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔" (و یدخلکم جنّات تجری من تحتها الانهار)۔

"یہ کام اس دن ہو گا جس دن خدا پیغمبرؐ اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ذلیل و خوار نہیں کرے گا۔" (یوم لا یخزی الله النبی والذین اٰمنوا معه)۔

"یہ اس حال میں ہو گا کہ ان کا (ایمان اور عمل صالح کا) نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چل رہا ہو گا، وہ عرصۂ محشر کو روشن کر دے گا اور بہشت کی طرف ان کی راہ کھول دے گا۔" (نورهم یسعٰی بین ایدیهم وبایمانهم)۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں وہ خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کر کے کہیں گے : "پروردگارا! ہمارے نور کو مکمل کر دے اور ہمیں بخش دے کیونکہ تو ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔" (یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انك علٰی کل شیٔ قدیر)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۸

حقیقت میں اس توبۂ نصوح کے پانچ عظیم ثمر ہیں :

پہلا : سیئات اور گناہوں کی بخشش۔

دوسرا : خدا کی نعمتوں والی جنّت میں داخلہ۔

تیسرا : اس دن رُسوائی اور ذلّت کا نہ ہونا جس دن سب پردے ہٹ جائیں گے اور جھوٹے تباہ و رُسوا اور ذلیل ہو جائیں گے۔ ہاں! اس دن پیغمبرؐ اور مومنین آبرومند ہوں گے۔ کیونکہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا، وہ حقیقت بن جائے گا۔

چوتھا : اُن کے ایمان اور عمل کا نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چلے گا اور جنّت کی طرف ان کی راہ کو روشن کر دے گا۔ (بعض مفسّرین نے اس نور کو جو ان کے آگے آگے چلے گا "عمل" کا نُور سمجھا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک دوسری تفسیر بھی تفسیر نمُونہ کی جلد ۱۳ میں سورہ حدید کی آیت ۱۲ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔)

پانچواں : ان کی توجّہ خدا کی طرف زیادہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ بارگاہِ خدا کی طرف رُخ کر کے اس سے نور کی تکمیل اور اپنے گناہوں کی مکمّل بخشش کا تقاضا کریں گے۔

چند نکات

۱: اہلِ خانہ کی تعلیم و تربیت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حُکم ایک عام حکم ہے جو تمام مسلمان ایک دُوسرے کے لیے رکھتے ہیں لیکن اوپر والی آیات اور ان روایات سے جو اسلامی مصادر میں اولاد وغیرہ کے حقوق کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی بیوی اور اولاد کے لیے بہت ہی بھاری ذمّہ داری رکھتا ہے۔ اس کی ذمّہ داری یہ ہے کہ جہاں تک اس سے ہو سکے ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرے، انھیں گناہ سے باز رکھے اور نیکیوں کی طرف دعوت دے، نہ یہ کہ صرف ان کے جسم کے لیے غذا وغیرہ مہیّا کرنے پر قناعت کرے۔

حقیقت میں ایک عظیم مُعاشرہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے مل کر بنتا ہے، جس کا نام خاندان (گھرانا) ہے جب ان چھوٹی چھوٹی اکائیوں کی اصلاح ہو جائے، جن کی دیکھ بھال آسان ہے، تو پھر سارے معاشرے کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ ذمہ داری پہلے درجہ میں ماں باپ کے کاندھوں پر ہے۔

خصوصًا ہمارے زمانہ میں جب کہ فساد کی تباہ کرنے والی موجیں گھروں کے باہر بہت ہی قوی اور خطرناک

ہیں، انھیں بے اثر کرنے کے لیے گھرانے کی تعلیم و تربیت کا زیادہ بنیادی اور زیادہ دقیق لائحہ عمل مرتب کیا جانا چاہیے۔

نہ صرف قیامت کی آگ بلکہ دنیا کی آگ کا سرچشمہ بھی انسانوں کے وجود کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھرانے کو اس آگ سے محفوظ رکھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک نے آپ سے سوال کیا: "ہم اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے کس طرح محفوظ رکھیں"؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تأمرهم بما امر الله، وتنهاهم عما نهاهم الله ان اطاعوك كنت قد وقيتهم، وان عصوك كنت قد قضيت ما عليك"

"انھیں امر بالمعروف اور نہی از منکر کر، اگر تجھ سے انہوں نے قبول کر لیا تو پھر تو نے انھیں جہنم کی آگ سے بچا لیا، اگر انھوں نے قبول نہ کیا تو تُو نے اپنا وظیفہ اور ذمہ داری پوری کر دی"۔[1]

ایک اور جامع اور عمدہ حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے:

"الا كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالامير على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته، والرجل راع على اهل بيته وهو مسئول عنهم فالمرئة راعية على اهل بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم، الا فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته۔"

"یاد رکھو کہ تم سب کے سب نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔ حکومت اسلامی کا رئیس و امیر تمام لوگوں کا نگہبان ہے۔ لہٰذا وہ ان سب کے لیے جوابدہ ہے اور عورت بھی اپنے شوہر کے گھرانے اور اولاد کی نگہبان ہے اور ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔ جان لو کہ تم سب ہی نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو، ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔[2]

ہم اس وسیع بحث کو امیرالمؤمنین علیؑ کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں امامؑ نے اوپر والی آیت

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۷۲

[2] "مجموعہ ورام" جلد اول ص ۶

کی تفسیر میں فرمایا :

"علموا انفسکم و اھلیکم الخیر و ادبوھم"

اس سے مُراد یہ ہے کہ تم خود کو اور اپنے گھروالوں کو نیکی کی تعلیم دو، اور انھیں آداب سکھاؤ۔ [1]

٭ ٭ ٭

۲ : توبہ رحمتِ خدا کا ایک دروازہ ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان سے، خصوصاً تربیت اور سیر و سلوک الی اللہ کی ابتداء میں بہت سی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر اس کے سامنے توبہ اور بازگشت کے دروازے بند کر دیئے جائیں تو وہ مایوس ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔ اس لیے اسلام کے مکتبِ تربیتی میں توبہ کو ایک تربیتی اصل کے عنوان کے طور پر حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور وہ تمام گنہگاروں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنی اصلاح اور گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے اس دروازے سے وارد ہوں۔

امام علیؑ بن الحسینؑ بارگاہِ خداوندی میں تائبین کی مناجات میں اس طرح سے عرض کرتے ہیں :

"الٰھی انت الذی فتحت لعبادك بابا الی عفوك سمیته التوبة، فقلت توبوا الی اللہ توبة نصوحًا، فما عذر من اغفل دخول الباب بعد فتحه"

"اے میرے اللہ تو ہی تو ہے کہ جس نے اپنی عفو و بخشش کی طرف اپنے بندوں کے سامنے ایک دروازہ کھولا ہے کہ جس کا نام تو نے توبہ رکھا ہے۔ تو نے فرمایا ہے کہ خدا کی طرف لوٹو، اور توبہ کر لو، خالص توبہ، اب ان لوگوں کا عذر کیا ہے جو اس دروازہ کے کھلنے کے بعد اس دروازے سے داخل ہونے سے غافل ہو جائیں"؟ [2]

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

"ان اللہ تعالیٰ اشد فرحًا بتوبة عبده من رجل اضل راحلته و زاده فی لیلة ظلماء، فوجدھا"

"خداوند تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ وہ شخص خوش

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۲۴۴

[2] پندرہ مناجاتوں میں سے پہلی مناجات۔ بحار الانوار جلد ۹۴ ص ۱۴۲

ہوتا ہے جس نے ایک رات میں اپنی سواری اور زادِ راہ گُم کر دیا ہو، اور پھر اسے پا لیا ہو۔[1]

عظمت اور بزرگواری رکھنے والی یہ سب تعبیریں زندگی کے اس اہم امر کی حیاتی تشویق کے لیے ہیں۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ توبہ صرف لقلقۂ لسانی اور زبان سے "استغفراللہ" کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ شرائط اور ارکان ہیں کہ جن کی طرف اوپر والی آیات میں توبۂ نصوح کی تفسیر میں اشارہ ہُوا ہے۔ جب توبہ ان شرائط کے ساتھ انجام پاتی ہے تو وہ اس طرح اثر کرتی ہے کہ وہ انسان کی رُوح اور جان سے گناہ اور آثارِ گناہ کو کلی طور پر محو کر دیتی ہے، اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"التائب من الذنب کمن لا ذنب له، والمقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء!"

"جو شخص گناہ سے توبہ کر لے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے بالکل کوئی گناہ نہیں کیا، جو شخص اپنے گناہ پر برقرار رہے اور استغفار بھی کرتا رہے، تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو مذاق اُڑاتا اور تمسخر کرتا ہو۔"[2]

ہم توبہ کے بارے میں دُوسرے تفصیلی مباحث (دوسری جلد میں) سورۂ نساء کی آیت ۱۷ کے ذیل میں اور (جلد ۱۱ میں) سورۂ زمر کی آیت ۵۳ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب التوبہ حدیث ۸

[2] اصول کافی جلد ۲ باب التوبہ حدیث ۱۰

(۹) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○
(۱۰) ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ
امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا
صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا
وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ○
(۱۱) وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ
اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ
مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ۙ
(۱۲) وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا
فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَ
كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ○

ترجمہ

(۹) اے پیغمبرؐ! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے

ہے۔ اور وہ بُری جگہ ہے۔

۱۰ خدا نے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے ہیں، ایک مثال دی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال اور لوطؑ کی بیوی کی مثال۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن ان دونوں سے انھوں نے خیانت کی، اور ان دونوں (پیغمبروں) کے ساتھ ان کا تعلق (عذاب الٰہی کے مقابلہ میں) انھیں کوئی نفع نہ دے سکا اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ، آگ میں داخل ہو جاؤ۔

۱۱ اور خدا نے مومنین کے لیے بھی ایک مثال بیان کی ہے۔ وہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جبکہ اس نے کہا پروردگارا! میرے لیے اپنے ہاں جنّت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم قوم سے رہائی بخش دے۔

۱۲ اور اسی طرح سے مریمؑ بنتِ عمران کی مثال بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا اور ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا، اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ خدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی۔

تفسیر

مؤمن اور کافر عورتوں کے نمونے

چونکہ منافقین پیغمبرؐ کے گھر کے اندر کے رازوں کے فاش ہونے اور آپ کی بیویوں کے درمیان جھگڑے اور اختلافات کے ظاہر ہونے پر جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا، خوش تھے بلکہ انھیں اور ہوا دیتے تھے، شاید اسی مناسبت سے پہلی زیرِبحث آیت میں ان کے بارے میں شدّتِ عمل کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔" (یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم ومأواھم جھنم وبئس المصیر)۔

یہ جہاد کفار کے مقابلہ میں تو ممکن ہے کہ مسلح یا غیر مسلح ہو، لیکن منافقین کے مقابلہ میں شک نہیں کہ یہ مسلح جہاد نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی تاریخ میں یہ نقل نہیں ہُوا کہ پیغمبرؐ نے منافقین کے ساتھ مسلح جنگ کی ہو۔ لہٰذا ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ان رسول الله لم یقاتل منافقًا قط انما کان یتألفهم"

"رسولِ خداؐ نے ہرگز کسی منافق سے جنگ نہیں کی، بلکہ آپ ہمیشہ ان کی تالیفِ قلوب کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔"

اس بناء پر ان کے ساتھ جہاد کرنے سے مُراد وہی توبیخ، سرزنش، انذار، ڈرانا اور انھیں رُسوا کرنا ہے یا بعض موارد میں ان کی تالیفِ قلوب کرنا ہے، کیونکہ 'جہاد' ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے۔ اور ہر قسم کی جدوجہد اور سعی و کوشش کو شامل ہے "واغلظ علیهم" (ان پر سختی اور خشونت کرو) کی تعبیر بھی گفتگو میں سختی اور اُن کا افشا کرنے، تہدید، دھمکی اور اس قسم کی چیزوں میں سختی کی طرف اشارہ ہے۔

منافقین کے ساتھ یہ مخصوص وضع و کیفیت اِس بناء پر تھی کہ وہ ظاہرًا اسلام کا دم بھرتے اور مسلمانوں کے ساتھ مکمّل طور پر آمیزش رکھتے تھے، لہٰذا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ایک کافر جیسا سلوک کیا جائے۔ البتہ یہ اس صورت میں تھا کہ وہ ہتھیاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔ اگر وہ یہ کام کرتے تو یقینًا ان کے ساتھ مقابلہ بالمثل ہوتا، کیونکہ اس صورت میں وہ "محارب" کا عنوان اپنے لیے لے لیتے۔

اگرچہ یہ مسئلہ پیغمبر کے زمانہ میں واقع نہیں ہُوا، لیکن آنحضرتؐ کے بعد خصوصًا امیر المومنینؑ کے زمانہ میں رُونما ہوا اور آپ مسلح جنگ کے لیے کھڑے ہُوتے۔

بعض نے کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں "منافقین سے جہاد" کرنے سے مُراد ان کے بارے میں حدودِ شرعی کا اجراء ہے، کیونکہ وہ لوگ جن پر حد جاری ہُوئی اکثر منافقین تھے۔ لیکن اس تفسیر اور اس دعوے کے لیے کہ اس زمانہ میں زیادہ تر حدُودِ شرعی ان ہی لوگوں پر جاری ہوئی ہیں، ہمارے پاس کوئی دلیل موجُود نہیں ہے قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت بعینہٖ اور بغیر کسی کمی و زیادتی کے سورۂ توبہ آیت ۷۳ میں بھی آئی ہے

* * *

اِس کے بعد دوبارہ پیغمبرؐ کی بیویوں کے ماجرے کی طرف لوٹتا ہے۔ اِس بناء پر کہ انھیں عملی اور زندہ سبق دے، دو بے تقویٰ عورتوں کی سرنوشت جو دو بزرگ پیغمبروں کے گھر میں تھیں، اور دو مومن و ایثارگر خواتین کی سرنوشت بیان کرتا ہے جن میں سے ایک تاریخ کے جابرترین شخص کے گھر میں تھی۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا نے کافروں کے لیے ایک مثال بیان کی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال اور لوطؑ کی بیوی کی مثال۔" (ضرب الله مثلًا للذین کفروا امرأت نوح و امرأت لوط)۔ [1]

---

[1] ضرب کے یہاں دو مفعول ہیں۔ "امرأۃ نوحؑ" مفعُول اوّل ہے جو مُؤخّر ہوگیا ہے اور 'مثلًا' دوسرا مفعول ہے (باقی اگلے صفحہ)

"وہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں لیکن انہوں نے اُن سے خیانت کی"۔ (کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما)۔

"لیکن ان دو عظیم پیغمبروں سے ان کے ارتباط نے عذابِ الٰہی کے مقابلہ میں انھیں کوئی نفع نہیں دیا اور اُن سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے لوگوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ"۔ (فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئًا وقیل ادخلا النار مع الداخلین)۔

اِس طرح سے پیغمبرؐ اسلام کی ان دو بیویوں کو جنھوں نے افشاءِ راز کیا اور آنحضرتؐ کو تکلیف و آزار پہنچایا تھا خبردار کرتا ہے کہ وہ یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ صرف پیغمبر کی بیوی ہونا انھیں عذاب سے بچالے گا۔ جس طرح نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کا رابطہ خیانت کی وجہ سے خاندانِ نبوت و وحی سے منقطع ہو گیا اور وہ دونوں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو گئیں۔

ضمنی طور پر یہ تمام طبقات کے مومنین کو ایک تنبیہ ہے کہ وہ گناہ و عصیان کی صُورت میں اولیاءاللہ کے ساتھ اپنے رشتوں اور تعلقات کو عذابِ الٰہی سے مانع نہ سمجھ بیٹھیں۔

مفسّرین کے بعض کلمات میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی کا نام "والھۃ" اور حضرت لوطؑ کی بیوی کا نام "والعۃ" تھا۔ [1] اور بعض نے اس کے برعکس لکھا ہے۔ یعنی نوحؑ کی بیوی کا نام 'والعۃ' اور لوطؑ کی بیوی کا نام 'واھلۃ' یا 'والھۃ' کہا ہے۔ [2]

بہرحال ان دونوں عورتوں نے ان دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ خیانت کی، البتہ ان کی خیانت جادۂ عفّت سے انحراف ہرگز نہیں تھا، کیونکہ کسی پیغمبرؐ کی بیوی ہرگز بے عفتی سے آلودہ نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبرِ اسلام سے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے:

"ما بغت امراۃ النبی قط۔"

"کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہرگز منافیٔ عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی"۔ [3]

حضرت لوطؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اس پیغمبر کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتی تھی اور آنحضرت کے گھر کے راز انھیں بتاتی تھی، اور حضرت نوحؑ کی بیوی بھی ایسی ہی تھی۔

'راغب' مفردات میں کہتا ہے کہ: "خیانت" اور "نفاق" حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں، سوائے اِس

---

[1] ...الف) یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ 'ضرب' کا ایک ہی مفعول ہو اور وہ مثلاً ہے اور 'امرأۃ نوح' اس کا بدل ہے۔ (البیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۴۹)

قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۶۸۰

[2] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۱۴۲ (بعض نے نوحؑ کی بیوی کا نام 'واغلہ' یا 'والغہ' بھی بیان کیا ہے)

[3] نور الثقلین جلد ۶ ص ۲۴۵

کے کہ 'خیانت' عہد و امانت ' کے مقابلہ میں ہوتی ہے، اور نفاق مسائل دینی میں۔
اس داستان کی پیغمبرؐ کے گھر کے افشائے راز کی داستان کے ساتھ مناسبت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خیانت سے مُراد یہی ہو۔
بہرحال اوپر والی آیت ان افراد کی جھُوٹی اُمیدوں کو جو یہ گمان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ جیسے عظیم شخص سے تعلق اور رشتہ داری ہی ان کی نجات کا سبب بن جائے گی (چاہے عمل کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو) منقطع کر دیتی ہے، تاکہ کوئی بھی شخص اس لحاظ سے اپنے لیے نجات کا قائل نہ ہو۔ اِس لیے آیت کے آخر میں کہتا ہے: "ان سے کہا جائے گا تم بھی تمام دوزخیوں کے ساتھ جہنّم میں داخل ہو جاؤ۔" یعنی تمھارے اور دُوسروں کے درمیان اِس لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

اس کے بعد باایمان افراد کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے: "خُدا نے مومنین کے لیے ایک مثال بیان کی ہے: یہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جس وقت اس نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: میرے پروردگار! میرے لیے اپنے نزدیک جنّت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے کاموں سے نجات دے اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات عطا فرما"۔ (وضرب الله مثلاً للذین اٰمنوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندك بیتًا فی الجنة و نجنی من فرعون وعمله و نجنی من القوم الظالمین)۔
مشہور یہ ہے کہ فرعون کی بیوی کا نام آسیہ اور اس کے باپ کا نام مزاحم تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اُس نے جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو اس کے دل کی گہرائیاں نورِ ایمان سے روشن ہوگئیں، وہ اسی وقت مُوسیٰؑ پر ایمان لے آئی۔ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ لیکن ایمان اور خدا کا عشق ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمیشہ چھپایا جا سکے۔ جب فرعون کو اس کے ایمان کی خبر ہُوئی تو اس نے اُسے بارہا سمجھایا اور منع کیا اور اصرار کیا کہ موسیٰؑ کے دین سے دستبردار ہو جائے اور اس کے خدا کو چھوڑ دے، لیکن یہ با استقامت خاتون فرعون کی خواہش کے سامنے ہرگز نہ جھکی۔
آخرکار فرعون نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میخوں کے ساتھ باندھ کر اسے سُورج کی جلتی ہُوئی دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس کے سینہ پر رکھ دیں۔ جب وہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہی تھی تو اس کی دُعا یہ تھی:
"پروردگارا! میرے لیے جنّت میں اپنے جوارِ رحمت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے رہائی بخش اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے۔"
خدا نے بھی اس پاکباز اور فداکار مومنہ خاتون کی دعا قبول کی اور اسے مریمؑ جیسی دنیا کی بہترین خاتون کے

[redacted]

قرار دیا جیسا کہ وہ ان آیات میں مریمؑ کے ہم ردیف قرار پائی ہے۔

ایک روایت میں رسولِ خداؐ سے آیا ہے :

"افضل نساء اهل الجنة خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد (ص) ومريم بنت عمران و آسية بنت مزاحم امرأة فرعون !

" اہلِ جنّت میں افضل ترین اور برترین عورتیں چار ہیں ۔ خویلد کی بیٹی 'خدیجہؑ' محمدؐ کی بیٹی 'فاطمہؑ' اور عمران کی بیٹی 'مریمؑ' اور مزاحم کی بیٹی 'آسیہ' جو فرعون کی بیوی تھی۔" ؎

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ فرعون کی بیوی اپنی اس بات سے فرعون کے عظیم قصر کی تحقیر کر رہی ہے، اور اُسے خُدا کے جوارِ رحمت میں گھر، کے مُقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ اس گفتگو کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اُسے یہ نصیحت کرتے تھے کہ ان تمام نمایاں وسائل و امکانات کو جو ملکۂ مصر ہونے کی وجہ سے تیرے قبضہ و اختیار میں ہیں موسیٰؑ جیسے چرواہے پر ایمان لاکر ہاتھ سے نہ دے۔ جواب دیتی ہے :

اور "نجنی من فرعون وعملہ" کے جُملہ کے ساتھ خُود فرعون سے اور اس کے مظالم اور جرائم سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

اور "نجنی من القوم الظالمین" کے جُملہ سے اس آلودہ ماحول سے اپنی علیحدگی، اور ان کے جرائم سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرتی ہے۔

زندگی کے آخری لمحات میں اس با معرفت اور ایثار گر عورت کے یہ تینوں جملے کس قدر جچے تلے اور حساب شدہ ہیں، ایسے جملے جو پوری دنیا کی سب عورتوں اور مردوں کے لیے نفع بخش اور باعث ہدایت ہو سکتے ہیں۔ ایسے جملے، جو ان تمام افراد کے ہاتھوں سے، جو ماحول یا زوج کے دباؤ کو خدا کی اطاعت اور تقوٰی کو ترک کرنے کا ایک جواز شمار کرتے ہیں فضول بہانوں کو چھین لیتے ہیں۔

مسلّمہ طور پر فرعون کے دربار سے بڑھ کر زرق برق اور جلال وجبروت موجود نہیں تھا۔ اسی طرح فرعون جیسے جابر وظالم کے شکنجوں سے بڑھ کر فشار اور شکنجے موجود نہیں تھے۔ لیکن نہ تو وہ زرق برق اور نہ ہی وہ فشار اور شکنجے اس مومنہ عورت کے گھٹنے جھکا سکے۔ اس نے رضائے خدا میں اپنا سفر اسی طرح سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنی عزیز جان اپنے حقیقی محبوب کی راہ میں فدا کر دی۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ وہ یہ استدعا کرتی ہے کہ اے خدا جنّت میں اور اپنے جوار میں اس کے لیے

؎ در المنثور جلد ۶ ص ۲۴۶

ایک گھر بنا دے جس کا جنت میں ہونا تو جنبۂ جسمانی ہے اور خدا کے جوارِ رحمت میں ہونا جنبۂ روحانی ہے۔ اس نے ان دونوں کو ایک مختصر سی عبارت میں جمع کر دیا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد دوسری با شخصیت خاتون کی طرف، جو صاحب ایمان لوگوں کے لیے نمونہ شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " اور خدا نے مریم بنت عمران کی مثال بھی بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا" (ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها)۔[1]

" اور ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا" (فنفخنا فیه من روحنا)۔

اور اس نے خدا کے حکم سے شوہر کے بغیر بچہ جنا جو پروردگار کا اولوالعزم پیغمبر بنا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور ان سب پر ایمان لائی" (وصدقت بکلمات ربها وکتبه)۔

" اور وہ خُدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی" (وکانت من القانتین)۔

وہ ایمان کے لحاظ سے اعلیٰ مرتبے پر تھی۔ تمام آسمانی کتابوں اور اوامر الٰہی پر ایمان رکھتی تھی اور عمل کے لحاظ سے ہمیشہ احکام الٰہی کی مطیع تھی۔ وہ خدا کی ایک ایسی کنیز تھی جو اپنی جان و دل ہتھیلی پر لیے ہوئے آنکھ اس کے حکم پر اور کان اس کے فرمان پر لگائے رکھتی تھی۔

"کلمات" اور "کتب" میں فرق ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ کتب کی تعبیر سے تو ان تمام آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہو جو پیغمبروں پر نازل ہُوئی ہیں اور کلمات کی تعبیر سے مراد وہ الہام ہوں جو کتاب آسمانی کی صورت میں نہیں آئے تھے۔

مریمؑ ان کلمات اور کتابوں پر ایسا ایمان رکھتی تھی کہ قرآن نے سورۃ مائدہ کی آیت ۷۵ میں اُسے صدیقہ (بہت زیادہ تصدیق کرنے والی) کے عنوان سے یاد کیا ہے۔

قرآن کی مختلف آیات میں اس باایمان خاتون کی شخصیت اور اس کے مقام والا کے سلسلہ میں بہت زیادہ مطالب نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک اہم حصّہ تو اس سورہ میں ہے جو اسی کے نام سے موسُوم ہے۔ (ایک گروہ نے صدیقہ کی توصیف زیادہ سچ بولنے والی کے ساتھ کی ہے۔)

بہرحال قرآن ان تعبیروں کے ساتھ مریمؑ کے دامن کو ان ناروا باتوں سے، جو آلودہ اور جنایتکار یہودیوں کی ایک جماعت اس کے بارے میں کہتی تھی اور وہ لوگ اس کی شخصیت اور اس کی پاک دامنی کے خلاف جو کچھ

---

[1] اس بارے میں کہ 'فرج' کی تعبیر سے کیا مُراد ہے ؟ ہم نے ایک تفصیلی بیان، تفسیر نمونہ کی جلد ۷ میں ص ۴۹۲ پر (سورۃ انبیاء کی آیت ۹۱ کے ذیل میں) پیش کیا ہے۔

باتیں بناتے تھے، ان سے اس کو پاک و پاکیزہ شمار کرتا ہے اور بدگوئی کرنے والوں کے مُنہ پر ایک سخت طمانچہ رسید کرتا ہے۔

"فنفخنا فیہ من روحنا" (ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونکا) کی تعبیر سے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ ایک باعظمت اور بلند روح مُراد ہے، یا دوسرے لفظوں میں 'خدا' کی طرف 'روح' کی اضافت ایک "اضافہ تشریفیہ" ہے کہ جو کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔ مثلاً بیت اللہ کی تعبیر میں 'گھر' کی اضافت خدا کی طرف سے ہے، ورنہ خدا کی نہ رُوح ہے نہ گھر اور نہ بیت۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسّرین نے خدا کے ہاں باشخصیت اور والامقام عورتوں کے بارے میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بی بی عائشہ کو ان سب سے برتر و افضل ترین شمار کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس حدیث کو سورہ تحریم کی تفسیر میں ذکر نہ کرتے، کیونکہ سورہ تحریم تو اس گھڑی ہوئی حدیث کے برخلاف پکار پکار کر پیغام دے رہی ہے، جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اہلِ سنّت کے بہت سے مفسّرین و مؤرخین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ دو عورتیں جن کی اس سورہ کی آیات شدّت کے ساتھ مذمّت کر رہی ہیں اور جو خُدا اور اس کے رسولؐ کے غیظ و غضب کا سبب بنی ہیں، وہ حفصہ و عائشہ تھیں، اور یہی بیان صراحت کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے۔[1]

ہم ان تمام لوگوں سے جو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر غور و خوض اور سوچ بچار کرتے ہیں، یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ پھر سے اس سورہ کی آیات کا مُطالعہ کریں اور اس کے بعد اس قسم کی حدیثوں کی قدر و قیمت کو واضح اور روشن کریں۔

٭ ٭ ٭ ٭

خُداوندا! ہمیں بے ثبوت اور تعصب آمیز حب و بغض سے محفوظ رکھ اور ایسا کر کہ ہم قرآن مجید کی آیات کے مقابلہ میں اپنے سارے وجُود کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیں اور خاضع رہیں۔

پروردگارا! وہ دن نہ آئے کہ تیرا عظیم پیغمبرؐ ہمارے اعمال سے ناخوش اور ہماری زندگی کی روش سے ناراض ہو۔

بارالٰہا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ سارے جہان میں زمانے کے فرعونوں کے دباؤ اور شکنجے ہماری روح اور ایمان پر معمولی سے معمولی اثر بھی نہ کریں۔ آمین یا رب العالمین۔

اختتام سورۂ تحریم
۷ر شوال ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۸ر ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۴ر اگست ۱۹۸۷ء
تقریباً پونے آٹھ بجے صبح ۸۱-ای ماڈل ٹاؤن : لاہور

---

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵

سُورَۃ مُلک

یہ سورہ مکّۃ میں نازل ہوا اور اس کی ۳۰ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز

۷ شوال ۱۴۰۶ھ

سورۂ مُلک کے مضامین

یہ سورہ جو قرآنِ مجید کے پارہ ۲۹ کی ابتداء ہے ان سوروں میں ہے جو مشہور قول کے مطابق سارے کے سارے مکہ میں نازل ہوئے، جیسا کہ اس پارہ کی زیادہ تر سورتیں مکّی ہی ہیں۔ بلکہ بعض مفسّرین کے قول کے مطابق تو اس پارے کی تمام کی تمام سُورتیں مکّی ہیں،[1] گزشتہ پارہ کی سُورتوں کے برعکس کہ جو مدنی تھیں لیکن جیسا کہ ہم بیان کریں گے کہ سورہ دہر (یا سورۃ انسان) اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ مدینہ میں نازل ہُوئی ہے۔

سورۂ مُلک جس کا دوسرا نام 'مُنجّیہ' (نجات بخشنے والی) اور تیسرا نام 'واقیہ' یا 'مانعہ' ہے (کیونکہ وہ اپنے تلاوۃ کرنے والے کو عذابِ الٰہی یا عذابِ قبر سے محفوظ رکھتی ہے) قرآن کی بہت ہی بافضیلت سورتوں میں سے ہے۔

اس میں بہت سے مسائل پیش ہوئے ہیں جو زیادہ تر تین محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱ : مبدأ، خدا کی صفات، خلقت کا شگفت انگیز نظام خصوصاً آسمانوں اور ستاروں کی خلقت، زمین کی خلقت اور اس کی نعمتیں اور اسی طرح پرندوں کی خلقت، جاری ہونے والے پانی نیز کان، آنکھ اور آلاتِ شناخت کی خلقت کے بارے میں بحث ہے۔

۲ : معاد و قیامت، دوزخ کا عذاب اور دوزخیوں کے ساتھ عذاب کے فرشتوں کی گفتگو اور اسی قسم کے امُور سے متعلق مُباحث۔

۳ : کافروں اور ظالموں کو دُنیا و آخرت کے انواع و اقسام کے عذابوں سے انذار و تہدید، بعض کے قول کے مطابق تمام سورہ کا محور اصلی وہی خدا کی مالکیت و حاکمیت ہے جو پہلی آیت میں آئی ہے۔[2]

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۱۸۰

[2] گزشتہ مدرک ص ۱۸۴

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں پیغمبرؐ اور ائمہ اہل بیتؑ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں :
منجملہ ان کے ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة تبارك فكأنما احيا ليلة القدر"

"جو شخص سورہ تبارک کو پڑھے تو ایسا ہے جیسا کہ اس نے شب قدر بیدار رہ کر عبادت میں بسر کی ہو۔" [1]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے :

"وددت ان تبارك الملك فی قلب كل مؤمن"

"میں دوست رکھتا ہوں کہ سورہ تبارک تمام مومنین کے دل میں ثبت ہو جائے۔" [2]

ایک حدیث میں امام محمد بن علی الباقرؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"سورة الملك هی المانعة تمنع من عذاب القبر وهی مكتوبة فی التوراة سورة الملك ومن قرأها فی ليلة فقد اكثر، واطاب، ولم يكتب من الغافلين ..."

"سورہ ملک سورہ مانعہ ہے، یعنی عذاب قبر سے بچاتی ہے اور تورات میں اسی نام کے ساتھ لکھی ہوئی ہے جو شخص اس کو رات کے وقت پڑھے تو اس نے بہت کچھ پڑھا اور خوب پڑھا ـــــ وہ غافلین میں شمار نہیں ہو گا۔" [3]

اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

البتہ یہ سب عظیم آثار فکر و عمل کے بغیر پڑھنے سے مربوط نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد ایسا پڑھنا ہے جس میں عمل کے لیے ہدایت ہو۔

۱،۲،۳ "مجمع البیان ج ۱۰ ص ۳۲۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ
قَدِیۡرُۨ ۙ﴿۱﴾

۲ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ
اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾

۳ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی
فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ
ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾

۴ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ
خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾

۵ وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ جَعَلۡنٰہَا
رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ ﴿۵﴾

ترجمہ

خدائے رحمن و رحیم کے نام سے۔

۱ برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں سارے عالم

ہستی کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۲) وہی ذات ہے جس نے موت وحیات کو پیدا کیا، تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے، اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔

(۳) وہی جس نے سات آسمانوں کو ایک دُوسرے کے اوپر پیدا کیا۔ تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے۔ پھر نظر دوڑا کر دیکھو۔ کیا تمھیں کوئی شگاف یا خلل نظر آتا ہے؟

(۴) پھر دوبارہ (عالم ہستی کی طرف) نظر اٹھا کر دیکھو، انجام کار تیری نظر (خلل ونقص کی جستجو میں ناکام ہو کر) تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔

(۵) ہم نے نچلے آسمان کو روشن چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیاطین کے لئے (شہب) تیر قرار دیا ہے، اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب فراہم کیا ہے۔

تفسیر

تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے۔

یہ سورہ خدا کی مالکیت وحاکمیت اور اس کی ذات پاک کے دوام اور ہمیشگی جیسے اہم مسئلہ سے شروع ہوتا ہے جو حقیقت میں اس سورہ کے تمام مباحث کی کلید ہے۔

فرماتا ہے: "برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات، جس کے قبضۂ قدرت میں عالم ہستی کی حکومت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (تبارك الذی بیده الملك وهو علی كل شیٔ قدیر)۔

"تبارك"، "برکت" کے مادہ سے اصل میں "برك" (بروزن برگ) ہے جو اُونٹ کے سینہ کے معنی میں ہے۔ جب "برك البعیر" کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اونٹ نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا، اس کے بعد یہ لفظ دوام، بقاء اور زوال ناپذیر کے معنی میں اور ہر اس نعمت کے معنی میں جو پائیداری و دوام رکھتی ہو، بولا

جانے لگا۔ پانی کے خزانے کو بھی اس لیے 'برکہ' کہتے ہیں کیونکہ پانی ایک طویل مدت تک اس میں باقی اور محفوظ رہتا ہے۔

اوپر والی آیت میں حقیقت میں خدا کی ذات پاک کے مبارک ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے، اور عالم پر اس کی مالکیت و حاکمیت اور ہر چیز پر اس کی قدرت ہے، اسی بناء پہ وہ زوال ناپذیر اور برکت سے پُر وجُود ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انسان کی موت و حیات کی خلقت، جو خدا کی مالکیت و حاکمیت کے شئون میں سے ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے۔" (الذی خلق الموت والحیاة لیبلوکم ایکم احسن عملاً)۔

"موت" اگر فنا اور نیستی کے معنی میں ہو تو مخلوق نہیں ہے۔ کیونکہ خِلقت کا تعلق اُمورِ وُجودی کے ساتھ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ موت کی حقیقت ایک جہان سے دُوسرے جہان کی طرف انتقال ہے اور یہ یقیناً ایک وجُودی امر ہے جو مخلوق ہو سکتا ہے۔

اگر یہاں موت کا حیات سے پہلے ذکر ہُوا ہے تو اس کی وجہ وہ گہری تاثیر ہے جو حُسنِ عمل میں موت کی طرف توجہ سے ہوتی ہے۔ اِس سے قطع نظر کہ موت زندگی سے پہلے بھی تھی۔

خدا کی آزمائش سے مُراد، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ایک قسم کی تربیت ہے اس معنی میں کہ وہ انسانوں کو میدانِ عمل کی طرف کھینچتی ہے تاکہ تجربے اور آزمائش میں پاک و پاکیزہ ہو کر قربِ خدا کے لائق ہوجائے[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آزمائش کا ہدف "حُسنِ عمل کو بتایا گیا ہے نہ کہ کثرتِ عمل کو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کیفیت کو اہمیت دیتا ہے کمیت کو نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عمل خالص ہو، خُدا کے لیے اور مفید و جامع ہو، اگرچہ کمیت و مقدار کے لحاظ سے تھوڑا ہو۔

اِس لیے اس بارے میں کہ 'احسن عملاً' سے کیا مُراد ہے؟ بعض اسلامی روایات میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہُوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اتمکم عقلا، واشدکم للّٰه خوفًا، و احسنکم فیما امر اللّٰه به و نھی عنه نظرا، و ان کان اقلکم تطوعا"!

"اس سے مُراد یہ ہے کہ تم میں سے کس کی عقل و خرد کامل اور خدا ترسی زیادہ ہے اور

---

[1] خدائی آزمائشوں کے بارے میں مزید تشریح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں ملاحظہ کریں۔

خدا کے اوامر و نواہی سے کون زیادہ آگاہی رکھتا ہے، چاہے تمھارے مستحبی اعمال کم ہی ہوں"۔ [1]

صاف ظاہر ہے کہ کامل عقل، عقل کو پاک تر، نیت کو خالص تر اور اجر و پاداش کو زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"لیس یعنی اکثر عملا، ولکن اصوبکم عملا، و انما الاصابة خشیة الله والنیة الصادقة، ثم قال الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل، والعمل الخالص الصالح الذی لا ترید ان یحمدک علیه احد الا الله عزوجل"

"یہ مراد نہیں ہے کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم میں سے زیادہ صحیح عمل کون کرتا ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں خدا پرستی اور پاک نیت شامل ہو۔ اس کے بعد فرمایا: عمل کو آلودگی سے محفوظ رکھنا خود عمل سے زیادہ سخت ہے۔ خالص و صالح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تو یہ نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس عمل پر تیری تعریف کرے"۔ [2]

انسان کی خلقت کے ہدف کے بارے میں ہم سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہدف "عبودیتِ خدا" ذکر ہوا ہے، اور یہاں "حسنِ عمل کی آزمائش"۔ یہ بات واضح ہے کہ آزمائش و امتحان کا مسئلہ عبودیت کے مسئلہ سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ کمالِ عقل، خدا ترسی اور نیتِ خالص، جن کی طرف اوپر والی روایات میں اشارہ ہوا ہے رُوحِ عبودیت ہیں۔

اِس طرح یہ دُنیا تمام انسانوں کے لیے ایک عظیم آزمائش کا میدان ہے۔ آزمائش کا ذریعہ موت و حیات ہے اور اس عظیم آزمائش کا ہدف حسنِ عمل تک پہنچنا ہے۔ جس کا مفہوم تکاملِ معرفت، اخلاصِ نیت اور ہر کارِ خیر کو انجام دینا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مفسّرین نے یہاں "احسن عملا" کی تفسیر موت کو یاد کرنے یا موت کے لیے آمادہ ہونے اور اسی قسم کے امُور سے کی ہے تو وہ حقیقت میں اس معنیٰ کلّی کے مصادیق میں سے ہے۔

چونکہ اس عظیم آزمائش کے میدان میں انسان بہت سی لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ لغزشیں اسے مایوس کر دیں اور اس کی سعی و کوشش سے اسے باز نہ رکھیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں بندوں کو مدد اور بخشش کا وعدہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۲

[2] تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

دیتے ہوئے کہتا ہے: "اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔" (وھو العزیز الغفور)۔

ہاں! وہ ہر چیز پر قادر اور ہر توبہ کرنے والے انسان کو بخشنے والا ہے۔

موت وحیات کے نظام کو بیان کرنے کے بعد عالم کے نظامِ کلّی کو پیش کرتے ہوئے انسان کو مجموعۂ عالم ہستی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو اس عظیم آزمائش کے لیے آمادہ کرے، فرماتا ہے: "وہی خدا جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا" (الذی خلق سبع سماوات طباقًا)۔

سات آسمانوں کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے تھوڑی سی بحث سورۃ طلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں بھی کر چکے ہیں۔ یہاں 'طباقًا' کے بارے میں ہم کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بناء پر ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں کیونکہ "مطابقۃ" کا معنی اصل میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دیں۔

اب اگر ہم سات آسمانوں کو منظومۂ شمسی کے سات کروں کی طرف اشارہ سمجھیں، جو بغیر کسی آلہ کے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سورج کے ساتھ ایک معیّن فاصلہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے۔

لیکن اگر ہم ان تمام ثوابت وسیار ستاروں کو جنھیں ہم دیکھتے ہیں پہلے آسمان کی جزء شمار کر لیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالاتر مراحل میں کچھ دوسرے عوالم ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے"۔ (ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت)۔

عالم ہستی اس ساری عظمت کے باوجود جو کچھ بھی ہے وہ نظم ونسق، استحکام وانسجام، جچی تلی اور ٹھیک ٹھیک حساب شدہ ترکیبات اور دقیق قوانین ہیں۔ اگر اس عالم کے کسی گوشہ میں بے نظمی واقع ہو جاتی تو وہ اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔

اس عجیب وغریب نظام سے لے کر جو ایک ایٹم کے ذرّہ اور الیکٹرون وپروٹون کے ذرّات پر حاکم ہے، کل منظومۂ شمس اور دوسرے منظوموں اور کہکشاؤں پر حاکم نظامات تک، سب کے سب دقیق قوانین کے زیرِ تسلط ہیں جو انھیں ایک خاص راستہ پر چلا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر جگہ قانون وحساب ہے اور ہر جگہ ایک نظم اور خاص ترکیب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "پھر نظر دوڑا کر دیکھو اور اس عالم کو غور سے دیکھو، کیا تمھیں اس میں کوئی شگاف یا خلل اور اختلاف نظر آتا ہے؟" (فارجع البصر ھل تریٰ من فطور)۔

"فطور" - "فطر" (بروزن سطر) کے مادہ سے، طول میں شگاف کرنے کے معنی میں ہے اور توڑنے کے معنی میں (مثلاً روزہ کا افطار) اور اختلال وفساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیرِ بحث آیت میں اسی معنی میں ہے۔

خدا کے اوامر و نواہی سے کون زیادہ آگاہی رکھتا ہے، چاہے تمہارے مُستحبی اعمال کم ہی ہوں"۔ ۱؎

صاف ظاہر ہے کہ کامل عقل، عقل کو پاک تر، نیّت کو خالص تر اور اجر و پاداش کو زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

"لیس یعنی اکثر عملا ، ولکن اصوبکم عملا ، و انما الاصابة خشیة اللہ و النیة الصادقة ، ثم قال الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل ، والعمل الخالص الصالح الذی لا ترید ان یحمدک علیہ احد الا اللہ عزوجل"

"یہ مراد نہیں ہے کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ تم میں سے زیادہ صحیح عمل کون کرتا ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں خدا پرستی اور پاک نیت شامل ہو۔ اس کے بعد فرمایا : عمل کو آلودگی سے محفوظ رکھنا خود عمل سے زیادہ سخت ہے۔ خالص و صالح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تو یہ نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس عمل پر تیری تعریف کرے"۔ ۲؎

انسان کی خلقت کے ہدف کے بارے میں ہم سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہدف "عبودیتِ خدا" ذکر ہوا ہے، اور یہاں "حُسنِ عمل کی آزمائش"۔ یہ بات واضح ہے کہ آزمائش و امتحان کا مسئلہ عبودیت کے مسئلہ سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ کمالِ عقل، خدا ترسی اور نیّت خالص، جن کی طرف اوپر والی روایات میں اشارہ ہوا ہے رُوحِ عبودیت ہیں۔

اِس طرح یہ دُنیا تمام انسانوں کے لیے ایک عظیم آزمائش کا میدان ہے۔ آزمائش کا ذریعہ موت و حیات ہے اور اس عظیم آزمائش کا ہدف حسنِ عمل تک پہنچنا ہے۔ جس کا مفہوم تکاملِ معرفت، اخلاصِ نیّت اور ہر کارِ خیر کو انجام دینا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مفسّرین نے یہاں "احسن عملا" کی تفسیر موت کو یاد کرنے یا موت کے لیے آمادہ ہونے اور اسی قسم کے اُمور سے کی ہے تو وہ حقیقت میں اس معنیٰ کلّی کے مصادیق میں سے ہے۔

چُونکہ اس عظیم آزمائش کے میدان میں انسان بہت سی لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ لغزشیں اسے مایوس نہ کر دیں اور اس کی سعی و کوشش سے اسے باز نہ رکھیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں بندوں کو مدد اور بخشش کا وعدہ

۱؎ تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۲

۲؎ تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

دیتے ہُوئے کہتا ہے : " اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے " (وھو العزیز الغفور)۔

ہاں ! وہ ہر چیز پر قادر اور ہر توبہ کرنے والے انسان کو بخشنے والا ہے۔

موت وحیات کے نظام کو بیان کرنے کے بعد عالم کے نظامِ کلّی کو پیش کرتے ہُوئے انسان کو مجموعۂ عالم ہستی کے مُطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو اس عظیم آزمائش کے لیے آمادہ کرے، فرماتا ہے : "وُہی خدا جس نے سات آسمانوں کو ایک دُوسرے کے اُوپر پیدا کیا" (الذی خلق سبع سماوات طباقاً)۔

سات آسمانوں کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے تھوڑی سی بحث سورۃ طلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں بھی کر چکے ہیں۔ یہاں 'طباقا' کے بارے میں ہم کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بناء پر ساتوں آسمان ایک دُوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں کیونکہ "مطابقۃ" کا معنی اصل میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دیں۔

اب اگر ہم سات آسمانوں کو منظومۂ شمسی کے سات کرّوں کی طرف اشارہ سمجھیں، جو بغیر کسی آلہ کے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سُورج کے ساتھ ایک معین فاصلہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک دُوسرے کے اُوپر ہے۔

لیکن اگر ہم ان تمام ثوابت وسیّار ستاروں کو جنھیں ہم دیکھتے ہیں پہلے آسمان کی جُزء شمار کریں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالاتر مراحل میں کچھ دوسرے عوالم ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتا ہے۔

اِس کے بعد مزید کہتا ہے : "تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے" (ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت)۔

عالم ہستی اِس ساری عظمت کے باوجود جو کچھ بھی ہے وہ نظم ونسق، استحکام و انسجام، نپی تلی اور ٹھیک ٹھیک حساب شدہ ترکیبات اور دقیق قوانین ہیں۔ اگر اس عالم کے کسی گوشہ میں بے نظمی واقع ہو جاتی تو وہ اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔

اس عجیب وغریب نظام سے لے کر جو ایک ایٹم کے ذرّہ اور الیکٹرون و پروٹون کے ذرّات پر حاکم ہے، کل منظومۂ شمسی اور دُوسرے منظوموں اور کہکشاؤں پر حاکم نظامات تک، سب کے سب دقیق قوانین کے زیر تسلط ہیں جو انھیں ایک خاص راستہ پر چلا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر جگہ قانون وحساب ہے اور ہر جگہ ایک نظم اور خاص ترکیب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے : "پھر نظر دوڑا کر دیکھو اور اس عالم کو غور سے دیکھو، کیا تمھیں اس میں کوئی شگاف یا خلل اور اختلاف نظر آتا ہے ؟" (فارجع البصر ھل ترٰی من فطور)۔

"فطور" - "فطر" (بر وزن سطر) کے مادّہ سے، طول میں شگاف کرنے کے معنی میں ہے اور توڑنے کے معنی میں (مثلاً روزہ کا افطار) اور اختلال وفساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے۔

مُراد یہ ہے کہ انسان عالم آفرینش میں چاہے جتنا بھی غور کرے، کم سے کم خلل اور ناموزونیت بھی اس میں نہیں دیکھے گا۔

* * *

اسی لیے بعد والی آیت میں اس معنی کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "پھر دوبارہ عالم ہستی کی طرف آنکھ کھول کر دیکھ، انجام کار تیری نظر خلل و نقص کی جستجو میں ناکام ہو کر اور تھک ہار کر تیری طرف پلٹ آئے گی"۔

(ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئًا وهو حسير)۔

"کرتین"۔ "کر" (بروزن شر) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف توجہ کرنے اور بازگشت کرنے کے معنی میں ہے۔ کرۃ کا معنی تکرار بھی ہے اور "کرتین" اس کا تثنیہ ہے۔ لیکن بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ یہاں کرتین سے تثنیہ کا معنی مُراد نہیں، بلکہ اس سے مکرّر، بار بار، پے در پے اور متعدد مرتبہ توجہ کرنا مُراد ہے۔

اس بناء پر قرآن ان آیات میں لوگوں کو کم از کم تین مرتبہ عالم ہستی کی طرف نظر کرنے اور اسرار خلقت و آفرینش کا مطالعہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ وہ ایک چیز میں بار بار غور کریں۔ پھر جب اس عجیب و غریب نظام میں معمولی سے معمولی اور کم سے کم خلل اور نقص نہ دیکھیں تو اس کارخانۂ عالم کے پیدا کرنے والے خالق اور اس کے بے پایاں علم و قدرت سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں۔

"خاسئ" "خسأ" اور "خسوء" (بروزن مدح و خشوع) کے مادہ سے۔ جب آنکھ کے لیے استعمال ہو تو خستہ اور ناتواں ہونے کے معنی میں ہے اور جب 'کتے' کے بارے میں استعمال ہو تو اسے دُور کرنے کے معنی میں ہے۔

"حسیر"۔ "حسر" (بروزن قصر) کے مادہ سے برہنہ کرنے کے معنی میں ہے، چونکہ انسان خستگی اور تکان کے وقت اپنی توانائی کھو بیٹھتا ہے اور گویا وہ اپنی توانائیوں سے برہنہ ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ خستگی اور ناتوانی کے معنی میں آیا ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیت میں 'خاسئ' اور 'حسیر' دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ یعنی عالم ہستی کے نظام میں کسی نقص و عیب کے دیکھنے سے آنکھ کی درماندگی اور ناتوانی کے موضوع میں تاکید کے لیے آئے ہیں۔

بعض نے ان دونوں کے درمیان اس طرح فرق کیا ہے کہ "خاسئ" ناکام ہونے کے معنی میں، اور 'حسیر' ناتواں کے معنی میں ہے۔

بہر حال ان آیات سے دو اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ قرآن راہِ حق کے تمام رہرؤوں کو تاکیدی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ ان سے جتنا ہو سکتا ہے اس عالم ہستی کے اسرار اور جہانِ آفرینش کے عجائبات کا مطالعہ کرتے ہُوئے ان میں غور و خوض کریں۔ نیز یہ کہ ایک مرتبہ اور دو مرتبہ پر قناعت نہ کریں۔ کیونکہ بُہت سے ایسے اسرار ہیں جو پہلی یا دُوسری نگاہ میں اپنی نشان دہی نہیں کرتے۔ تیز بین نگاہیں کئی مرتبہ نظر دوڑانے کے بعد ہی اُن

کو دیکھ پانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔
دوسرا یہ کہ انسان اس نظام میں جتنا زیادہ غور وخوض کرے گا اتنا ہی اس کے پردوں کو بہتر طور پر درک کرسکے گا۔
ایسا نظام، ساخت اور ترتیب جو ہر قسم کے نقص، خلل، کجی اور ٹیڑھے پن سے خالی ہے۔
اگر سطحی اور ابتدائی نظر میں اس جہان کے بعض موجودات، شرور و آفات اور فساد کے عنوان سے نظر آتے ہیں (مثلاً زلزلے، سیلاب، بیماریاں اور ناگوار حوادث، جو کبھی کبھی انسان کی زندگی میں رُونما ہوتے رہتے ہیں) تو زیادہ دقیق مطالعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر بہت سے اہم اسرار و رُموز رکھتے ہیں۔[1]
یہ آیاتِ بُرہانِ نظم کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ جو کہتی ہیں: "ہر کارخانہ میں نظم و نسق کا وجُود، اس کارخانہ کی پُشت پر علم وقدرت کے وجود کی نشانی ہے۔ ورنہ اتفاقی حوادث جو حساب شدہ نہ ہوں اندھے بہرے تصادفات نظام وحساب کا مبدء نہیں ہو سکتے، جیسا کہ حدیثِ مفضل میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ان الاهمال لا یأتی بالصواب، والتضاد لا یأتی بالنظام"

"مہمل کام کبھی درست نتیجہ نہیں دیتے، اور تضاد کبھی نظام کا مبدء نہیں ہو سکتا"[2]

٭ ٭ ٭

آخری زیرِ بحث آیت نے صفحۂ آسمان پر نگاہ ڈالی ہے جو خوبصورت اور چمکنے والے ستاروں کا ذکر کرتے ہُوئے کہتی ہے: "ہم نے نچلے آسمان کو چمکدار اور روشن ستاروں سے زینت بخشی ہے اور انھیں ہم نے شیاطین کے لیے تیر قرار دیا ہے، اور ان کے لیے جہنّم کی آگ کا عذاب فراہم کیا ہے" (ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناها رجومًا للشیاطین واعتدنا لهم عذاب السعیر)۔
ایک تاریک اور تاروں بھری رات میں آسمانوں کی طرف ایک نگاہ دُور دُور تک دکھائی دینے والے عوالم کی طرف توجّہ اور ان نظاموں کا تصوّر جو ان پر حاکم ہے، اس خوب صورتی نفاست، عمدگی، عظمت ہیبت اور پُراسرار سکوت میں غور کہ جو ان کے اوپر سایہ فگن ہے۔ انسان کو ایک عرفان اور نورِ حق سے پُر جہان میں داخل کر دیتا ہے۔ اسے عشقِ پروردگار کے ان عوالم میں سیر کراتا ہے جن کی کسی زبان سے تعریف وتوصیف نہیں ہو سکتی۔
یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ وہ تمام ستارے جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں، سب

---

[1] ہم نے اس مطلب کی تشریح "اثبات وجُودِ خُدا" کے مباحث میں آفات وبلیات کے سلسلہ میں مادیین کے دلائل کے جواب میں کی ہے۔ کتاب "آفریدگارِ جہاں" کی طرف رجُوع کریں۔ [2] بحار الانوار جلد ۳ ص ۶۳

پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ وہ آسمان جو سات آسمانوں میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔ اسی بناء پر اسے "السماء الدنیا" (نزدیک اور نچلے آسمان) کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"رجوم" (تیر) کی تعبیر ان شہابوں کی طرف اشارہ ہے جو تیر کی طرح آسمان کی ایک طرف سے دوسری طرف پھینکے جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ "شہب" ان ستاروں کے باقی ماندہ اجزاء ہیں جو بعض حوادث میں تباہ ہو گئے ہیں۔ اس بناء پر اگر وہ کواکب (ستاروں) کو شیاطین کے لیے تیر قرار دینے کی بات کہتا ہے تو وہ انھیں مخصوص سنگریزوں کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن شیاطین شہاب کے ان تیروں سے جو آسمانوں میں چھوٹے چھوٹے سرگرداں پتھر ہیں، کس طرح نشانہ بنتے ہیں؟ ہم اس کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۂ حجر کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) اور جلد ۱۰ (سورۂ صافات کی آیت ۲۰ کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

عالمِ آفرینش کی عظمت

باوجودیکہ قرآن مجید عرب کے زمانہ جاہلیت کے پسماندہ ماحول میں اُترا، لیکن وہ اکثر تاکید کرتا ہے کہ مسلمان عالمِ ہستی کے باعظمت اسرار میں غور و فکر کریں۔ وہ مطلب جس کا زمانۂ جاہلیت میں کوئی مفہوم ہی نہیں تھا یہ خود اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ قرآن ایک دوسرے مبدء سے صادر ہُوا ہے۔ اب علم و دانش جس قدر آگے بڑھتے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنی تاکیدوں کی عظمت اسی قدر آشکار تر ہوتی جا رہی ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ کرۂ زمین جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اتنا بڑا ہونے کے باوجود منظومۂ شمسی کے مرکز یعنی سُورج کی ٹکیہ کے مقابلہ میں اس قدر چھوٹی ہے کہ اگر بارہ لاکھ کرۂ زمین کو ایک دوسرے کے اوپر رکھیں تو پھر وہ سورج کی ٹکیہ کے برابر ہوگی۔

دوسری طرف سے ہمارا منظومۂ شمسی ایک عظیم کہکشاں کا ایک جُزء ہے، وہی کہکشاں جسے راہ شیری کہتے ہیں۔[1]

---

[1] کہکشائیں ستاروں کے مجموعے ہیں جو ستاروں کے شہروں کے نام سے مشہور ہیں اور ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے باوجود بعض اوقات ان کے درمیان کئی ملین نوری سالوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

ماہرین علم الافلاک کے حساب کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں ایک کھرب (۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) سے زیادہ ستارے موجود ہیں، اور ہمارا سورج اپنی تمام عظمت کے باوجود، اس کے متوسط ستاروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

تیسری طرف اس عظیم جہان میں اس قدر کہکشائیں موجود ہیں جو حساب و کتاب اور شمار و قطار سے باہر ہیں۔ نیز ستاروں کو دیکھنے والی دوربینیں جتنی عظیم اور آراستہ ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی نئی سے نئی کہکشائیں کشف ہو رہی ہیں۔ کس قدر عظیم و بزرگ ہے وہ خدا جس نے یہ عظیم منصوبہ ایسے دقیق نظام کے ساتھ بنایا ہے۔

العظمۃ للہ الواحد القہار

ماہرین علم الافلاک کے حساب کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں ایک کھرب (۱۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰) سے زیادہ ستارے موجود ہیں، اور ہمارا سورج اپنی تمام عظمت کے باوجود، اس کے متوسط ستاروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

تیسری طرف اس عظیم جہان میں اس قدر کہکشائیں موجود ہیں جو حساب و کتاب اور شمار و قطار سے باہر ہیں۔ نیز ستاروں کو دیکھنے والی دوربینیں جتنی عظیم اور آراستہ ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی نئی سے نئی کہکشائیں کشف ہو رہی ہیں۔ کس قدر عظیم و بزرگ ہے وہ خدا جس نے یہ عظیم منصوبہ ایسے دقیق نظام کے ساتھ بنایا ہے۔

العظمة للہ الواحد القہار

Duplicate

۶ وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَ
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝
۷ إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ ۝
۸ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَ
سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝
۹ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا
نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۝
۱۰ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَ
السَّعِيرِ ۝
۱۱ فَاعْتَرَفُوا بِذَنْبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝

ترجمہ

۶ اور ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا، جہنم کا عذاب ہے
اور وہ بُری جگہ ہے۔
۷ جس وقت وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس میں سے ایک وحشتناک آواز سنیں گے،

اور وہ ہمیشہ جوش مار رہی ہوگی۔

(۸) قریب ہے کہ وہ شدّتِ غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔ جس وقت اس میں کوئی گروہ ڈالا جاتا ہے تو دوزخ کے نگران (فرشتے) ان سے سوال کرتے ہیں کیا تمھارے پاس خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

(۹) وہ کہیں گے، ہاں! انذار کرنے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اُسے جھٹلایا اور یہ کہا کہ خُدا نے بالکل کوئی چیز نازل نہیں کی ہے اور تم ایک بہت بڑی گمراہی میں ہو۔

(۱۰) اور (یہ بھی) کہیں گے کہ اگر (ان کی بات) سنتے یا سمجھتے تب تو (آج) دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

(۱۱) اِس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں گے۔ دوزخی خدا کی رحمت سے دُور رہیں۔

تفسیر

اگرہم سننے والا کان اور بیدار فکر رکھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔

گذشتہ آیات میں خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیوں اور عالمِ آفرینش میں ان کے دلائل کے بارے میں گفتگو تھی۔ لہٰذا قرآن زیرِبحث آیات میں ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنھوں نے ان دلائل کی پروا نہیں کی، انھوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کر لی اور شیاطین کی طرح عذابِ الٰہی خرید بیٹھے۔

پہلے فرماتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا عذابِ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔" (وللذین کفروا بربھم عذاب جھنم و بئس المصیر)۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس وحشتناک عذاب کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "جس وقت کفار اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اس میں سے ایک وحشتناک صدا سنیں گے اور وہ ہمیشہ جوش مارنے کی حالت میں رہتی ہے۔" (اذا القوا فیھا سمعوا لھا شھیقًا وھی تفور)۔

ہاں! جس وقت انھیں انتہائی ذلّت وحقارت کے ساتھ اس میں پھینکا جائے گا تو جہنم کی وحشتناک اور طولانی صدا بلند ہوگی جو ان کے تمام وجُود کو وحشت میں غرق کر دے گی۔

"شھیق" اصل میں قبیح اور بُری آواز کے معنی میں ہے جیسا کہ گدھے کی آواز ہے۔ بعض اہلِ لغت نے

بھی کہا ہے کہ یہ "شھوق" کے مادے سے طولانی ہونے کے معنیٰ سے لیا گیا ہے۔ (اسی لیے اُونچے اور بلند پہاڑ کو جبل شاہق کہتے ہیں) اس بناء پر شہیق طولانی نالہ و فریاد کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ 'زفیر' تو اس آواز کو کہتے ہیں جو گلے میں پیچ کھاتی رہے اور 'شہیق' وہ آواز جو سینہ میں آمدورفت کرتی ہے۔ بہرحال یہ وحشت انگیز اور بے چین کر دینے والی آوازوں کی طرف اشارہ ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد 'دوزخ' کے غیظ و غضب کی شدت کو مجسم کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "قریب ہے کہ وہ شدتِ غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔" (تکاد تمیز من الغیظ)[1]

ٹھیک اس عظیم برتن کی طرح جسے حد سے زیادہ تیز حرارت والی آگ کے اوپر رکھا ہوا ہو اور وہ اس طرح جوش مارتا ہُوا اوپر نیچے ہو رہا ہو کہ ہر لمحہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہو۔ یا اس غصہ میں بھرے ہوئے انسان کی طرح جو چیخ چلا رہا ہو اور اس طرح کی آوازیں نکال رہا ہو جیسے ابھی پھٹ پڑے گا۔

ہاں! خدائی غضب کے اس مرکز، جہنم کا منظر ایسا ہی ہے۔

پھر وہی بات جاری ہے۔ "جس وقت کافروں کا کوئی گروہ اس میں پھینکا جائے گا تو دوزخ کے نگہبان تعجب اور سرزنش کے طور پر اس سے سوال کریں گے" کیا تمہارا کوئی رہبر و راہنما نہیں تھا؟ کیا خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا؟ پھر تم اس بدبختی میں کیوں آن پڑے ہو؟" (کلما القی فیھا فوج سألھم خزنتھا الم یأتکم نذیر)۔

انھیں اس بات کا یقین ہی نہیں آئے گا کہ کوئی انسان جانتے بُوجھتے اور آسمانی رہبر کے ہوتے ہُوئے اِس قسم کی سرنوشت میں گرفتار ہو جائے۔ اور اپنے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کرے۔

❊ ❊ ❊

لیکن وہ جواب میں کہیں گے: "ہاں ڈرانے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اس کی تکذیب کی اور کہا کہ خُدا نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اور خدا نے کسی پر وحی نہیں بھیجی ہے تاکہ ہم اپنی خواہش نفس کو جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ ہم نے ان سے کہا کہ تم عظیم گمراہی میں مبتلا ہو۔" (قالوا بلیٰ قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شیء ان انتم الا فی ضلال کبیر)۔

نہ صرف یہ کہ ہم نے ان کی تصدیق نہیں کی اور ان کے حیات بخش پیغام پر کان نہیں دھرا، بلکہ ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے، ان روحانی طبیبوں کو گمراہ کہہ کر اپنے سے دور کر دیا۔

---

[1] تمیز متلاشی اور پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے اور اصل میں تتمیز تھا۔

اِس کے بعد اپنی بدبختی اور گمراہی کی اصل دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہیں گے : "اگر ہم سننے والے کان رکھتے اور اپنی عقل کو کام میں لاتے تو ہرگز دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔" (وقالوا لوکنا نسمع او نعقل ماکنا فی اصحاب السّعیر)۔

٭ ٭ ٭

ہاں ! اس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے۔ "دُور ہوں دوزخی خدا کی رحمت سے۔" (فاعترفوا بذنبھم فسحقًا لاصحاب السعیر)۔

ان آیات میں دوزخیوں کی وحشت ناک سرنوشت کے بیان کے ضمن میں ان کی بدبختی کی اصل علت کی نشان دہی کرتے ہُوئے کہتا ہے : ایک طرف تو خدا نے سننے والے کان اور عقل و ہوش عطا کیا اور دوسری طرف واضح دلائل کے ساتھ اپنے پیغمبر بھیجے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں تو انسان کی سعادت کی تکمیل ہوجاتی ہے۔

لیکن اگر انسان کان تو رکھتا ہے مگر ان سے سنتا نہیں، آنکھیں رکھتا ہے مگر ان سے دیکھتا نہیں، اور عقل رکھتا ہے مگر اس سے سوچتا نہیں، تو اب اگر خُدا کے تمام کے تمام پیغمبر اور آسمانی کتابیں اس کے پاس آجائیں تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک گروہ نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں ایک مسلمان کی مدح وثنا کی تو رسولِؐ خُدا نے فرمایا :

"کیف عقل الرجل ؟"

"اس کی عقل کیسی ہے ؟"

انہوں نے عرض کیا : "یا رسُول اللہؐ ! ہم تو عبادت اور طرح طرح کے نیک کاموں میں اس کی جدّوجہد کی بات کر رہے ہیں اور آپ اس کی عقل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں" تب آپ نے فرمایا :

"ان الاحمق یصیب بحمقه اعظم من فجور الفاجر، و انما یرتفع العباد غدًا فی الدرجات، وینالون الزلفی من ربھم علی قدر عقولھم" !

"احمق کی حماقت سے جو مصیبت آتی ہے وہ فاجروں کے فجور اور بدکاروں کے گناہ سے بدتر ہوتی ہے۔ کل قیامت کے دن خدا بندوں کو ان کی عقل وخرد کے مُطابق درجات عطا فرمائے گا اور وہ اسی بُنیاد پر قربِ خداوندی حاصل کریں گے۔"

لہ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۴

"سُحق" (بروزن قفل) اصل میں پیسنے اور نرم کرنے کے معنی میں ہے اور پُرانے لباس کو بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے تو اس بناء پر فسحقًا لاصحاب السعیر کا مفہوم یہ ہے کہ دوزخی رحمتِ خُدا سے دُور رہیں، کیونکہ خدا کی نفرین تحقق خارجی سے توأم ہوتی ہے۔ تو یہ جُملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گروہ کلّی طور پر رحمتِ خُدا سے دُور ہو گا۔

ایک نکتہ

عقل وخرد کی اونچی قدروقیمت

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ قرآنِ مجید عقل و خرد کی حد سے زیادہ قدروقیمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نیز دوزخیوں کا بنیادی گناہ اور ان کی بدبختی کا اصلی عامل اس خُدائی قوّت سے کام نہ لینے کو شمار کرتا ہے۔ بلکہ جو شخص قرآن سے آشنائی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اُس نے مختلف مناسبتوں سے اس موضوع کی اہمیت کو آشکار کیا ہے اس نے ان لوگوں کی دروغ بافیوں کے برخلاف، جو مذہب کو دماغوں کے مست اور سُست کرنے کا ذریعہ اور عقل وخرد کی پروا نہ کرنے والا شمار کرتے ہیں، اسلام خُداشناسی اور سعادت و نجات کی اساس وبُنیاد عقل وخرد پر رکھتا ہے، بلکہ جگہ جگہ اس کا رُوئے سخن "اولوا الالباب" (صاحبانِ عقل) اور "اولوالابصار" (صاحبانِ بصیرت) غور و فکر کرنے والے عقلاء کی طرف ہے۔

اسلامی منابع میں اس سلسلہ میں اس قدر روایات وارد ہوئی ہیں جو حساب و شمار سے باہر ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مشہور کتاب 'کافی' جو منابع حدیث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے وہ مختلف کتابوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی کتاب کا نام کتاب 'عقل وجہل' ہے۔ جو شخص ان روایات کو ملاحظہ کرے جو اس ضمن میں اس کتاب میں نقل ہوئی ہیں، وہ اس سلسلہ میں اسلام کی نظر کی گہرائی کو پالے گا۔ ہم یہاں صرف دو روایات کے ذکر پر قناعت کریں گے۔

(اسی کتاب میں) امیرالمومنین امام علیؑ سے روایت آئی ہے کہ جبرئیل آدمؑ پر نازل ہوئے اور ان سے کہا:

"مجھے حکم ہُوا ہے کہ میں آپ کو ان تین نعمتوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار دوں، آپ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں اور باقی دو کو چھوڑ دیں"۔

آدم نے کہا: "وہ کون سی نعمتیں ہیں؟"

جبرئیل نے جواب دیا: "عقل، حیا اور دین"۔

آدم نے کہا : "میں نے عقل کا انتخاب کیا ہے"۔ جبرئیل نے حیا اور دین سے کہا : " اسے چھوڑ دو، اور اپنا کام کرو"

انھوں نے کہا : "ہم مامور ہیں کہ ہر جگہ عقل کے ساتھ رہیں اور اس سے جُدا نہ ہوں"

جبرئیل نے کہا : " اب جبکہ یہ بات ہے تو پھر اپنی ماموریت پر عمل کرو" اور اس کے بعد وہ آسمان کی طرف صعود کر گئے۔ [1]

یہ ایک ایسی لطیف ترین تعبیر ہے جو عقل وخرد اور حیاء و دین سے اس کی نسبت کے بارے میں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگر عقل، دین سے جُدا ہو جائے تو وہ ذراسی بات میں برباد ہو جائے گا یا انحراف کا شکار ہو جائے گا۔ باقی رہی حیاء کہ جو انسان کو بُرائیوں اور گناہوں کے ارتکاب سے روکتی ہے تو وہ بھی معرفت اور عقل وخرد کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ آدمؑ عقل کے ایک قابلِ ملاحظہ حصّہ کے مالک تھے جنہوں نے ان تین چیزوں کے درمیان اختیار کے موقع پر عقل کے بالاتر مرحلہ کو انتخاب کیا اور اس کے سائے میں دین کو بھی ساتھ رکھا اور حیا کو بھی۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

"من کان عاقلاً کان له دین، ومن کان له دین دخل الجنة"

"جو عقلمند ہو گا وہ دیندار بھی ہو گا، اور جو دیندار ہو گا وہ جنّت میں داخل ہو گا"

(اسی بناء پر جنّت عقلمندوں کی جگہ ہے) [2]

البتہ عقل یہاں سچّی معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ شیاطین کی وہ شیطنت جو دنیا کے جابر اور ظالم سیاستمداروں میں نظر آتی ہے کہ جو امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق :

"شبیهة بالعقل، ولیست بالعقل"

"عقل کے مشابہ ہے لیکن وہ عقل نہیں ہے"۔ [3]

---

[1]، [2]، [3] اصول کافی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۲

۱۲ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ لَهُمۡ
مَّغۡفِرَةٌ وَّ اَجۡرٌ كَبِيۡرٌ۝
۱۳ وَ اَسِرُّوۡا قَوۡلَكُمۡ اَوِ اجۡهَرُوۡا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ۝
۱۴ اَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ۝

ترجمہ

۱۲ وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پوشیدہ طور سے ڈرتے ہیں ان کیلیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔
۱۳ اپنی گفتگو کو پوشیدہ رکھو یا آشکار کرو (کچھ فرق نہیں ہے) وہ دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے۔
۱۴ کیا وہ ہستی کہ جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جب کہ وہ دقیق اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

تفسیر

کیا جہان کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے روز کفار اور ان کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، زیرِ بحث آیات میں قرآن مومنین اور ان کی عظیم جزاؤں کو بیان کر رہا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پنہاں طور پر ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم

ہے"۔ (ان الذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ واجر کبیر)۔

"غیب" کی تعبیر یہاں ممکن ہے کہ نادیدہ خدا کی معرفت یا نادیدہ معاد و قیامت یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ رہا ہو۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ شاید یہ پوشیدہ گناہوں کے بارے میں خدا کے خوف کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اگر انسان پوشیدگی میں بھی کوئی گناہ نہ کرے تو وہ بطریقِ اولیٰ آشکار گناہ نہیں کرے گا۔ یا یہ تعبیر گناہوں سے پرہیز کرنے اور اوامرِ الٰہی کے انجام دینے میں خلوصِ نیت کے مقام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ پوشیدہ طور سے کیا ہوا عمل ریا اور دکھاوے سے دور ہوتا ہے۔

ان تفاسیر کے درمیان جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

"مغفرۃ" کی تعبیر کا نکرہ کی صورت میں ہونا اور اس طرح 'اجر کبیر' اس کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ مغفرت اور اجر و پاداش اتنی عظیم ہوگی جو سب کے لیے انجانی ہوگی۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر تم اپنی گفتگو پنہاں طور پر یا آشکار کرو، خدا دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے"۔ (واسروا قولکم او اجھروا بہ انہ علیم بذات الصدور)۔

بعض مفسّرین نے ابن عباس سے اس آیت کی ایک شانِ نزول نقل کی ہے کہ کفّار یا منافقین کی ایک جماعت پیغمبر خداؐ کے پس پشت ناروا باتیں کرتی تھی۔ جبرئیل آکر پیغمبرؐ کو خبر دے دیا کرتے تھے، تب ان میں سے بعض نے ایک دوسرے سے کہا: "اسروا قولکم" "اپنی باتیں پوشیدہ طور پر کیا کرو تاکہ محمدؐ کا خدا نہ سن لے"۔ تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا: "چاہے آشکارا باتیں کرو یا پوشیدہ طور پر، خدا اُن سے آگاہ ہے۔[1]

بعد والی آیت اس چیز کے لیے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے ایک دلیل کے طور پر آئی ہے۔ فرماتا ہے: "کیا وہ ذات جس نے موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جبکہ وہ دقیق ترین اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے"۔ (الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر)۔

"الا یعلم من خلق" کے جملہ کی تفسیر میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں:

بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کیا وہ خدا جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے، وہ ان کے اندر کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے بندوں کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ان بندوں کے اسرار سے بے خبر ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے تمام عالمِ ہستی کو پیدا کیا ہے وہ تمام جہان کے اسرار سے آگاہ ہے تو کیا وہ

---

[1] "فخر رازی" جلد ۳ ص ۶۶، روح البیان جلد ۱۰ ص ۸۶ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

انسان جو اس عظیم خلقت میں سے ایک موجود ہے، اس کے اسرار خدا سے پوشیدہ ہوں گے؟

بہرحال اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ خدا کی خلقت دائمی ہے۔ یعنی اس کی طرف سے فیضِ وجود ہر لحظہ مخلوقات کو پہنچ رہا ہے۔ معاملہ اِس طرح نہیں ہے کہ وہ انھیں پیدا کرکے ان کی حالت پر چھوڑ دے۔

اصولی طور پر تمام ممکنات (موجودات) اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا رشتہ اس کی ذات پاک سے منقطع ہو جائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کرلیں۔ اِس دائمی تعلق اور خلقت کی طرف مسلسل توجہ، ہر زمانہ اور ہر مکان میں تمام موجودات کے اسرار کے بارے میں علمِ خدا کی ایک بہترین دلیل ہے۔

'لطیف' کے ساتھ خدا کی توصیف اِس لحاظ سے ہے کہ لطیف 'لطف' کے مادہ سے ہے۔ وہ ہر دقیق و ظریف موضوع اور ہر قسم کی سریع حرکت اور جسم لطیف کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر خدا کا لطیف ہونا خلقت کے دقیق و ظریف اسرار کے بارے میں اس کے علم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ لفظ بعض اوقات اجسام لطیف، خورد بینی ذرات اور ان سے مافوق کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمھاری دلی نیتیں چاہے جتنی پوشیدہ ہوں اور تم اپنی باتوں کو محفلوں میں چاہے جتنا مخفی طور پر کہو یا غلط اعمال خلوت گاہوں میں انجام دو، خداوند لطیف وخبیر ان سب سے آگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے 'لطیف' کی تفسیر میں کہا ہے: (هو الذى يكلف اليسير ويعطى الكثير) "وہ الیسی ہستی ہے جو ذمہ داری تو آسان ڈالتی ہے مگر اجر و پاداش فراواں دیتی ہے۔"

حقیقت میں یہ بھی رحمت میں ایک قسم کی ظرافت و دقت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لطیف کے ساتھ خدا کی توصیف اس بناء پر ہے کہ وہ تمام چیزوں کے اندر نفوذ رکھتا ہے اور سارے جہان میں کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔

لیکن یہ سب باتیں ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں اور خدا کے علم کی گہرائی اور پوشیدہ و آشکار اسرار پر اس کے علم پر ایک تاکید ہے۔

❖ ❖ ❖

(۱۵) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ
مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝

(۱۶) ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ
الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝

(۱۷) اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ
حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ۝

(۱۸) وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ
نَكِیْرِ ۝

ترجمہ

(۱۵) وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا۔ اس کے دوش پر چلو پھرو اور خدا کی روزیوں میں سے کھاؤ اور تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(۱۶) جو آسمان پر حاکم ہے کیا تم اس کے عذاب سے خود کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے اور تمھیں نگل لے اور مسلسل لرزتی اور کانپتی رہے۔

(۱۷) یاتم خداوندِ آسمان کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ وہ ایسی آندھی تم پر بھیج دے جو سنگریزوں سے بھری ہوئی ہو اور تم جلدی ہی جان لوگے کہ میری دھمکیاں کیسی ہیں

(۱۸) وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انھوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی تھی، لیکن (دیکھو) میرا عذاب کیسا تھا؟

تفسیر

کوئی مجرم اس کے عذاب وسزا سے امان میں نہیں ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوزخیوں، جنّتیوں، کافروں اور مومنوں کے بارے میں گزرے ہیں، زیر بحث آیات میں جنّتیوں کی صفوں میں جا ملنے کی ترغیب و تشویق اور دوزخیوں کی راہ و رسم سے بچنے کے لیے چند خدائی نعمتوں کا ذکر اور پھر اس کے عذابوں کے ایک حصّہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا ہے" (ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً)۔

"پس تم زمین کے دوش پر چلو پھرو، اور پروردگار کی روزیوں میں سے کھاؤ اور جان لو کہ سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور)۔

"ذلول" رام ہونے کے معنی میں ایک جامع ترین تعبیر ہے جو زمین کے بارے میں ممکن ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ تیز رو سواری بہت ہی تیز اور متعدد حرکات رکھنے کے باوجود ایسی پُرسکون نظر آتی ہے گویا کہ مُطلقاً ساکن ہے۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ زمین چودہ قسم کی مختلف حرکتیں رکھتی ہے۔ جن میں سے تین اقسام یعنی اس کی اپنے محور پر حرکت، سورج کے گرد حرکت اور منظومہ شمسی کے ہمراہ کہکشاں کے اندر حرکت ہے۔ یہ حرکات جو بہت ہی زیادہ تیز ہیں ایسی نرم اور ملائم ہیں کہ جب تک زمین کی حرکت پر قطعی دلائل قائم نہیں ہوئے تھے، کوئی شخص باور ہی نہیں کرتا تھا کہ اس میں کوئی حرکت ہے۔

دوسری طرف زمین نہ تو اس طرح کی سخت ہے کہ قابلِ زندگی ہی نہ ہو اور نہ ہی اس طرح کی ڈھیلی اور اور نرم ہے کہ قرار و آرام نہ پکڑتی ہو۔ بلکہ یہ مکمل طور پر انسانی زندگی کے لیے رام ہے۔ مثلاً اگر زمین زیادہ کیچڑ والی ہوتی جس میں ہر چیز دھنس جاتی، یا نرم ریت ہوتی کہ جس میں انسان کے پاؤں گھٹنوں تک دھنس جاتے

یا تیز اور سخت پتھر ہوتے جو تھوڑا سا چلنے سے انسانی بدن کو زخمی کر دیتے تو اس سے زمین کی بے آرامی کے معنی واضح ہو جاتے۔

تیسری طرف اس کا فاصلہ سورج سے نہ تو اتنا کم ہے کہ تمام چیزیں گرمی کی شدت سے جل جائیں اور نہ ہی اتنا زیادہ ہے کہ ہر چیز سردی سے خشک ہو جائے۔ زمین پر ہوا کا دباؤ اس طرح سے ہے جو انسان کو سکون و آرام مہیا کرتا ہے، وہ نہ تو اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کا گلا گھونٹ دے اور نہ اس قدر کم ہے کہ وہ پارہ پارہ ہو جائے۔ زمین کی قوّت جاذبہ نہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہڈیوں کو توڑ دے اور نہ ہی اس قدر کم ہے کہ ایک ہی حرکت سے انسان اپنی جگہ سے اکھڑ جائے اور فضا میں جا پڑے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے 'ذلول' اور انسان کے حکم کے آگے مسخّر اور رام ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زمین کے ذلول اور مطیع ہونے کی توصیف کے بعد حکم دیتا ہے کہ اس کے کندھوں پر چلو۔ ہم جانتے ہیں کہ 'مناکب' جمع 'منکب' (بر وزن مغرب) کندھے کے معنی میں ہے، گویا انسان زمین کے کندھے پر قدم رکھتا ہے اور زمین ایسی پُرسکون ہے کہ وہ اپنے اعتدال کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک تم قدم نہ اٹھاؤ گے اور سعی و کوشش نہ کرو گے، زمین کی روزیوں سے بہرہ مند نہ ہو پاؤ گے۔

'رزق' کی تعبیر بھی ایک بہت ہی جامع تعبیر ہے جو زمین کے تمام مواد غذائی کو، چاہے وہ حیوانی ہو یا نباتی یا معدنی، سب کو شامل ہے۔

لیکن جان لو کہ یہ تمھاری خلقت کا مقصد اصلی نہیں ہے۔ یہ سب کے سب تو تمھارے "نشور" قیامت اور حیاتِ ابدی کی راہ کے لیے وسائل و ذرائع ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اس تشویق اور بشارت کے بعد تہدید و انذار کی بات کرتا ہے۔ مزید کہتا ہے: "جو آسمان پر حاکم ہے، کیا تم اس کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے، وہ تمھیں اپنے اندر نگل لے اور ہمیشہ لرزتی اور کانپتی رہے۔" (ءامنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا ھی تمور)۔

ہاں! اگر وہ حکم دے تو یہ مطیع و ساکن زمین سرکش ہو جائے اور وحشی جانور کی صورت اختیار کر لے، زلزلے آنے شروع ہو جائیں، زمین میں شگاف پڑ جائیں اور وہ تمھیں، تمھارے گھروں اور شہروں کو نگل جائے اور پھر بھی لرزتی اور کانپتی رہے۔

"فاذا ھی تمور" وہ ہمیشہ لرزتی رہے اور بے سکون رہے) کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا یہ حکم دے سکتا ہے کہ زمین تمھیں نگل جائے اور تمھیں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے اندر

ہی اندر منتقل کرتی رہے۔ یہاں تک کہ تمھاری قبر بھی ساکن اور بغیر حرکت کے نہ ہو۔

یا یہ ہے کہ زمین اپنے سکون و آرام کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے اور اس میں ہمیشہ زلزلے آتے رہیں اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے آسان ہے جنھوں نے بعض زلزلہ خیز علاقوں میں زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات زمین کئی کئی دن اور راتیں بالکل بے سکون و بے آرام رہتی ہے۔ تب ان سب کا کھانا پینا، سونا اور آرام کرنا ختم ہوجاتا ہے لیکن ہم لوگوں کے لیے جنھوں نے عادتاً زمین کے آرام و سکون ہی کو دیکھا ہے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔

"مَن فی السماء (وہ جو آسمان میں ہے) کی تعبیر خدا کی ذاتِ پاک کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی حاکمیت زمین تو کیا آسمانوں پر بھی مُسلّم ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ خدا کے فرشتوں کی طرف اشارہ ہے جو آسمانوں میں ہیں اور اس کے فرمان کے اجراء پر مامور ہیں۔

٭ ٭ ٭

اِس کے بعد مزید کہتا ہے: "ضروری نہیں ہے کہ حتمی طور پر زلزلے ہی تمھاری طرف آئیں، بلکہ وہ یہ فرمان تند آندھیوں کو دے سکتا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ آسمانوں کا حاکم خدا ایسی تیز آندھی جو سنگریزوں سے پُر ہو تم پر بھیج دے اور تمھیں اس پہاڑ کے نیچے دفن کر دے؟" (ام امنتم من فی السماء ان یرسل علیکم حاصبًا)۔

"اور تم جلدی ہی جان لو گے کہ میری تہدیدیں (اور دھمکیاں) کیسی ہیں"۔ (فستعلمون کیف نذیر)

اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے بہت آسان ہے جنھوں نے چلتی ہُوئی ریت اور حاصب ہوائیں دیکھی ہیں۔ (یہ ہوائیں ریت کے جو تودے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں) وہ جانتے ہیں کہ چند ہی لمحوں کے اندر گھر اور آبادیاں رواں دواں ریت کے تودوں کے نیچے دفن ہو سکتی ہیں یا وہ قافلے جو بیابان کے وسط میں چل رہے ہوتے ہیں اس کے نیچے دفن ہو سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

حقیقت میں اوپر والی آیات اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ عذاب قیامت کے عذاب میں منحصر نہیں ہے۔ اس دنیا میں خدا زمین کی مختصر سی حرکت یا آندھیوں کے چلنے سے ان کی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ اس امکان کی بہترین دلیل گزشتہ امتوں میں ان امور کا واقع ہونا ہے۔

لہٰذا آخری زیر بحث آیت میں کہتا ہے:

"وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہوں نے خدا کی آیات اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی لیکن دیکھو میری دی ہُوئی سزا اور عذاب ان کے حق میں کیسا تھا؟" (ولقد کذب الذین من قبلھم فکیف کان نکیر)۔ [1]

(حاشیہ ۱ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ایک گروہ کو تباہ کر نے والے زلزلوں سے، کچھ قوموں کو بجلیوں سے اور ایک جماعت کو طوفان یا تیز آندھیوں کے ذریعہ سزا دی، اور ان کے تباہ شدہ خاموش شہروں کو ہم نے درس عبرت کے طور باقی رہنے دیا ؛

؛ ؛ ؛

(حاشیہ سابقہ صفحہ) لہ نکیر انکار کے معنی میں ہے اور یہاں عذاب و سزا سے کنایہ ہے کیونکہ خُدا کا انکار ان قوموں کے افعال کے مقابلہ میں ان کی سزا کے طریقہ سے صورت پذیر ہُوا، اس بات پر توجہ رہے کہ یہ لفظ منکیری تھا۔ جیساکہ گزشتہ آیت میں لفظ نذیر نذیری تھا (میرا انکار اور میرا ڈرانا) "یاء" متکلم حذف ہوگئی اور زیر جو اس پر دلالت کرتی ہے باقی رہ گئی۔

(۱۹) اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقۡبِضۡ
مَا یُمۡسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیۡ
بَصِیۡرٌ ۝
(۲۰) اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّکُمۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّ
دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡکٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ ۝
(۲۱) اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُکُمۡ اِنۡ اَمۡسَکَ رِزۡقَهٗ
بَلۡ لَّجُّوۡا فِیۡ عُتُوٍّ وَّ نُفُوۡرٍ ۝

ترجمہ

(۱۹) کیا انھوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا، جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پرو
کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟ خدائے رحمٰن کے سوا کو
انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

(۲۰) کیا وہ جو تمہارا لشکر ہے وہ خدا کے مقابلہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ لیکن کافر تو صر
دھوکہ میں ہیں۔

(۲۱) کیا وہ جو تمھیں روزی دیتا ہے اگر وہ اپنی روزی روک لے (تو تمھاری ضروریات کو کون
کر سکتا ہے) لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں

تفسیر

اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں جب خدا کی قدرت اور مالکیت کے بارے میں بحث تھی تو سات آسمانوں، ان کے ستاروں اور کواکب کے بارے میں گفتگو تھی۔ لیکن یہاں پہلی زیر بحث آیت میں اسی مسئلۂ قدرت کو عالم ہستی کے بظاہر ایک چھوٹے سے موجود کے ذکر کے ذریعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ فرماتا ہے:

"کیا انہوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟" (اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات و یقبضن)۔ [1]

یہ سنگین جسم قانون جاذبہ کے برخلاف زمین سے اُٹھتے ہیں اور آرام کے ساتھ آسمان کی بلندی پر گھنٹوں تک اور بعض اوقات ہفتوں اور مہینوں تک مسلسل اپنی سرلع اور نرم حرکت کو جاری رکھتے ہیں، اور انھیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

پرواز کرتے وقت اکثر پرندے اپنے پروں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ "صافات" گویا ایک پُراسرار قوت انھیں چلا رہی ہوتی ہے۔

جبکہ بعض ہمیشہ پر مارتے رہتے ہیں۔ (ممکن ہے یقبضن اسی معنی کی طرف اشارہ ہو)

بعض دوسرے کبھی پر مارتے ہیں اور کبھی پروں کو پھیلا لیتے ہیں۔

چوتھا گروہ ایک مدت تک پر مارتا ہے اور جب تیزی پکڑ لیتا ہے تو اپنے پروں کو کلی طور پر سمیٹ لیتا ہے اور فضا کے سمندر میں غوطہ لگا لیتا ہے (مثلاً چڑیا) خلاصہ یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ سب پرواز کرتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔

ان کے جسم کو کس نے اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ وہ آرام و سکون کے ساتھ فضا میں سیر کرتے ہیں؟ ان کے پروں کو یہ قدرت کس نے عطا کی اور انھیں پرواز کا علم سکھایا ہے؟ خصوصاً مُہاجر پرندوں کی پیچیدہ قسم کی اجتماعی پرواز جو بعض اوقات کئی کئی ماہ تک طول کھینچتی ہے اور ہزاروں کلومیٹر کا راستہ طے کر کے بہت سے ملکوں، پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور سمندروں کے اُوپر سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ واقعتاً ایسی قوت

---

[1] "الطیر" طائر کی جمع ہے۔ اسی لیے اس کا فعل اور صفت جمع کی صورت میں آیا ہے۔ بعض نے جو یہ تصور کیا ہے کہ طیر مفرد ہے تو یہ ارباب لغت کی تصریح کے خلاف ہے۔

اور آگاہی انھیں کس نے عطا کی ہے؟
اور آگاہی انھیں کس نے عطا کی ہے؟ خدائے رحمٰن کے سوا کوئی انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہُوئے
لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدائے رحمٰن کے سوا کوئی انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہُوئے
نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ہر مخلوق کی نیاز اور حاجت کو جانتا ہے۔" (مایمسکھن الا
الرحمٰن انہ بکل شیء بصیر)۔
وہی تو ہے کہ جس نے انھیں پرواز کے لیے مختلف وسائل اور استعدادیں عطا کی ہیں۔ ہاں! خدائے رحمٰن
جس کی رحمتِ عامّہ نے تمام موجودات کو گھیرا ہُوا ہے، اسی نے پرندوں کو بھی ان کی ضرورت کی چیزیں بخشی ہیں۔
ہستی آسمان اور فضا میں پرندوں کو روکے ہُوئے ہے، وہی زمین اور دوسری موجودات کی بھی نگہدار ہے۔ جب
ارادہ کرلے تو نہ پرندہ پرواز کر سکتا ہے اور نہ ہی زمین اپنے سکون کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔
"صافات" و "یقبضن" (پروں کو پھیلاتے اور سمیٹتے ہیں) کی تعبیر، ممکن ہے مختلف پرندوں کی طرف
ایک ہی پرندہ کے مختلف حالات کی طرف اشارہ ہو۔[1]
ہم نے پرندوں کی دنیا اور ان کی پرواز کے عجائبات کے بارے میں تفسیرِ نمونہ جلد ۶ (سورۂ نحل کی آیت
کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔
بعد والی آیت میں اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کفار خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کسی قسم کا کوئی
مددگار نہیں رکھتے، فرماتا ہے: "کیا وہ جو تمھارا لشکر ہے، وہ خدا کے مقابلہ میں تمھاری مدد کر سکتا ہے؟" (ام
ھٰذا الذی ھو جند لکم ینصرکم من دون الرحمٰن)۔[2]
نہ صرف یہ کہ وہ مصیبتوں میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ اگر وہ چاہے تو انھیں کو تمھارے عذاب
نابودی پر مقرر کر دے۔ کیا پانی، ہوا، مٹی اور آگ تمھارے خدمت گزار اور تمھاری زندگی کے ارکان نہیں ہیں
لیکن خدا نے انھیں کو سرکش اقوام کی نابودی پر مامور کر دیا۔ نیز تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات محفوظ ہیں کہ باد
فراعنہ اور سرکش حکمرانوں کے نزدیک ترین افراد ہی ان کی موت کا سبب بن گئے۔ موجودہ زمانہ کی تاریخ میں
ماجرا دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومتوں کی وفادار ترین طاقتوں نے ہی ان کے خلاف بغاوت کر دی، اور ان
موت کا فرمان جاری کیا۔

---

[1] اس بارے میں کہ "صافات" وصفی صورت میں اور یقبضن فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ اس وجہ
کہ پروں کا پھیلانا ایک خاص انداز ہے جبکہ کھولنا اور بند کرنا پروں کی تکرار ہے۔

[2] "ام" اس جملہ میں حرفِ عطف ہے۔ "من" مبتدا، "ھٰذا" دوسرا مبتدا اور "الذی" اس کی خبر ہے۔ "ھو جند لکم"
صلہ ہے اور "ینصرکم" "جند" کی صفت اور جملہ کے پہلے مبتدا کی خبر ہے (البیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۵۹) لیکن
یہ ہے کہ الذی عطف بیان ہو اور "ینصرکم" خبر ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر جملہ ناقص ہے۔ (غور کیجیے)

لیکن کافر صرف دھوکہ، فریب اور غفلت میں گرفتار ہیں۔" (ان الکافرون الا فی غرور)۔
دھوکہ، فریب اور جہالت کے پردے ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں
کہ تاریخ کے صفحات پر یا اپنی زندگی کے گوشہ و کنار میں یہ درس عبرت دیکھیں۔

'جند' اصل میں ناہموار اور ایسی سخت زمین کے معنی میں ہے جس میں بہت زیادہ پتھر جمع ہو گئے
ہیں۔ اسی مناسبت سے بہت زیادہ لشکر کو بھی 'جند' کہتے ہیں۔

بعض مفسرین زیرِ بحث آیت میں جند کو بتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ وہ قیامت میں مشرکین کی مدد ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور وہ بُت بھی اس کا ایک مصداق ہو سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

پھر مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: "کیا وہ ہستی جو تمھیں روزی دیتی ہے، اگر وہ اپنی روزی تم سے روک لے تو تمھیں کون بے نیاز کر سکتا ہے؟" (امن ھذا الذی یرزقکم ان امسک رزقہ)۔[1]

اگر وہ آسمان کو حکم دے دے کہ وہ بارش نہ برسائے اور زمین سبزہ نہ اُگائے یا مختلف قسم کی نباتی آفات پھلوں کو نابود کر دیں تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمھارے لیے کوئی غذا مہیا کر دے؟ نیز اگر وہ معنوی روزیاں اور آسمانی وحی تم سے منقطع کر لے تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری راہنمائی کرے۔؟

یہ واضح حقائق ہیں، لیکن ہٹ دھرمی اور گستاخی انسان کے ادراک اور شعور کے آگے ایک حجاب بن جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے:
"لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔" (بل لجوا فی عتو ونفور)۔

اِس موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ انسان کی زندگی کے مختلف جہات ہیں، خصوصاً غذائی مصنوعات میں بہت ہی ترقی ہو چکی ہے، اگر صرف ایک ہی سال کے لیے مطلقاً بارش نہ ہو تو ساری دُنیا میں کیسی مصیبت کھڑی ہو جائے گی، یا ٹڈی دَل کا لشکر اور آفاتِ نباتی ہر جگہ کو گھیر لیں تو کیسی مصیبت واقع ہو جائے گی۔

٭ ٭ ٭

---

[1] آیت میں جزاء کی شرط محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "ان امسک رزقہ من یرزقکم غیرہ" (اگر وہ ... روک لے تو اس کے علاوہ کون تمھیں رزق دے گا۔)

ایک نکتہ

انسانوں کی ناکامی کے چار عوامل

گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ سننے والا کان اور بیدار عقل کا نہ ہونا، وہ اہم ترین عامل ہے جو دوزخیوں کو دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ زیرِ بحث آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ دوسرے چار عوامل یعنی "دھوکہ و فریب"، "ہٹ دھرمی"، "سرکشی" (عتو) اور "حق سے دوری اختیار کرنا" (نفور) انسان کی بدبختی اور گمراہی کا سبب ہیں۔

اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ یہ عوامل گذشتہ عوامل کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ یہ بُری صفات انسان کے کان اور آنکھ پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس کے لیے حقائق کے ادراک سے مانع ہو جاتی ہیں۔

❊ ❊ ❊

(۲۲) اَفَمَنْ يَّمْشِىْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِىْ
سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○
(۲۳) قُلْ هُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○
(۲۴) قُلْ هُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ○
(۲۵) وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○
(۲۶) قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۠ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ○
(۲۷) فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ○

ترجمہ

(۲۲) کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہو ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ
شخص جو راست قامت صراط مستقیم پر گامزن ہے؟

(۲۳) کہہ دیجئے وہی تو ہے کہ جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے، لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

(۲۴) کہہ دیجئے کہ وہی تو ہے کہ جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا، اور اسی کی طرف تم لوٹ جاؤ گے۔

(۲۵) وہ کہتے یہ ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا۔

(۲۶) کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور میں تو صرف واضح و آشکار ڈرانے والا ہوں۔

(۲۷) جس وقت اس وعدۂ الٰہی کو قریب سے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے اور انھیں کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔

تفسیر

شاہراہِ توحید کے راست قامت افراد

گذشتہ آیات کے بعد پہلی زیرِ بحث آیت میں کفار و مومنین کے ان دونوں گروہوں کی حالت کی کیفیت ایک عمدہ مثال کے ضمن میں منعکس کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہے، ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراطِ مستقیم پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے" (افمن یمشی مکبًّا علٰی وجھہ اھدٰی امّن یمشی سویًّا علٰی صراط مستقیم)۔

یہاں بے ایمان، ظالم، ہٹ دھرم اور فریبی لوگوں کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ناہموار اور پیچ و خم سے پُر راہ سے گزر رہا ہو، وہ مُنہ کے بل گرا ہوا ہو، اور ہاتھ پاؤں سے یا سینہ کے بل چل رہا ہو، نہ ٹھیک طرح سے راستہ دیکھ سکتا ہو اور نہ ہی اپنے اُوپر نظر کر سکتا ہو، نہ رکاوٹوں سے باخبر ہو اور نہ ہی سُرعت اور تیزی سے چل سکتا ہو، تھوڑا سا رستہ چلتا ہو اور پھر تھک جاتا ہو۔

لیکن مومنین کو ایسے راست قامت افراد سے تشبیہ دیتا ہے جو ہموار، صاف اور سیدھے راستے پر سُرعت، قدرت اور پوری آگاہی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہوں۔

کتنی عمدہ اور دقیق تشبیہ ہے، جس کے آثار ان دونوں گروہوں میں مکمّل طور پر نمایاں ہیں اور ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

بعض نے ان دو گروہوں کا مظہر پیغمبر اسلامؐ اور ابوجہل کو شمار کیا ہے۔ یقیناً یہ دونوں اوپر والی آیت کے روشن اور واضح مصداق ہیں، لیکن آیت کے مفہوم کی عمومیّت کو محدُود نہیں کرتے۔

"مُکبّاً علٰی وجھہ" میں کئی ایک احتمال دیئے گئے ہیں:

جو تفسیر اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے وہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، یعنی وہ ایسا شخص ہے جو منہ کے بل گرا ہوا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے سینہ کے بل چل رہا ہو۔

لیکن بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سیدھا چل رہا ہے لیکن سر نیچے کیے ہُوئے ہے اور اپنے راستے کو کبھی طرح سے نہیں دیکھتا۔

جبکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد ایسا شخص ہے جو اپنے اعتدال کو محفُوظ نہیں رکھتا، چند قدم چلتا ہے اور زمین پر گر پڑتا ہے، پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور مسلسل اسی کیفیّت کی تکرار کرتا رہتا ہے۔

راغب کے مفردات میں بعض کلمات سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے، اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کی پوری توجہ اپنی ہی وضع و کیفیّت کی طرف ہے اور وہ اپنے غیر سے غافل ہے لیکن پہلا معنی مومنین کی وضع کے مقابلہ کے قرینہ سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اس کی "سویا" سے تعبیر ہُوئی ہے۔

بہرحال کیا کافر و مومن کی یہ وضع و کیفیت آخرت میں ہو گی؟ یا دونوں جہانوں میں؟ آیت کے معنی کے محدُود ہونے پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ دنیاوی زندگی میں بھی اسی طرح ہوں گے اور آخرت میں بھی۔

ہاں! بے ایمان افراد چونکہ خودخواہ، خودپرست اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور اپنے مادی اور جلد گزر جانے والے منافع کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے۔ چونکہ ان کی راہ ایک ہوا پرست کی راہ ہے۔ لہٰذا وہ اس شخص کی مانند ہیں جو سنگلاخ زمین سے گزرتے ہیں اور سینہ کے بَل ہاتھ پاؤں مارتے ہُوئے رینگتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو ایمان کے سائے میں ہوائے نفس کی قید سے چھُوٹ چکے ہیں وہ ایک گہری بصیرت اور صاف و واضح راستہ رکھتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے مزید کہتا ہے: "کہہ دیجئے، وُہی تو ہے کہ جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، اور تمھارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے ہیں لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو" (قل هو

الذی انشأکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدة قلیلًا ما تشکرون)۔

خدا نے مشاہدے اور تجربے کا ذریعہ اور وسیلہ (آنکھ) بھی تمھارے اختیار میں قرار دی۔ دوسروں کے افکار سے آگاہی کا ذریعہ (کان) اور علوم عقلیہ میں غور و فکر کرنے کا ذریعہ (قلب) بھی دیا۔ خلاصہ یہ کہ سب قسم کے عقلی و نقلی علوم سے آگاہی کے لیے تمام ضروری آلات تمھارے اختیار میں دے دیئے ہیں۔ لیکن ان تمام عظیم نعمتوں کا بہت کم لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ شکرِ نعمت یہ ہے کہ ہر نعمت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کیا واقعاً سب لوگ کان، آنکھ اور عقل سے اسی طریقہ سے استفادہ کرتے ہیں۔؟

٭ ٭ ٭

پھر دوبارہ پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے وہی تو ہے جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے اور اسی کے پاس تم جمع ہو گے۔" (قل ھو الذی ذرأکم فی الارض و الیہ تحشرون)۔

حقیقت میں پہلی آیت راستے کو مشخص کرتی ہے اور دوسری آیت کام کے آلات و وسائل کو اور یہ آیۃ ہدف و مقصد کو کہ اسلام و ایمان کے سیدھے راستہ اور صراطِ مستقیم میں قدم آگے بڑھاؤ، معرفت اور شناخت کے تمام آلات سے فائدہ اٹھاؤ اور جاودانی زندگی کی طرف چل پڑو۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں انشأکم کی تعبیر ہوئی ہے اور اس آیت میں "ذرأکم" آیا، ممکن ہے ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بات میں ہو کہ پہلا جملہ تو انسان کو عدم سے وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہو (یعنی تم نہیں تھے اور خدا نے تمھیں پیدا کیا ہے) نیز دوسرا جملہ مادۂ خاکی سے انسان کی پیدائش کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی ہم نے تمھیں خاک سے پیدا کیا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اسی رابطہ میں منکرینِ معاد کی گفتگو اور ان کا مطالبہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ استہزاء کے طور پر کہتے ہیں: اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کس وقت پورا ہو گا" (ویقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

تم اس کی کوئی یقینی تاریخ معیّن کیوں نہیں کرتے؟ اور اس لحاظ سے تم سب کی ذمّہ داری واضح کیوں نہیں کرتے۔؟

ھٰذا الوعد سے کیا مراد ہے۔ اِس کے دو احتمال بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا قیامت کا وعدہ، دُوسرا دنیا کی گوناگوں سزاؤں کا وعدہ، مثلاً زلزلے، صاعقے، بجلیاں اور طوفان لیکن گزشتہ آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ دونوں معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بعد والی آیت میں انھیں اس طرح جواب دیتا ہے : "کہہ دیجئے اس موضوع کا علم و آگہی تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور میں تو صرف واضح و آشکار انذار کرنے والا اور ڈرانے والا ہوں" (قل انما العلم عند الله و انما انا نذیر مبین)۔

یہ تعبیر ٹھیک اسی چیز کے مشابہ ہے جو قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ منجملہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۷ میں آیا ہے : "قل انما علمها عند ربی"۔ کہہ دیجئے کہ قیامت کے وقوع کے زمانہ کا علم صرف میرے پروردگار کے پاس ہے۔

❖ ❖ ❖

اور ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معلوم ہوتی اور اس کا عرصہ اور فاصلہ زیادہ ہوتا تو لوگ غفلت میں پڑ جاتے اگر وہ عرصہ کم ہوتا تو اضطرار جیسی حالت پیدا کر لیتے اور دونوں حالتوں میں تربیتی اہداف نامکمل رہ جاتے۔

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے : "جس وقت اس وعدۂ الٰہی اور عذاب کو قریب سے مشاہدہ کریں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے" جیسا کہ غم و اندوہ کے آثار اُن سے برس رہے ہیں۔ (فلما رأوه زلفة سيئت وجوه الذين كفروا)۔

اور ان سے کہا جائے گا : "یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔" (و قيل هٰذا الذی كنتم به تدعون)۔

"تدعون" دُعا کے مادہ سے ہے۔ یعنی تم ہمیشہ اصرار اور تقاضا کیا کرتے تھے کہ قیامت واقع ہو، اب وہ واقع ہو گئی ہے۔ اور اس سے راہِ فرار ممکن نہیں ہے۔[1]

یہ مضمون حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ذاریات کی آیت ۱۴ میں کفّار کو مخاطب کرتے ہوئے آیا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا :

"هٰذا الذی کنتم به تستعجلون"۔ "یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔"

بہرحال یہ عذابِ قیامت کے بارے میں ہی بیان کر رہی ہے جیسا کہ اکثر مفسّرین نے کہا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ متی هٰذا الوعد کا جملہ بھی قیامت کے وعدہ کی طرف اشارہ ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تدعون "باب افتعال" سے اور 'دعاء' کے مادہ سے تقاضا کرنے کے معنی میں ہے یا دعوا کے مادہ سے تقاضا یا کسی چیز سے انکار کرنے کے معنی میں ہے۔

حاکم ابوالقاسم حسکانی کہتا ہے :

"جب کافروں نے خدا کے ہاں امام علیؑ کے مقامات کو مشاہدہ کیا
تو ان کے چہرے (غیظ وغضب کی شدت سے) سیاہ ہو گئے۔[1]

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے بھی یہی مطلب نقل ہوا ہے کہ یہ آیت امیرالمومنین علیؑ اور آپ کے یار و انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[2]

البتہ یہ تفسیر جو شیعہ اور اہل سنّت کے طرق سے نقل ہوئی ہے ایک قسم کی تطبیق کے قبیل سے ہے، ورنہ آیت کا محلِ وقوع معاد و قیامت کے ساتھ مربوط ہے اور اس قسم کی تطبیقیں روایات میں کچھ کم نہیں۔

٭ ٭ ٭

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۰

[2] نورالثقلین جلد ۵ ص ۳۸۵

(۲۸) قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ
اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝
(۲۹) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝
(۳۰) قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ
یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ۝

ترجمہ

(۲۸) کہہ دیجئے: اگر خدا مجھے اور ان تمام لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کر دے تو بھی کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟

(۲۹) کہہ دیجئے: وہ خدا رحمٰن ہے، ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکّل کیا ہے، اور عنقریب تم جان لوگے کہ کون شخص واضح گمراہی میں ہے۔

(۳۰) کہہ دیجئے: مجھے بتاؤ اگر تمھاری (سرزمین کے) پانی زمین کے اندر چلے جائیں تو کون تمھارے لیے جاری پانی لا سکتا ہے؟

تفسیر

جاری پانی تمہارے اختیار میں کون دیتا ہے؟

اوپر والی آیات جو سورۂ ملک کی آخری آیات ہیں اور وہ سب لفظ 'قل' سے، جو پیغمبر(ص) کو خطاب ہے شروع ہوتی ہیں، انھیں باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں کفّار کے ساتھ ہوئی ہیں اور ان کے دوسرے پہلو ان آیات میں بیان ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں کہ جو غالباً پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب کی موت کے انتظار میں تھے وہ یہ گمان کرتے تھے کہ آپ کی وفات سے آپ کا دین ختم ہو جائے گا اور باقی کچھ نہ رہے گا۔ (عام طور پر شکست خوردہ دشمن سچے رہبروں کے بارے میں ہمیشہ یہی توقع رکھتے ہیں) فرماتا ہے: "کہہ دیجیے اگر خدا مجھے اور ان تمام کو جو میرے ساتھ ہیں ختم کر دے یا ہم پر رحم کرے تو بھی کفّار کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟" (قل ارأیتم ان اھلکنی اللہ ومن معی او رحمنا فمن یجیر الکافرین من عذاب الیم)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ کفارِ مکہ پیغمبرؐ اسلام اور مسلمانوں کے لیے بد دعا (نفرین) کیا کرتے اور ان کی موت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، ان کا گمان یہ تھا کہ اگر آنحضرتؐ دنیا سے چلے جائیں تو آپ کی دعوت بھی ختم ہو جائے گی، تب اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا۔

اسی معنی کے مشابہ سورۂ طور کی آیت ۳۰ میں بھی آیا ہے، جہاں کہتا ہے: ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون "وہ کہتے ہیں کہ محمد(ص) ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں"۔

وہ اس بات سے غافل ہیں کہ محمد مصطفیٰؐ سے الطاف حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر وہ مر بھی جائیں تو اس سے حق کا پیغام نہیں مرے گا۔ ہاں! اس دین کی کامیابی اور تمام جہان پر اس کے غلبہ کا انھیں وعدہ دیا گیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کی حیات اور موت کسی چیز کو نہیں بدلے گی۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے کہ خدا پیغمبرؐ سے یہ فرما رہا ہے: "کہہ دیجئے، ہم خدا پر ایمان رکھنے کی بناء پر خوف و رجاء کے درمیان ہیں، تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو۔؟

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

✽ ✽ ✽

اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خداوند رحمٰن ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے، اور عنقریب تم جان لو گے کہ واضح گمراہی میں کون ہے۔" (قل ھو

الرحمٰن اٰمنا بہ و علیہ توکلنا فستعلمون من ھو فی ضلال مبین)۔

یعنی اگر ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور اسے اپنا ولی، وکیل اور سرپرست سمجھا ہے تو اس کی دلیل واضح ہے، وہ خدائے رحمٰن ہے۔ اس کی رحمتِ عمومی ہر جگہ پہنچی ہوئی ہے اور اس کے انعام کے فیض نے دوست اور دشمن سب کو گھیر رکھا ہے کہ عالمِ ہستی اور صفحۂ زندگی پر مختصر سی نگاہ اس مدّعا کی شاہد ہے۔ لیکن تمھارے معبودوں نے کون سا کام کیا ہے؟ اگرچہ تمھاری ضلالت و گمراہی اسی سے واضح ہے لیکن آخرت میں اور زیادہ واضح ہو جائے گی، یا اس دنیا میں جب اسلام خدائی امدادوں سے لشکرِ کفر پر کامیاب ہو جائے گا تو اس معجزانہ کامیابی سے حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

یہ آیت حقیقت میں پیغمبر اسلام اور مومنین کے لیے ایک قسم کی تسلّی ہے کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ حق و باطل کے اس مبارزہ میں تنہا ہیں، بلکہ بخشنے والا اور مہربان خدا ان کا یار و مددگار ہے۔

* * *

آخری آیت میں خدا کی رحمتِ عامہ کے ایک مصداق کے ذکر کے عنوان سے کہ جس سے لوگ غافل ہیں، کہتا ہے: "کہہ دیجیے: مجھے بتاؤ وہ پانی جس سے تم استفادہ کر رہے ہو، اگر وہ زمین کے اندر دُور تک چلا جائے تو کون تمھارے لیے جاری پانی لاسکتا ہے؟" (قل ارءیتم ان اصبح ماؤکم غورًا فمن یأتیکم بماءٍ معین)۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین دو قسم کے مختلف قشروں سے بنی ہے۔ "نفوذ پذیر قشر" جو پانی کو اپنے اندر لے جاتا ہے اور اس کے نیچے "نفوذ ناپذیر" قشر ہے جو پانی کو وہیں محفوظ رکھتا ہے۔ تمام چشمے، کنوئیں، ندی، نالے اسی خاص ترکیب کی برکت سے وجود میں آتے ہیں۔ کیونکہ اگر تمام روئے زمین زیادہ گہرائیوں تک نفوذ پذیر قشر ہوتی تو پانی اتنا نیچے چلا جاتا کہ ہرگز اس تک کسی کی رسائی نہ ہوتی۔ اگر وہ ساری کی ساری نفوذ ناپذیر ہوتی تو رُوئے زمین کے تمام پانی اس کے اوپر ہی کھڑے رہتے اور دلدل اور کیچڑ میں تبدیل ہو جاتے یا جلدی سمندروں میں جا پڑتے اور اس طرح سے پانی کے زیرِ زمین ذخیرے ہاتھ سے نکل جاتے۔

خدا کی رحمت کا یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے کہ جس سے انسان کی موت و حیات شدّت کے ساتھ وابستہ ہے

"معین"۔ "معن" (بروزن "طعن") کے مادہ سے پانی کے جاری ہونے کے معنی میں ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ 'عین' سے لیا گیا اور اس کی میم زائدہ ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے معین کو اس پانی کے معنی میں لیا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے اگرچہ وہ جاری نہ ہو۔

لیکن اکثر نے اس کی جاری پانی کے معنی میں ہی تفسیر کی ہے۔

اگرچہ وہ پانی جو پیا جاتا ہے وہ جاری پانی میں منحصر نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جاری پانی ان کی بہترین قسم شمار ہوتا ہے، چاہے وہ دریا، نہروں، ندی نالوں اور ابلنے والے کنوؤں کی صورت میں ہو۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب ایک کافر نے یہ آیت سُنی جو یہ کہتی ہے: "اگر تمھارے استعمال میں آنے والا پانی زمین کی تہ میں چلا جائے تو کون تمھارے لیے آبِ جاری لا دے گا" تو اس نے کہا "دجال شداد ومعاول حداد!" (طاقتور مرد اور تیز کدال) پانی کو زمین کی گہرائیوں میں سے نکال لائیں گے۔ لیکن رات کو جب وہ سویا تو اس کی آنکھ میں آبِ سیاہ (کالا موتیا) اتر آیا، اس حال میں اس نے ایک آواز سُنی جو کہہ رہی تھی: "ان قوی پنجہ مردوں اور تیز کدالوں کو لے آ تاکہ وہ اس پانی کو تیری آنکھ سے باہر نکالیں"۔

لیکن موجودہ زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ اگر زمین کا "نفوذ ناپذیر" قشر ختم ہو جائے تو کوئی قوی پنجہ انسان اور تیز کدال پانی کو نہیں نکال سکتا۔[1]

٭ ٭ ٭

ایک نکتہ

جو روایات کہ ائمہ اہلِ بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں اس آخری آیت کی حضرت مہدیؑ کے ظہور اور ان کے وسیع عالمی عدل کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ منجملہ ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے:

"نزلت فی الامام القائم (ع)، یقول ان اصبح امامکم غائبًا عنکم لا تدرون این ھو؟ فمن یأتیکم بامام ظاھر یأتیکم باخبار السماوات والارض وحلال اللہ وحرامہ، ثم قال واللہ ماجاء تأویل ھٰذہ الاٰیۃ ولابد ان یجیء تأویلھا۔

"یہ آیت اس امام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عدلِ الٰہی کے ساتھ قیام کرے گا (حضرت مہدیؑ) وہ کہتا ہے کہ اگر تمھارا امام غائب ہو جائے اور تمھیں معلوم نہ ہو کہ وہاں کہاں ہے تو کون تمھارے لیے امام کو بھیجے گا جو آسمانوں اور زمین کی خبریں اور خدا کے حلال وحرام کو تمھارے لیے بیان کرے"۔ اس کے بعد فرمایا "خدا کی قسم اس آیت کی تاویل ابھی تک نہیں آئی اور بالآخر یہ آکر رہے گی۔[2]

اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ سب تطبیق کے طور پر ہیں دوسرے لفظوں میں آیت کا ظاہر تو جاری پانی کے ساتھ ہی مربوط ہے جو زندہ موجودات کی حیات و زندگی کا باعث ہے مگر آیت کا باطن امام کے وجود اور ان کے وسیع علم وعدالت کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ وہ بھی انسانی معاشرے

---

[1] ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۲۱۹

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۷

کی حیات کا سبب ہے۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے متعدد معانی اور ان کا ظاہر و باطن ہوتا ہے لیکن ہم اس نکتہ کا بھی تاکید کے ساتھ تکرار کرتے ہیں کہ بطون آیات کی تہ تک پہنچنا اور انھیں معلوم کرنا سوائے پیغمبرؐ اور امام معصوم کے ممکن نہیں اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی چیز کو آیت کے باطن کے عنوان سے اپنی طرف سے پیش کرے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ آیات کے ظواہر کے ساتھ مربوط ہے اور جو چیز بطون آیات کے ساتھ مربوط ہے وہ ہمیں صرف معصومینؑ ہی سے سننا چاہیے۔

✲ ✲ ✲

سورہ ملک" خدا کی حاکمیت و مالکیت سے شروع ہوئی اور اس کی رحمانیت پر کہ جو اس کی حاکمیت اور مالکیت کی ایک شاخ ہے، ختم ہو رہی ہے۔ اس طرح سے اس کا آغاز و انجام مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

خداوندا! ہمیں اپنی عام اور خاص رحمت کا مشمول قرار دے اور اپنے اولیاء کی ولایت کے آبِ حیات سے سیراب فرما۔

پروردگارا! حضرت مہدیؑ کا ظہور جلد فرما کہ جو آبِ حیات کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ان کے جمال کے متوالوں کو ان کے ظہور سے سیراب کر دے۔

بارِ الٰہا! تو نے ہمیں دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان اور سمجھنے والی عقل مرحمت فرمائی ہے۔ پس خود خواہی اور غرور کے پردوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دے تاکہ ہم حقیقت کے چہرے کو جس طرح کا وہ ہے اسی طرح سے دیکھ سکیں اور تیری ہدایت کے صراطِ مستقیم میں راست قامت ہو کر قدم بڑھائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

✲ ✲ ✲

سورۂ ملک کا اختتام
۱۲؍ شوال ۱۴۰۶ھ
۳/۳/۱۳۶۵ ش

ترجمہ کا اختتام

بروز جمعرات ۱۰ ذی الحجہ، عید قربان ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶؍ اگست ۱۹۸۷ء بوقت ۱۰½ بجے شب

۸۱ ای، ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور

سورۂ القلم

یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوا اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز ، ۲۰ر شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

سورۂ قلم کے مضامین

اگرچہ بعض مفسّرین نے اس تمام سورہ کے مکیّ ہونے پر شک کیا ہے یا ان کا نظریہ ہے کہ اس کا ایک حصّہ مدینہ میں اور ایک حصہ مکہ میں نازل ہُوا ہے۔لیکن سورہ کا لب ولہجہ اور آیات کا مضمون مکمل طور پر"مکی" سورتوں سے ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوّت اور ان دشمنوں سے مبازرہ،جو آپ کو مجنون کہتے تھے،صبرو استقامت کی دعوت اور مخالفین کو عذابِ الٰہی سے انذار و تہدید کے مسئلہ کے محور پر ہی گردش کرتی ہے۔

مجموعی طور پر اس سورۃ کے مضامین کو سات حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ : سب سے پہلے رسُولِ خداؐ کی مخصوص صفات کے ایک حصّہ کے ذکر،خصُوصاً آپ کے عمدہ اخلاق کو پیش کرتا ہے اور ان کی مُؤکد قسموں کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔

۲ : اس کے بعد آپ کے دشمنوں کی قبیح صفات اور مذموم اخلاق کے ایک حصّہ کو پیش کرتا ہے۔

۳ : ایک اور حصّہ میں"اصحٰب الجنّة" کی داستان،جو حقیقت میں قبیح سیرت مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے،بیان کرتا ہے۔

۴ : ایک اور حصّہ میں قیامت اور اس دن کُفّار کے عذاب سے متعلق گوناگوں مطالب بیان ہوتے ہیں۔

۵ : ایک اور حصّہ میں مشرکین کے لیے انذار اور تہدید وتخویف کا بیان ہے۔

۶ : ایک اور حصّہ میں پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ کثر دشمنوں کے مقابلہ میں صبرو استقامت کا مظاہرہ کریں۔

۷ : پھر سورہ کے آخر میں بھی قرآن کی عظمت اور پیغمبرؐ کے خلاف دشمنوں کی مختلف سازشوں کے بارے میں گفتگو ہے۔

اس سورہ کے لیے قلم کے نام کا انتخاب اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔بعض نے اس کا نام سورۃ نٓ بھی ذکر کیا ہے۔بعض روایات،جو اس سورہ کی فضیلت میں آئی ہیں،ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا نام ن و القلم ہے۔

تلاوت کی فضیلت

اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہُوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من قرأ سورة 'ن والقلم' اعطاه الله ثواب الذين حسن اخلاقهم"۔

"جو شخص سورۂ ن والقلم کی تلاوت کرے گا، خدا اس کو ان لوگوں کا ثواب دے گا جو حُسنِ اخلاق کے حامل ہیں"۔ [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"مَن قرأ سورة "ن والقلم" فی فريضة او نافلة امنه الله ان يصيبه فی حياته فقر ابدًا، و اعاذه اذا مات من ضمة القبر ان شاء الله"۔

"جو شخص سورۂ ن والقلم کو واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا خدا اسے ہمیشہ کے لیے فقر و فاقہ سے امان میں رکھے گا اور جب وہ مرے گا تو انشاء اللہ اسے فشارِ قبر سے امان دے گا"۔ [2]

ان ثوابوں کا سورہ کے مضامین کے ساتھ خاص تناسب ہے۔ اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہاں مقصد وہ تلاوت ہے جو علم و آگہی کے ساتھ ہو اور اس کے بعد اس پر عمل بھی ہو۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۷

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ

۲ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ

۳ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ

۴ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

۵ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۙ

۶ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ

۷ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَ
هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

ترجمہ

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے۔

۱ ن، قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کہ وہ قلم سے لکھتے ہیں۔

۲ اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے۔

۳ اور تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر وثواب ہے۔

۴ اور تیرے اخلاق بہت ہی عمدہ اور عظیم ہیں۔

۵ اور عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔

۶ کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔

۷ تیرا پروردگار ہر شخص سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے وہ ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔

تفسیر

تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں!

یہ واحد سورہ ہے جو حرف مقطع ن سے شروع ہُوا ہے۔ فرماتا ہے: (ن)۔

ہم نے حروف مقطعات کے بارے میں بارہا اور خصوصاً "سورۂ بقرۃ" و "آلِ عمران" اور "اعراف" (تفسیر نمونہ ۶ ، ۲) میں اس سے متعلق بحث کی ہے۔ جو چیز اب یہاں بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بعض نے یہاں ن کو لفظ کا مخفف اور اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ بعض نے اس کی 'لوح' کے معنی میں یا 'دوات' کے معنی میں یا جنت کی ایک نہر کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن ان تفسیروں میں سے کوئی بھی واضح قرینہ اور شاہد نہیں رکھتی۔

اس بناء پر اس حرف مقطع کی تفسیر ان تمام حروفِ مقطع سے الگ نہیں جن کی طرف ہم نے اوپر ا[شارہ] کیا ہے۔

اس کے بعد انسانی زندگی کے مسائل میں سے دو اہم موضوعات کی قسم کھاتے ہوئے مزید کہتا ہے: "مجھے قلم کی اور اس کی جسے وہ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں" (والقلم وما یسطرون)۔

کیسی عجیب و غریب قسم ہے؟ حقیقت میں وہ چیز جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے، ظاہراً ایک چھوٹا سا موضوع ہے۔ سرکنڈے کا ایک ٹکڑا یا اس کے مشابہ کوئی چیز اور کچھ سیاہ رنگ کا مادہ اور اس کے بعد وہ سطریں جو معمولی کاغذ کے صفحہ پر لکھی جاتی ہیں۔

لیکن حقیقت میں یہ وہی چیز ہے جو تمام انسانی تمدنوں کی پیدائش، علوم کی پیش رفت، افکار کی بیداری، مذاہب کے تشکیل پانے کا سرچشمہ اور نوعِ بشر کی آگاہی اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر دیتا ہے۔ "تاریخی دور" اور "تاریخ سے پہلے کا دور"۔ تاریخ بشر کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے خط اور تحریر ایجاد ہوئے اور انسان اپنی زندگی کے واقعات کو صفحات پر نقش کرنے

قابل ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ دور جس میں انسان نے قلم کو ہاتھ میں لیا ہے اور اس سے "مایسطرون" یادگار کے طور پر رہ گیا ہے۔

اس قسم کی عظمت اس وقت زیادہ آشکار ہوتی ہے جب ہم اس بات کی طرف توجہ کریں کہ جس دن یہ آیات نازل ہوئیں، اس وقت لکھنے والے اور اہلِ قلم اس ماحول میں موجود نہ تھے۔ اگر کچھ تھوڑے بہت لوگ لکھنے پڑھنے کی کچھ آگاہی اور علم رکھتے بھی تھے تو ان کی تعداد سرزمینِ مکہ میں، جو حجاز کا عبادتی، سیاسی اور اقتصادی مرکز تھا، بیس افراد تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ ہاں ایسے ماحول میں قلم کی قسم کھانا ایک خاص عظمت رکھتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے: ان پہلی آیات میں بھی جو جبل النور اور غارِ حرا میں پیغمبرؐ کے پاک دل پر نازل ہوئی تھیں، قلم کے بلند مقام کی طرف اشارہ ہوا ہے، جہاں فرماتا ہے:

"اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم۔ الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم"

"اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے، جس نے مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اور انسان کو بستہ اور جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، اپنے عظیم پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا اُسے وہ سکھایا۔ (علق ۱: ۵)

سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس شخص کی زبان سے ادا ہو رہی تھیں جس نے خود (عالم ظاہر میں) کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی، کبھی مدرسہ نہیں گیا تھا اور کوئی تحریر نہیں لکھی تھی۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وحی آسمانی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں "قلم" کی اس قلم سے تفسیر کی ہے جس سے خدا کے عظیم فرشتے وحی آسمانی کو لکھتے ہیں یا جس سے انسانوں کے اعمال نامے رقم کرتے ہیں۔ لیکن مسلمہ طور پر یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور یہ تفسیر اس کے ایک مصداق کو بیان کرتی ہے، جیسا کہ "مایسطرون" بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، اور انسان کی عملی، اخلاقی اور فکری ہدایت اور تکامل و ارتقاء کے لیے جو کچھ بھی لکھتے ہیں ان سب کو شامل ہے۔ فقط وحی آسمانی یا انسانوں کے اعمال میں منحصر نہیں ہے۔[۱]

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس چیز کو، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے"۔ (ما انت بنعمة ربك بمجنون)۔

وہ لوگ جو یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں دل کے ایسے اندھے ہیں جو تیرے بارے میں خدا کی ان تمام نعمتوں کو نہیں دیکھتے، نعمت عقل و درایت، نعمت امانت و صدق و راستی، نعمت علم و دانش اور مقام نبوت

(حاشیہ ۱ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اور مقامِ عصمت۔

دیوانے تو وہ ہیں جو عقلِ کل کے مظہر کو جنون کے ساتھ متہم کرتے ہیں اور انسانوں کے رہبر و رہنما کو اس ناروا نسبت کے ذریعہ اپنے سے دُور کر رہے ہیں۔

* * *

اِس کے بعد مزید کہتا ہے: "تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجرو ثواب ہے۔" (و ان لک لاجرًا غیر ممنون)۔

تیرے لیے ایسا اجر و ثواب کیوں نہ ہو؟ جبکہ تو ایسی قبیح اور ناروا تہمتوں کے مقابلہ میں استقامت ظاہر کرتا ہے۔ان کے لیے ہدایت و نجات کی آرزو رکھتا ہے اور اس راستے میں سعی و کوشش کرنے سے تھکتا نہیں ہے۔

"ممنون"۔ "من" کے مادہ سے "منقطع" ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسا اجر و پاداش جو ہرگز منقطع نہیں ہوگا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس معنی کی اصل اور ریشہ منت سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ منت، نعمت کے قطع ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر ممنون سے مراد یہ ہے کہ خُدا اس اجرِ عظیم کے مقابلہ میں تجھ پر ہرگز منت نہیں رکھتا لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

* * *

بعد والی آیت پیغمبرؐ کی ایک اور صفت کے بارے میں کہتی ہے: "تو عظیم اور عمدہ اخلاق کا حامل ہے۔" (و انک لعلٰی خلق عظیم)۔

ایسے اخلاق جن کے مقابل عقل حیران ہے، بے نظیر لطف و محبت، بے مثل صفا و صمیمیت اور توصیف سے باہر صبر و استقامت اور تحمّل و حوصلہ۔

اگر تو لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتا ہے تو سب سے زیادہ عبادت بھی کرتا ہے۔ اگر بُرے کام سے روکتا ہے تو سب سے پہلے خود اس کام سے رکتا ہے، وہ تجھے تکلیف پہنچاتے ہیں اور تو پند و نصیحت کرتا ہے۔ وہ تجھے بُرا بھلا کہتے ہیں اور تو ان کے لیے دعا کرتا ہے، وہ تیرے جسم پر پتھر مارتے ہیں اور گرم مٹی تیرے سر پر پھینکتے ہیں لیکن تو ان کی ہدایت کے لیے بارگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔

ہاں! تو محبت اور مہربانیوں کا مرکز اور رحمت کا سرچشمہ ہے۔

(حاشیہ لے صفحہ سابقہ) 'ما یسطرون' کے 'ما' کو بعض تو ما مصدریہ سمجھتے ہیں اور بعض ما موصولہ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ یہ تقدیر میں اِس طرح ہے "وما یسطرونہ" بعض اس کو لوح یا کاغذ کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس پر کتابت کی جاتی ہے اور تقدیر میں مایسطرون فیہ ہے۔ بعض نے ما کو یہاں ذوی العقول اور ان افراد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو ان سطور کو لکھتے ہیں لیکن وہی معنی زیادہ مناسب ہے جو ہم نے متن میں ذکر کیا ہے۔

"خلق" "خلقت" کے مادہ سے ایسی صفات کے معنی میں ہے جو انسان سے جُدا نہیں ہوتے اور وہ انسان کی خلقت و آفرینش کے مانند ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے پیغمبرؐ کے خلقِ عظیم کی راہِ حق میں صبر و استقامت، سخاوت و بخشش میں وسعت، تدبیرِ امور، رفق و مدارا، خدا کی طرف دعوت کی راہ میں سختیوں کا برداشت کرنا، عفو و درگز، پروردگار کی راہ میں جہاد اور حسد و حرص کو ترک کرنے کے ساتھ" تفسیر کی ہے۔ اگرچہ یہ سب کی سب صفات پیغمبرؐ میں موجود تھیں لیکن آپ کا خلقِ عظیم صرف انھیں میں منحصر نہیں تھا۔

بعض تفاسیر میں "خلقِ عظیم" کی قرآن یا دین اسلام کے ساتھ بھی تفسیر کی گئی ہے جو اوپر والے وسیع مفہوم کا ایک مصداق ہوسکتی ہے۔ بہرحال پیغمبرؐ میں اس 'خلقِ عظیم' کا ہونا آنحضرتؐ کی عقل و درایت اور دشمنوں کی طرف سے دی گئی نسبتوں کی نفی پر ایک واضح دلیل ہے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔" (فستبصر و یبصرون)۔

* * *

"کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔" (بایّکم المفتون)[1]

"مفتون" "فتنہ" سے اسم مفعول ہے جو ابتلاء کے معنی میں ہے اور یہاں جنون میں مبتلا ہونے کے معنی میں ہے۔

ہاں! وہ آج یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا کو تجھ سے دُور کر دیں، لیکن لوگ عقل و شعُور رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تیری تعلیمات اور ارشادات سے آگاہی حاصل کریں گے۔ اس وقت یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا کہ یہ عمدہ تعلیمات خدائے عظیم کی طرف سے تیرے پاک اور نورانی دل پر نازل ہُوئی ہیں اور خدا نے عقل و علم کا ایک عظیم حصّہ تجھے بخشا ہے۔

مستقبل میں تیری تحریکیں اور طریقِ کار اور ان کے سایہ میں اسلام کی پیش رفت اور سریع نفوذ بھی اس بات کی نشان دہی کر دے گا کہ تو عقل و درایت کا ایک عظیم منبع ہے۔ دیوانے تو وہ چمگادڑ ہیں جو اس آفتاب کے نُور سے جنگ کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے ہیں۔

پھر قیامت میں تو یہ حقایق یقینی طور پر اور بھی زیادہ روشن اور زیادہ واضح و آشکار ہو جائیں گے۔

* * *

---

[1] "بایّکم" میں 'با' زائدہ ہے اور ایّکم قبل کے دو افعال کا مفعول ہے۔

نیز مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "تیرا پروردگار سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے اور ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔" (ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله و هو اعلم بالمهتدين)۔

کیونکہ یہ راستہ اسی کا راستہ ہے اور وہ اپنی راہ کو ہر شخص سے بہتر پہچانتا ہے۔ گویا اس طرح پیغمبر اسلام کو زیادہ سے زیادہ اطمینان دلاتا ہے کہ وہ ہدایت کے راستہ پر ہیں اور ان کے دشمن ضلالت و گمراہی کی راہ پر ہیں۔

ایک مستند حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قریش نے دیکھا کہ پیغمبر علیؑ کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کی تعظیم اور احترام کرتے ہیں تو انھوں نے امام علیؑ کی مذمت شروع کر دی اور کہا کہ محمدؐ اس کا مفتون اور اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اس موقع پر خدا نے نٓ والقلم نازل فرمایا اور قسم کھا کر کہا کہ اے محمدؐ! تو مفتون و مجنون نہیں ہے۔ یہاں تک فرمایا: خدا ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو گمراہ ہو گئے ہیں۔ (یہ قریش کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو یہ باتیں کرتے تھے) اور خدا ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور سے جانتا ہے۔ (یہ امام علیؑ کی طرف اشارہ ہے)[1]

* * *

چند نکات

۱: انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر

نوعِ بشر کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، خط کا پیدا ہونا اور قلم کا کاغذ یا پتھر پر چلنا تھا۔ یہ وہی وقت تھا کہ جس نے تاریخ کے دور کو ماقبلِ تاریخ سے جُدا کر دیا۔

کاغذ کے صفحہ پر نوکِ قلم کی گردش بشر کی سرنوشت کو رقم کرتی ہے۔ لہٰذا انسانی معاشروں کی کامیابی اور شکست نوکِ قلم سے وابستہ ہے۔

قلم علوم و معارف کا محافظ، مفکّرین کے افکار کا پاسدار، عُلماء کے فکری اتصال کی کڑی اور نوعِ بشر کے ماضی و حال کے ارتباط کے لیے ایک پُل ہے۔ یہاں تک کہ آسمان و زمین کا ارتباط بھی لوح و قلم کے ذریعہ ہی ہُوا ہے۔

قلم ان انسانوں کو جو زمان و مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ گویا تمام طولِ تاریخ اور تمام رُوئے زمین کے سب مفکّرین نوعِ بشر کو

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۴ (طبرسی نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ اہلِ سنّت سے نقل کیا ہے۔)

ایک کتابخانۂ عظیم میں دیکھ لیں گے۔

قلم رازدارِ بشر ہے، خزانہ دارِ علوم ہے۔ قرون و اعصار کے تجربات کو جمع کرنے والا ہے۔ اگر قرآن اس کی قسم کھاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ کیونکہ قسم ہمیشہ ایک بہت ہی عظیم اور قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کھائی جاتی ہے۔

البتہ "قلم" "مایسطرون" (تحریروں) کے لیے ایک وسیلہ ہے اور قرآن نے دونوں کی قسم کھائی ہے، یعنی آلہ کی بھی اور آلہ کے محصول کی بھی۔

بعض روایات میں آیا ہے :

انّ اول ما خلق اللہ القلم

پہلی چیز جو خدا نے خلق کی وہ قلم تھا۔

اس حدیث کو شیعہ محدثین نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے۔[۱] نیز یہ اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی ایک مشہور خبر کے عنوان سے آئی ہے۔[۲]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے :

"اول ما خلق اللہ تعالیٰ جوھرۃ"

پہلی چیز جس کو خدا نے خلق کیا وہ ایک گوہر تھا۔[۳]

بعض اخبار میں یہ بھی آیا ہے :

"انّ اوّل ماخلق اللہ العقل"

پہلی چیز جسے خدا نے خلق فرمایا وہ عقل تھی۔[۴]

اس وصف کے تعلق کی طرف توجہ جو "گوہر"، "قلم" اور "عقل" کے درمیان ہے، ان سب کے اوّل ہونے کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے۔

جو حدیث ہم نے اوپر امام صادقؑ سے نقل کی اس میں آیا ہے کہ خدا نے قلم کو پیدا کرنے کے بعد اس سے فرمایا: "لکھ!" اور اس نے جو کچھ تھا اور جو قیامت کے دن تک ہوگا، سب کچھ لکھ دیا۔

اگرچہ اس روایت میں قلم سے قلم تقدیر اور قضا و قدر کی طرف اشارہ ہے، لیکن چاہے جو کچھ بھی ہے بشر کی سرنوشت اور اس کے مقدرات میں قلم کے نقش و اثر کو واضح کرتی ہے۔

۱۔ نورالثقلین جلد ۵ ص ۳۷۹ حدیث ۹

۲۔ ۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

۴۔ تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

پیشوایان اسلام متعدد احادیث میں اپنے اصحاب کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حافظے پر قناعت نہ کریں اور احادیثِ اسلامی اور علوم الٰہی کو رشتۂ تحریر میں لاکر آنے والے لوگوں کے لیے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔ [1]

بعض علماء نے کہا ہے :

"البیان بیانان : بیان اللسان، وبیان البنان، وبیان اللسان تدرسه الاعوام، وبیان الاقلام باق علی مر الایام"

"بیان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ زبان کا بیان اور قلم کا بیان۔ زبان کا بیان تو زمانہ اور سالوں کے گزرنے سے کہنہ اور پرانا ہو جاتا اور ختم ہو جاتا ہے لیکن قلموں کا بیان ابد تک باقی رہتا ہے : [2]

یہ بھی کہا گیا ہے :

"ان قوام امور الدین والدنیا بشیئین القلم والسیف والسیف تحت القلم"

"دین و دنیا کے امور کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ قلم و شمشیر، اور شمشیر قلم کے زیر سایہ قرار پاتی ہے۔ [3]

اس معنی کو بعض شعرائے عرب نے اس طرح نظم کیا ہے :

کذا قضی الله للاقلام مذ بریت

ان السیوف لها مذ ارهفت خدم

خدا نے قلم کے لیے اسی روز سے جب سے وہ بنایا گیا ہے

اسی طرح مقدر کیا ہے۔

کہ تیز دھار تلواریں اس کی خدمت گزار ہوں۔

(یہ تعبیر قلم کے چاقو کے ذریعہ تراشے جانے کی طرف نیز تلواروں کا ابتداء کار سے قلم کی خدمت میں ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے)۔ [4]

ایک دوسرا شاعر، زیر بحث آیات کے استناد کے ساتھ اس سلسلہ میں کہتا ہے :

اذا اقسم الابطال یوما بسیفهم

وعدوه مما یجلب المجد والکرم

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۵۶ (حدیث ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰)

[2،3،4] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۲

کفی قلم الکتاب فخراً و رفعة

مدی الدھر ان اللہ اقسم بالقلم

"جس دن بہادر جنگجو لوگ اپنی تلواروں کی قسم کھائیں اور انھیں بزرگی اور افتخار کے اسباب میں سے شمار کریں تو لکھنے والوں کے قلم کے لیے عالم کے تمام زمانوں میں یہی اعزاز اور سربلندی کافی ہے کہ خدا نے قلم کی قسم کھائی ہے۔ (نہ کہ تلوار کی) [1]

واقعاً یہی بات ہے۔ کیونکہ فوجی کامیابیوں کی اگر قومی تمدّن کے ذریعہ ضمانت نہ ہو تو وہ ہرگز پائیدار نہ ہوں گی۔ مغلوں نے ایران کی تاریخ میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی لیکن چونکہ وہ ایک ایسی قوم تھی جس کا کوئی تمدّن نہیں تھا، لہٰذا وہ جلدی ہی اسلام اور ایران کے تمدّن میں تحلیل ہو گئے اور انھوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔

اگرچہ یہ بحث بڑی وسیع ہے لیکن اس بناء پر کہ ہم تفسیر کے راستہ سے باہر نہ ہو جائیں اس بحث کو پیغمبر اسلامؐ کی ایک بہت ہی پُرمعنی حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"ثلاث تخرق الحجب، وتنتھی الی ما بین یدی اللہ: صریر اقلام العلماء، و وطی اقدام المجاھدین وصوت مغازل المحصنات"

"تین آوازیں ایسی ہیں جو حجابوں کو توڑ کر خدا کی باعظمت بارگاہ میں پہنچ جاتی ہیں۔ لکھتے وقت علماء کے قلموں کے چلنے کی آواز، میدانِ جہاد میں مجاہدین کے قدموں کی چاپ، اور پاک دامن عورتوں کے چرخوں کی آواز" [2]

البتہ جو کچھ بیان ہوا ہے یہ سب ان قلموں کے بارے میں ہے جو حق و عدالت کی راہ اور صراط مستقیم میں چلتی ہیں ــــــ لیکن مسموم، زہریلے اور گمراہ کرنے والے تو انسانی معاشروں کے لیے عظیم ترین بلا اور بہت بڑا خطرہ ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۱۰۲

[2] الشہاب فی الحکم والآداب ص ۲۰

۲ : پیغمبرؐ کے اخلاق کا ایک نمونہ

پیغمبر اسلامؐ کی کامیابی اگرچہ خدائی تائید و امداد کے ساتھ ہوئی تھی، لیکن آپ ظاہری لحاظ سے بھی اس کے لیے کئی عوامل رکھتے تھے جن میں سے اہم ترین پیغمبرؐ کا جاذبہ اخلاقی تھا۔ اعلیٰ انسانی صفات اور مکارم اخلاق آپ میں اس طرح سے جمع تھے جو سخت ترین دشمنوں کو بھی متاثر کر دیتے، انھیں سرِ تسلیم خم کرنے پر ابھارتے اور دوستوں میں شدید جذب و محبت پیدا کر دیتے تھے۔

بلکہ اگر ہم اسے پیغمبرؐ کا اخلاقی معجزہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس اخلاقی معجزہ کا ایک نمونہ فتح مکہ میں نمایاں ہوا جب وہ خونخوار اور جرائم پیشہ مشرکین مکہ جنھوں نے سالہا سال تک اسلام اور پیغمبرؐ کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کی تھی، مسلمانوں کے چنگل میں گرفتار ہوئے تو پیغمبر اسلامؐ نے دوستوں اور دشمنوں کے تمام اندازوں کے برخلاف ان کے لیے عام معافی کا فرمان جاری کر دیا، اور ان کے تمام جرائم کو معاف کر دیا۔ یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ وہ یدخلون فی دین اللہ افواجا کے مصداق بن کر فوج در فوج مسلمان ہو جائیں۔

پیغمبرؐ کے حسنِ خلق، عفو و درگزر، عطوفت و مہربانی، ایثار و فداکاری اور تقویٰ و پرہیزگاری کے بارے میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت زیادہ واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کا بیان ہمیں تفسیری بحث سے خارج کر دے گا۔ لیکن ہمارے لیے اتنا لکھنا ہی کافی ہے۔ کہ ایک حدیث میں حضرت امام حسینؑ ابن علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

"میں نے اپنے پدر بزرگوار امیرالمومنین علیؑ سے پیغمبرؐ کی زندگی کی خصوصیات اور آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو میرے والد نے تفصیل کے ساتھ مجھے جواب دیا۔ اس حدیث کے ایک حصہ میں آیا ہے:

> "اپنے پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی رفتار اس طرح تھی کہ آپ خوشرو، خنداں، خلیق اور نرم رہتے تھے، اور کبھی بھی سخت مزاج، سنگدل، پرخاش رکھنے والے، سخت زبان، عیب جُو اور تعریف پسند نہ تھے۔ کوئی شخص آپ سے مایوس نہ ہوتا تھا، جو شخص بھی آپ کے گھر کے دروازے پر آتا مایوس و نا امید نہ لوٹتا تھا۔ تین چیزوں کو آپ نے اپنے سے الگ کر رکھا تھا، گفتگو میں جھگڑنا، زیادہ باتیں کرنا، اور ایسے کام میں دخل دینا جو آپ سے مربوط نہ ہو۔ اسی طرح تین چیزوں کو لوگوں کے بارے میں چھوڑ رکھا تھا، کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، کسی کو سرزنش نہیں کرتے تھے اور لوگوں کے پوشیدہ عیوب اور لغزشوں کی جستجو نہیں کرتے تھے۔ آپ

۱۔ معانی الاخبار

۲۔ مجمع البیان

ہرگز کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے سوائے ان امور کے بارے میں جن میں حصولِ ثواب کی اُمید رکھتے تھے، گفتگو ایسی موثر ہوتی تھی کہ تمام سننے والے لوگ سکوت اختیار کر لیتے تھے اور اپنی جگہ سے ہلتے تک نہیں تھے۔ جب آپ خاموش ہو جاتے تو پھر وہ لوگ بولتے۔ لیکن وہ آپ کے پاس نزاع اور جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی اجنبی اور ناواقف آدمی سخت سے بات کرتا اور درخواست کرتا تو آپ تحمل سے کام لیتے اور اپنے اصحاب سے فرماتے: جب کسی کو دیکھو کہ وہ کوئی حاجت رکھتا ہے تو اس کی حاجت پوری کرو۔ آپ ہرگز کسی کی بات کو نہیں کاٹتے تھے جب تک کہ اس کی بات ختم نہ ہو جاتی۔" [1]

ہاں! اگر یہ اخلاق کریمہ اور یہ ملکاتِ فاضلہ نہ ہوتے تو وہ پسماندہ اور جاہل قوم اور وہ سخت اور اثر ناپذیر گروہ آغوشِ اسلام میں ہرگز نہ آتا، اور لانفضوا من حولك کا مصداق بن کر سب پراگندہ ہو جاتے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہ اسلامی اخلاق آج زندہ ہوں اور ہر مسلمان میں پیغمبر اسلامؐ کے اخلاق وعادات کا عکس نظر آئے۔

اس سلسلہ میں اسلامی روایات بھی، چاہے وہ خود پیغمبرؐ کے بارے میں ہوں یا سب مسلمانوں کی ذمہ داری کے بارے میں، بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند روایات کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:۔

۱: "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

"میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اخلاقی فضائل کی تکمیل کروں۔" [2]

اسی طرح پیغمبرؐ کی بعثت کا ایک اصلی ہدف یہی اخلاق فاضلہ کی تکمیل ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

۲: "انما المؤمن لیدرك بحسن خلقه درجة قائم اللیل وصائم النهار" [3]

"مومن اپنے حُسنِ خلق کی وجہ سے اس شخص کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو راتوں کو عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور دنوں میں روزے رکھتا ہے۔"

---

[1] معانی الاخبار ص ۸۳ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)
[2,3] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

۳ : آنحضرتؐ ہی سے یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"ما من شیء اثقل فی المیزان من خلق حسن"

"کوئی چیز میزان عمل میں قیامت کے دن اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی نہیں ہوگی"۔ [1]

۴ : آنحضرتؐ سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"احبکم الی الله احسنکم اخلاقا الموطؤن اکنافا، الذین یألفون و یؤلفون ، و ابغضکم الی الله المشاؤن بالنمیمة المفرقون بین الاخوان ، الملتمسون للبرآء العثرات"؟

"تم سب میں سے خدا کے ہاں زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں، وہی لوگ جو متواضع ہیں، دوسروں سے جوش محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کرتے ہیں کہ بھائیوں کے درمیان جدائی ڈال دیں اور بے گناہ لوگوں کے لیے لغزش کی جستجو میں لگے رہتے ہیں"۔ [2]

۵ : ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

"اکثر ما یدخل الناس الجنة تقوی الله و حسن الخلق"۔

"وہ چیز جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنّت میں داخل کرے گی، تقویٰ اور حُسنِ خلق ہے"۔ [3]

۶ : ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

"ان اکمل المؤمنین ایمانًا احسنهم خلقًا"

"مومنین میں سے اس کا ایمان سب سے بہتر ہے جس کے اخلاق

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۰

[3] سفینة البحار جلد ۱ ص ۴۱۰ (یہی مضمون وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۰۴ میں بھی آیا ہے۔ اسی طرح تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۰۷ میں بھی ہے۔)

زیادہ کامل ہیں۔[1]

۷ : ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا سے آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا :

"علیکم بحسن الخلق، فان حسن الخلق فی الجنۃ لا محالۃ و ایاکم و سوء الخلق - فان سوء الخلق فی النار لا محالۃ۔"

"تمھارے لیے لازم ہے کہ حُسنِ خلق اختیار کرو، کیونکہ حُسنِ خلق والا انجام کار جنّت میں ہے۔ سوءِ خلق سے بچو، کیونکہ سُوءِ خلق والا انجام کار جہنم میں ہے۔[2]

اوپر والی روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حسن خلق جنّت کی کلید اور رضائے خدا کے حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے، قُدرتِ ایمانی کی نشانی ہے، دن رات کی عبادتوں کے ہم پلّہ ہے اور اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

❋ ❋ ❋

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۱۰۸

[2] وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۰۶ حدیث ۲۱

۸ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○
۹ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○
۱۰ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ○
۱۱ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ○
۱۲ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ○
۱۳ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ○
۱۴ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ○
۱۵ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِ[يْنَ]

۱۶ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ○

ترجمہ

۸ اب جب کہ یہ بات ہے تو تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔

۹ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کرو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں (ایسی نرمی جو راہِ حق
انحراف کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔)

۱۰ اور ایسے پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے آدمی کی اطاعت نہ کرو۔

۱۱ جو بہت ہی زیادہ عیب جُو اور چغلخور ہے۔

نیک کاموں میں بہت زیادہ رُکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز گر اور گنہگار ہے۔

اور ان سب باتوں کے علاوہ کینہ پرور، پُرخور، سخت مزاج اور بدنام ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ صاحبِ مال اور زیادہ اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے لگو۔

جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں۔

ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ و عار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔

ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو

پیغمبرؐ کے عظیم اخلاق کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں ان کے دشمنوں کے اخلاق کو بیان کر رہا ہے تاکہ ان میں موازنہ کرنے سے ان دونوں کا فرق کامل طور سے آشکار ہو جائے۔

پہلے فرماتا ہے: "ان تکذیب کرنے والوں کی، جو خدا، پیغمبرؐ، قیامت کے دن اور خدا کے دین کی تکذیب کرتے ہیں، اطاعت اور پیروی نہ کرو" (فلا تطع المکذّبین)۔

وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے لوگ ہیں اور انھوں نے حق کے تمام اصول اپنے پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صرف ایک بات میں اطاعت بھی گمراہی اور بدبختی کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔

؁ ؁ ؁

اس کے بعد پیغمبرؐ کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی ساز باز میں ان کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کر لو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں" (ودّوا لو تدھن فیدھنون)۔

نرمی اور جھکاؤ کا معنی یہ ہے کہ ان کی خدا کے فرامین کے ایک حصہ سے صرفِ نظر کرے۔

مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رؤسائے مکّہ نے پیغمبرؐ کو اپنے بزرگوں کے دین، شرک اور بُت پرستی کی دعوت دی تو خدا نے آپ کو ان کی اطاعت سے منع کیا۔[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض دوسروں نے یہ نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ، جو شرک کے بہت بڑے سرغنوں میں سے تھا، اس نے بہت زیادہ مال پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا اور قسم کھائی کہ اگر آپ اپنے دین سے پھر جائیں تو یہ سارا مال آپ کو دے دے گا۔[1]

آیات کے لب و لہجہ اور تاریخوں میں درج واقعات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دل کے اندھے مشرکین نے دین اسلام کی پیش رفت کی سرعت کا مشاہدہ کیا تو وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ پیغمبرؐ کو کچھ امتیازات دے کر ان سے کچھ امتیازات لے لیں اور انھیں سازش کے ذریعہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ جیسا کہ طول تاریخ میں یہی طرفداران باطل کا طریقہ رہا ہے۔ لہٰذا کبھی تو بہت زیادہ مال کی، کبھی خوبصورت عورتوں کی اور کبھی اعلیٰ عہدے اور مقام کی پیش کش کرتے۔ حقیقت میں وہ روح پیغمبرؐ کو بھی اپنے وجود کے ترازو میں تول رہے تھے۔

لیکن قرآن پیغمبرؐ کو بار بار خبردار کرتا ہے کہ ان انحرافی پیشکشوں کے مقابلہ میں اپنی طرف سے معمولی سے جھکاؤ کا بھی اظہار نہ کریں اور اہل باطل کی خاطر ہرگز نرمی نہ کریں۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۴۹ میں آیا ہے: "و ان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواء ھم و احذرھم ان یفتنوك عن بعض ما انزل اللہ الیك۔" ان (اہل کتاب) کے درمیان خُدا کے نازل کردہ فرمان کے مُطابق حکم کرو اور ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ وہ تمھیں ان تعلیمات سے جو خدا نے تم پر نازل کی ہیں منحرف نہ کر دیں۔

"یدھنون"۔ "مُداھنہ" کے مادہ سے اصل میں 'دُھن' بمعنی روغن لیا گیا ہے اور اس قسم کے موارد میں نرمی کرنے اور جھکاؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ تعبیر مذموم اور منافقانہ جھکاؤ کے موارد میں استعمال ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد دوبارہ ان کی اطاعت سے منع کرتے ہوئے نو مذموم صفات کو جن میں سے ہر ایک اکیلی اطاعت اور پیروی کرنے سے مانع ہو سکتی ہے، ان کو شمار کرتا اور فرماتا ہے: "اور ایسے لوگوں کی جو پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے ہوں اطاعت نہ کرو" (ولا تطع کل حلّاف مھین)۔

'حلّاف' اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ قسمیں کھاتا ہو اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم کھانے لگے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ اپنی قسموں میں سچے نہیں ہوتے۔

"مھین"۔ "مھانت" سے حقارت و پستی کے معنی میں ہے۔ لعض نے اس کی کم عقل یا جھوٹے یا بہت

(حاشیہ صفحہ سابقہ) [1] فخر رازی جلد ۳۰ ص ۸۵ و مراغی جلد ۲۹ ص ۳۱

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۱۰

زیادہ شریر افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ شخص جو بہت ہی زیادہ عیب جُو اور چغلخور ہے۔" (ھمّاز مشّاء بنمیم)۔

"ھمّاز"۔ "ھمز" (بروزن طنز) کے مادہ سے غیبت اور عیب جُوئی کرنے کے معنی میں ہے۔

"مشّاء بنمیم" ایسا شخص جو تعلقات خراب کرنے، فساد پھیلانے اور لوگوں میں دشمنی پیدا کرنے کے لیے آمدورفت رکھتا ہو۔ (اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں اوصاف صیغۂ مبالغہ کی صورت میں آئے ہیں جو اس قسم کے قبیح کاموں میں ان کے انتہائی اصرار کی ترجمانی کرتے ہیں)

پانچویں چھٹی اور ساتویں صفت میں کہتا ہے: "وہ شخص جو نیک کاموں میں بہت زیادہ رکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز گر اور گنہگار ہے۔" (منّاع للخیر معتد اثیم)۔

نہ صرف خود کوئی اچھا کام نہیں کرتا اور اچھائی کا راستہ نہیں دکھاتا، بلکہ دوسروں کی خیر و برکت کے مقابلہ میں بھی ایک رکاوٹ بنا ہُوا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ایسا انسان ہے جو حدودِ الٰہی اور ان حقوق سے جو خدا نے ہر انسان کے لیے معیّن کر دیئے ہیں، تجاوز کرنے والا ہے۔ ان صفات کے علاوہ ہر قسم کے گناہ میں بھی آلودہ ہے، اس طرح کہ گناہ اس کی طبیعت اور مزاج کا جُزء بن چکا ہے۔

* * *

آخرکار ان کی آٹھویں اور نویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ان سب باتوں کے علاوہ پرخور و بدنام ہے۔" (عتل بعد ذالك زنیم)۔

"عتل" جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں کہا ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں جو غذا بہت زیادہ کھاتا ہو، ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہو اور دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہو۔

بعض دوسروں نے "عتل" کو ایک بدخُو، کینہ پرور، سخت مزاج انسان یا بے حیا اور بدخلق انسان کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

"زنیم" ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا حسب و نسب واضح نہ ہو اور اسے کسی قوم کی طرف نسبت دیتے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہوتا۔ اصل میں "زنمہ" (بروزن قلمہ) گوسفند کے کان کے اس حصّہ کو کہتے ہیں جو لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ گویا وہ کان کا جزء نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

"بعد ذالك" کی تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات سابقہ صفات سے زیادہ بُری اور مذموم ہیں جیسا کہ مفسّرین کی ایک جماعت نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں خدا نے جھٹلانے والوں، ان کی قبیح صفات اور اخلاقِ رذیلہ کی ایسی تصویر کشی کی ہے،

کہ شاید سارے قرآن میں اس کی مثل ونظیر نہ ہو۔ وہ اس طرح سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اسلام وقرآن کے مخا
اور پیغمبرؐ کی ذات کے مخالفین خود کس قسم کے لوگ تھے۔ جھوٹے، پست، عیب جو، چغلخور، حد سے تجاوز کر
والے، گنہگار اور بے اصل ونسب افراد اور واقعاً اس قسم کے افراد کے علاوہ اور کسی سے اس قسم کے
مصلح کی مخالفت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں خبردار کرتا ہے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں، اس بنا
تم ان کے مقابلہ میں نرم پڑ جاؤ اور سرتسلیم خم کرکے ان کی اطاعت کرنے لگو۔" (ان کان ذا مال
و بنین)۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبرؐ ہرگز ان کی اطاعت وپیروی نہ کرتے، لیکن یہ آیات حقیقت میں اس
امر پر ایک تاکید ہیں تاکہ آپ کے مکتب کی راہ اور عملی روش سب پر آشکار ہو جائے اور دوست ودشمن
میں سے کوئی بھی شخص اس قسم کی توقع نہ رکھے۔

اس بناء پر اوپر والا جملہ آیت ولا تطع کل حلاف مھین کا تتمہ ہے، لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ
آیت حقیقت میں ان صفات کی پیدائش کی علت کا بیان ہے۔ یعنی دولت وثروت اور افرادی قوت سے پیدا
ہونے والا غرور وتکبر انھیں ان اخلاقی رذائل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے بے ایمان دولت
مندوں اور قدرت رکھنے والوں میں یہ صفات نظر آتی ہیں۔ لیکن آیات کا لب ولہجہ پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ
مناسب ہے، اور اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے بھی اس کو انتخاب کیا ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں اس قسم کی پست صفات کے حامل افراد کا آیات الٰہی کے مقابلہ میں عکس العمل دکھاتے
ہوئے کہتا ہے: "جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو گذرے ہوئے لوگوں
کے بے فائدہ افسانے ہیں۔" (اذا تتلی علیہ ایاتنا قال اساطیر الاولین)۔

وہ اس بہانے سے اور اس قبیح نسبت کی وجہ سے آیات خدا سے دور ہو جاتا ہے اور انھیں فراموش کر
دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اسی بناء پر اس قسم کے افراد کی اطاعت وپیروی نہیں کرنا چاہیئے اور
یہ اس قسم کے افراد کی اطاعت سے نہی میں ایک تکمیل ہے۔

آخری زیر بحث آیت، اس گروہ کی ایک سزا سے پردہ اٹھاتے ہوئے مزید کہتی ہے: "ہم عنقریب اس کی
ناک پر ننگ وعار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔" (سنسمہ علی المخرطوم)۔

یہ ان کو انتہائی ذلیل کرنے کے لیے ایک منہ بولتی تعبیر ہے۔ کیونکہ اول تو ناک کی خرطوم سے تعبیر جو صرف
سور اور ہاتھی کے لیے بولی جاتی ہے، ان کے لیے ایک واضح تحقیر وتذلیل ہے۔ دوسرے لغت عرب میں

ناک عام طور پر بزرگی اور عزّت سے کنایہ ہوتا ہے ، جیساکہ فارسی میں بھی جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی ناک کو مٹی میں رگڑ دو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی عزّت کو برباد کر دو۔ (اردو میں ناک کا کٹنا بے عزتی کے معنی میں آتا ہے ۔) تیسرے نشان و علامت لگانا جانوروں کے ساتھ مخصوص ہے ، لیکن جانوروں میں بھی ان کے چہروں خصوصًا ان کے ناک پر علامت نہیں لگائی جاتی ، اور اسلام میں بھی اس کام سے روکا گیا ہے ۔ یہ سب چیزیں واضح بیان کے ساتھ کہتی ہیں کہ خدا اس قسم کے طغیان گر ، خود خواہ ، متجاوز اور سرکش افراد کو اس طرح سے ذلیل کرتا ہے اور ہر جگہ ان کی رُسوائی کا ڈھنڈورا پٹوا دیتا ہے تاکہ سب کے لیے عبرت ہو۔

تاریخ اسلام بھی اس معنی پر گواہ ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین کا یہ گروہ اسلام کی پیش رفت سے اس طرح ذلیل و رُسوا ہُوا کہ جس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں ملتی ۔ آخرت کی رسُوائی اس سے بھی زیادہ ہے۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات شرک کے ایک مشہور سرغنہ " ولید بن مغیرہ " کے بارے میں آئی ہیں ۔ لیکن یہ بات آیات کی عمومیّت ، وسعت اور اس کی تعبیرات کے شمول سے مانع نہیں ہے[1]

ٌ ٌ ٌ

چند نکات

۱ : اخلاقی رذائل

اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے سخت مخالفین کی صفاتِ رذیلہ کی تفصیلات کے بارے میں ہیں ، لیکن اس کے باوجود ان صفات کی تشخیص کے لیے ایک نمونہ ہمارے ہاتھ میں دیتی ہیں ۔ وہ ایسی بُری صفات ہیں جو انسان کو خدا سے دُور کر دیتی ہیں اور شقاوت و بدبختی کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں ۔ وہ ایسی صفات ہیں کہ جن سے سچّے مومنین کو بچتے رہنا چاہیے اور ان سے آلودہ نہیں ہونا چاہیے ۔ اِسی لیے اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے ۔ منجملہ :

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ ناک پر علامت لگانا جنگ بدر میں عملی طور پر صورت پذیر ہو گیا کہ کفر کے بعض سرغنوں کی ناک پر اس طرح سے ضرب لگی کہ اس کی علامت باقی رہی ۔ اگر یہاں ولید بن مغیرہ ہی مُراد ہو تو تاریخ یہ کہتی ہے کہ وہ جنگ بدر سے پہلے ہی ذلت وخواری کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا ۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شخص مراد ہو تو پھر وہ بات ممکن ہے جو امام علیؑ بن الحسینؑ کے شام کے مشہور خطبہ میں بھی آئی ہے انا ابن من ضرب خراطیم الخلق حتی قالوا لا الٰہ الا اللّٰہ ! میں اس کا بیٹا ہوں جس نے مشرکین کی ناکوں پر ضرب لگائی ، یہاں تک کہ انہوں نے لاالٰہ الا اللّٰہ پڑھ لیا (اس سے مراد امیر المومنین علیؑ ہیں ۔ بحار الانوار جلد ۴۵ ص ۱۳۸) زیر بحث آیت کی طرف توجہ کرتے ہُوئے خدا کہتا ہے ہم اس کی خرطوم پر علامت لگائیں گے یہ تعبیر ایک عمدہ معنی رکھتی اور بتاتی ہے کہ خدا کا یہ ارادہ اس کے مخصوص بندہ علیؑ کے ہاتھ سے پورا ہُوا۔

۱ : ایک حدیث میں رسولِ خدا سے آیا ہے :

"الا انبئکم بشرارکم قالوا بلیٰ یارسول اللہ (ص) قال : المشاؤن بالنمیمة المفرقون بین الاحبة الباغون للبرءاء المعایب"۔

"کیا میں تمھیں تمھارے شریرترین افراد کے بارے میں خبر دوں؟ انہوں نے کہا جی ہاں! اے رسولِ خدا! فرمایا : وہ لوگ جو بہت زیادہ چغلخور ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں اور پاکیزہ اور بے گناہ افراد میں عیوب کی جستجو میں لگے رہتے ہیں"۔ [1]

۲ : پیغمبرؐ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ وصیّت کیا کرتے اور فرماتے تھے :

لا یبلغنی احد عن احد من اصحابی شیئًا فانی احب ان اخرج الیکم و انا سلیم الصدر"۔

"تم میں سے کوئی بھی شخص میرے اصحاب میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ایسی بات نہ کرے جو مجھے اس کی نسبت بدظن کر دے، کیونکہ میں دوست رکھتا ہوں کہ پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ تم سے ملا کروں"۔ [2]

۳ : نیز ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

"لا یدخل الجنة جواظ، ولا جعظری، ولا عتل زنیم"۔

"تین گروہ جنّت میں داخل نہیں ہوں گے۔ "جواظ"، "جعظری" اور "عتل زنیم"۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا "جواظ" کون ہے؟ فرمایا : "کل جماع مناع" ہر وہ شخص جو زیادہ مال جمع کرتا ہے، اور دوسروں سے بخل کرتا ہے۔ میں نے پوچھا : جعظری کون ہے؟ فرمایا : سخت مزاج اور تندخو۔ میں نے پوچھا : 'عتل زنیم' کون ہے؟ فرمایا : شکم پرور اور بد اخلاق لوگ جو زیادہ کھاتے زیادہ پہنتے اور بیدادگر اور ظالم ہیں"۔ [3]

۲ : مداھنہ اورسازگاری

وہ واضح اختلافات جو راہ حق کے راہرووں اور سیاسی بازی گروں کے درمیان موجود ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دوسرا گروہ کسی خاص اصول پر ثابت قدم نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ ان امتیازات کے مقابلہ میں جو ان کو حاصل ہیں کچھ اور امتیازات حاصل کریں اور اپنے اصول

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب النمیمہ حدیث ۱

[2] سنن ابوداؤد و صحیح ترمذی (مطابق نقل فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۳۰)

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۴

سے کچھ منافع کی خاطر، صَرفِ نظر کرلیں۔ ان کے اہداف وعقاید ان کیلئے کوئی مقدّس چیز نہیں ہیں، اور وہ ہمیشہ ان کی قیمت پر معاملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک اوپر والی آیت کا مضمون ہے جو کہتی ہے: (ودّوا لو تدھن فیدھنون) وہ دوست رکھتے ہیں کہ تجھے بھی اپنے جتھے میں کھینچ لیں اور جس طرح وہ مداہنت اور معاملہ کرتے ہیں، تو بھی کرے۔"

لیکن پہلا گروہ ہرگز معاملہ گر نہیں ہوتا، وہ اپنے مقدّس اہداف کو کسی بھی قیمت پر اپنے ہاتھ سے نہیں دیتے اور اس پر معاملہ نہیں کرتے۔ مداہنت و موافقت اور اس قسم کے سیاسی لین دین ان میں نہیں ہوتے۔ یہ ایک بہترین نشانی ہے جس سے پیشہ ور سیاست بازوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور انھیں مردانِ خدا سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

❖ ❖ ❖

(۱۷) إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا
لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۙ

(۱۸) وَلَا يَسْتَثْنُونَ ○

(۱۹) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُونَ ○

(۲۰) فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۙ

(۲۱) فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۙ

(۲۲) أَنِ اغْدُوا عَلٰى حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صٰرِمِينَ ○

(۲۳) فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخٰفَتُونَ ۙ

(۲۴) أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ۙ

(۲۵) وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِينَ ○

ترجمہ

(۱۷) ہم نے انھیں آزمایا جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت (حاجتمندوں کی نگاہوں سے بچاکر) چُنیں گے۔

(۱۸) اور اس میں کسی چیز کا استثناء نہ کریں گے۔

(۱۹) لیکن ان کے سارے باغ پر (راتوں رات) ایک گھیر لینے والا عذاب نازل ہوگیا جبکہ وہ سورہے تھے

(۲۰) اور وہ ہرا بھرا باغ تاریک رات کی مانند ہوگیا۔

(۲۱) صبح کے وقت انھوں نے ایک دوسرے کو صدا دی۔

(۲۲) اگر تمھارا ارادہ پھلوں کو توڑنے کا ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔

(۲۳) وہ چل پڑے اور ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہتے جاتے تھے۔

(۲۴) اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمھارے پاس نہ آنے پائے۔

(۲۵) انھوں نے صبح کے وقت یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حاجت مندوں کو روکیں گے۔

تفسیر

باغ والوں کی عبرت انگیز داستان

اس بحث کی مناسبت سے جو گزشتہ آیات میں مغرور و خود خواہ دولت مندوں کے بارے میں تھی اور وہ مال اور اولاد کی زیادتی کی وجہ سے ہر چیز ٹھکرا دیتے تھے، ان آیات میں پہلے زمانہ کے کچھ دولتمندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز و شاداب باغ کے مالک تھے اور آخر کار وہ خودسری کی بناء پر نابود ہو گئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور و معروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے انھیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی"۔ (انّا بلوناهم كما بلونا اصحاب الجنة)۔

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعاء کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کی سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن مشہور یمن ہی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے

لیا کرتا اور باقی مستحقین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا۔ لیکن جب اس نے دُنیا سے آنکھ بند کر لی (اور مرگیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال و اطفال زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے۔ اس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے محرُوم کر دیں۔ لہٰذا ان کی سرنوشت وُہی ہوئی جو ان آیات میں بیان ہوئی۔

کہتا ہے: "ہم نے انھیں آزمایا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں بچا کر چنیں گے۔" (اذ اقسموا لیصرمنّھا مصبحین)۔[1]

"اور اس میں کبھی قسم کا استثناء نہ کرینگے اور حاجت مندوں کے لیے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں۔" (ولا یستثنون)۔

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے بخل اور ضعفِ ایمان کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو، اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ حاجت مندوں کے لیے مخصوص کر سکتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عدم استثناء سے مُراد یہ ہے کہ انھوں نے "الا ان یشاء اللہ" نہیں کہا تھا۔ یعنی وہ اس قدر مغرور تھے کہ انھوں نے کہا ہم جائیں گے اور یہ کام ضرور کریں گے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو انشاء اللہ کہنے سے بھی بے نیاز سمجھا لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔[2]

اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "رات کے وقت جبکہ وہ سوئے ہوئے تھے، تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہوگیا۔" (فطاف علیھا طائف من ربک وھم نائمون)۔

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مُسلط ہُوئی کہ وہ سرسبز و شاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہوگیا اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔" (فاصبحت کالصریم)۔

"طائف" "طواف" کے مادہ سے اصل میں اس شخص کے معنی میں ہے جو کسی چیز کے گرد گھومے لیکن بعض اوقات اس بلا و مصیبت سے کنایہ ہوتا ہے جو رات کو نمُودار ہو اور اس جگہ یہی مُراد ہے۔

"صریم" "صرم" کے مادّہ سے قطع کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں "تاریک رات" یا "پھل کے بغیر درخت" یا "سیاہ راکھ" کے معنی میں ہے۔ کیونکہ رات دن کے آجانے سے منقطع ہو جاتی ہے، جیسا کہ دن

---

[1] یصرمن' 'صرم' (بروزن شرم) کے مادہ سے پھل توڑنے کے معنی میں ہے اور مطلق طور پر قطع کرنے کے معنی میں بھی ہے۔ اسی طرح کام کو محکم کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[2] کیونکہ خاص مناسبت کے علاوہ، جو پہلا معنی اصل قصّہ کے ساتھ رکھتا ہے، اگر دوسرا معنی مراد ہوتا تو ولا یستثنون کے بجائے "ولم تستثنوا" کہا جاتا۔ (غور کیجیے)

رات کے آجانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات رات اور دن کو 'صریمان' کہتے ہیں۔ بہرحال مُراد یہ ہے کہ یہ آسمانی بلا جو ظاہرًا ایک عظیم 'صاعقہ' (بجلی) تھی، اس طرح سے اس باغ پر نازل ہوئی کہ جس نے سارے باغ کو ایک ساتھ آگ لگا دی اور مٹھی بھر کوئلوں اور سیاہ راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا، کیونکہ صاعقے اور بجلیاں جب بھی کسی چیز پر پڑتی ہیں تو ان کا حال اِسی طرح کا ہو جاتا ہے۔

❖ ❖ ❖

بہرحال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ لدے پھندے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لیے جائیں: "صبح ہوتے ہی ایک دُوسرے کو پکارا۔" (فتنادوا مُصبحین)[1]

❖ ❖ ❖

اُنھوں نے کہا: "اگر تم اپنے باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔" (ان اغدوا علی حرثکم ان کنتم صارمین)۔

"اغدوا"۔ "غدوۃ" کے مادّہ سے دن کے اوّل حصّہ کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اس غذا کو جو صبح سویرے کھائی جاتی ہے۔ غذا (ناشتہ) کہتے ہیں۔ (اگرچہ عربی کے موجودہ روزمرّہ کی تعبیرات میں غداء دن کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔)

❖ ❖ ❖

"اِسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔" (فانطلقوا وھم یتخافتون)۔

"کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمھارے پاس نہ آنے پائے۔" (ان لا یدخلنھا الیوم علیکم مسکین)۔

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہو جائے اور بچے کھچے پھل چننے کے لیے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آجائے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے سابقہ نیک اعمال کی بناء پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے انتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصّہ انھیں بھی ملے۔ اسی لیے یہ بخیل اور ناخلف بیٹے اس طرح سے مخفی طور پر چلے کہ کسی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آپہنچا ہے، اور

---

[1] "تنادوا" راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "نداء" (بروزن عنا) اصل میں "ندی" سے لیا گیا ہے جو رطوبت کے معنی میں ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ جن لوگوں کے منہ میں کافی رطوبت ہوتی ہے وہ آرام اور سکون سے گفتگو کر سکتے ہیں اور ان کا کلام فصیح اور آواز صاف ہوتی ہے۔

جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

ٌ ٌ ٌ

"اس طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لیے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔" (وغدوا علیٰ حرد قادرین)۔

"حرد" (بروزن سرد) شدت وغضب سے توأم ممانعت کے معنی میں ہے۔ ہاں! وہ فقراء و مساکین کی تمنا اور انتظار سے بیخ پا تھے اور پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ پوری قوت کے ساتھ انھیں منع کریں گے۔ (اسی لیے یہ تعبیر ان سالوں کے لیے کہ جن میں بارش نہ ہو یا اس اونٹنی کے لیے جس کا دودھ ختم ہو جائے استعمال ہوتی ہے۔)

اب دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

ٌ ٌ ٌ

۲۶ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ

۲۷ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝

۲۸ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝

۲۹ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

۳۰ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝

۳۱ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝

۳۲ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى
رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝

۳۳ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶ (جب باغ میں وارد ہوئے اور) اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔

۲۷ (ہاں ہر چیز مکمل طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے) بلکہ ہم محروم ہیں۔

(۲۸) اُن میں سے ایک (جو سب سے زیادہ عقلمند تھا) اس نے کہا: کیا میں نے تم سے یہ
کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟

(۲۹) انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک و پاکیزہ اور منزّہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم تھے۔

(۳۰) پھر انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے

(۳۱) (اور ان کی فریاد بلند ہوئی) اور کہا: وائے ہو ہم پر ہم ہی طغیانگر اور سرکش تھے۔

(۳۲) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں بخش دے اور اِس کے بجائے اس سے بہتر
دے دے، کیونکہ اب ہم نے اس سے دل لگا لیا ہے۔

(۳۳) خدا کا عذاب (دنیا میں) اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ جانتے تو آخرت کا عذاب
اس سے بھی بڑا ہے۔

تفسیر

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

یہ آیات انھیں باغ والوں کی داستان کو جاری رکھے ہُوئے ہیں۔ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ وہ باغ والے اس اُمید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چُنیں اور مساکین کی نظریں بچا کر اسے جمع کر لیں اور یہ سب کچھ اپنے لیے خاص کر لیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے۔ یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگبار صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کر دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: "جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہُوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔" (فلما رأوھا قالوا انا لضالّون)۔

"ضالون" سے مُراد ممکن ہے باغ کا راستہ بھول جانا ہو جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، یا راہِ حق کو بھول جانا اور گمراہ ہو جانا ہو جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

پھر انھوں نے مزید کہا: "بلکہ ہم توحقیقت میں محروم ہیں" (بل نحن محرومون)۔
ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم توخود سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں، مادی منافع سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہِ خدا میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں کو دینے سے ہمارے ہاتھ آتیں۔

ٌ ٌ ٌ

"اِس اثنا میں ان میں سے ایک جوسب سے زیادہ عقلمند تھا،اس نے کہا "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھاکہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے" (قال اوسطھم الم اقل لکم لولا تسبحون)۔
کیا میں نے نہیں کہا تھاکہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت کا شکر بجا لاؤ اور حاجت مندوں کو اپنے اموال سے بہرہ مند کرو! لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سُنا اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔
اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مردمومن تھا جو انھیں بخل اورحرص سے منع کیا کرتا تھا۔ چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہٰذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا۔ لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی زبان کھل گئی۔ اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہو گئی۔ اور وہ انھیں مسلسل ملامت اور سرزنش کرتا رہا۔

ٌ ٌ ٌ

وہ بھی ایک لمحہ کے لیے بیدار ہو گئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا: "انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک اور منزہ ہے۔ یقیناً ہم ہی ظالم وستمگر تھے۔ ہم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور دوسروں پر بھی" (قالوا سبحان ربنا اناکنا ظالمین)۔
"اوسط" کی تعبیر جوگزشتہ آیت میں آئی ہے، اس شخص کے معنی میں ہے جوعقل وخرد اورعلم و دانش کے اعتبار سے سرحدِ اعتدال میں ہو، بعض نے اسے سن وسال میں حدِ وسط کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ معنی بہت بعید نظرآتا ہے۔ کیونکہ سن وسال اور اس قسم کی پُرمعنی گفتگو کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ البتہ عقل وخرد اور اس قسم کی باتوں کے درمیان ارتباط ہے۔
"لولا تسبحون" (تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ تمام نیک اعمال کا ریشہ اور اصل، ایمان، معرفتِ خدا اور تسبیح وتنزایہ خدا ہے۔
بعض نے تسبیح خدا کا معنی شکر نعمت کیا ہے، جس کا لازمہ محروموں کو بہرہ مند کرنا اور فائدہ پہنچانا ہے، لیکن یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور آیت کے مفہوم میں جمع ہیں۔
لیکن گناہ کے اعتراف سے پہلے ان کی تسبیح ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ وہ یہ چاہتے ہوں کہ یہ بلائے عظیم

جو ان کے باغ پر نازل ہوئی اور جس نے اسے نابود کردیا ہے خدا کو اس میں ہر قسم کے ظلم وستم سے منزہ سمجھیں اور یہ کہیں کہ خداوندا یہ ہم ہی تھے جنہوں نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر ظلم کیا، اور اس قسم کے دردناک عذاب کے مستحق ہوئے ہیں، لیکن تیرا کام عین عدالت وحکمت ہے۔

قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی اپنے ظلم کا اقرار کرنے سے پہلے یہی تسبیح نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت یونس کی داستان میں آیا ہے۔ جب وہ اس عظیم مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو کہا: لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین: تیرے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو منزہ ہے میں ہی ظالموں اور ستمگروں میں سے تھا۔" (انبیاء، ۸۷)

البتہ اس عظیم پیغمبرؑ کے بارے میں ظلم ترک اولیٰ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۱۳ میں ہم اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

ٍ ٍ ٍ

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہو گیا: " انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت و سرزنش کرنے لگے۔ (فاقبل بعضهم علٰی بعض یتلاومون)۔

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کو سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے! ورنہ ہم خدا اور عدالت سے اس قدر بیگانہ نہیں تھے۔

ہاں! تمام ظالموں کی سرنوشت کہ جو عذاب الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوتے ہیں، اسی طرح ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنے کے باوجود ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بدبختی کا عامل دوسرے کو شمار کرے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس قسم کے مواقع پر ایک آدمی تجویز پیش کرتا ہے، دوسرا تائید کرتا ہے، تیسرا اس کا اجراء اپنے ذمہ لیتا ہے اور چوتھا اپنے سکوت اور خاموشی کے ذریعے اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کے سب شریکِ جُرم اور گناہ میں پورا پورا دخل رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہاء سے آگاہ ہوئے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے کہا: "وائے ہو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔" (قالوا یاویلنا انا کنا طاغین)۔

انھوں نے پہلے مرحلہ میں تو ظلم وستم کا اعتراف کیا اور یہاں طغیان وسرکشی کا اعتراف ہے۔ حقیقت میں طغیان ظلم سے بالاتر ایک مرحلہ ہے، کیونکہ ظالم ممکن ہے اصل قانون کو قبول کرے لیکن ہوائے نفس کے زیر اثر ہو کر ظلم وستم کرے۔ لیکن طغیان کرنے والا تو اصلاً قانون کے زیر بار ہی نہیں ہوتا اور اسے قانون کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ظلم تو "اپنے اوپر ظلم کرنے" کی طرف اشارہ ہو اور طغیان "دوسروں کے حق میں تجاوز کرنے" کی طرف اشارہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ عرب جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے یا کسی چیز سے نفرت کا اظہار کرنا چاہتے تھے تو کبھی "ویس" کہتے تھے اور کبھی 'ویح' اور کبھی 'ویل' جن میں سے پہلا مصیبت میں خفیف، دوسرا زیادہ شدید اور تیسرا سب سے زیادہ شدید ہے اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ باغ والے اپنے آپ کو شدید ترین سرزنش کا مستحق سمجھتے تھے۔

٭ ٭ ٭

انجام کار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف مراجعہ کیا اور کہا۔ "اُمید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے گا۔" (عسیٰ ربنا ان یبدلنا خیرًا منہا)۔

"کیونکہ ہم نے اس کی طرف رُخ کر لیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگالی ہے۔ لہٰذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں۔" (انا الیٰ ربنا راغبون)۔[1]

کیا یہ گروہ واقعًا اپنے فعل پر پشیمان ہوگیا تھا، اس نے اپنے طرزِ عمل میں تجدیدِ نظر کر لی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؟ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہو جاتے ہیں، لیکن جب عذاب ختم ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ انھیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اِس بارے میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعد والی آیت کے لب و لہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے جمع نہ ہونے کی بنا پر قبول نہیں ہوئی۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ اُنھوں نے خلوصِ نیّت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیا جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوں والے انگور کے پُرمیوہ درخت تھے۔

٭ ٭ ٭

آخری زیرِ بحث آیت میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کے لیے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: "خدا کا عذاب اس طرح کا ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے۔" (کذٰلک العذاب ولعذاب الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون)۔

اگر تم بھی مال و ثروت اور مادی وسائل کی بنا پر مست و مغرور ہو گئے، ذخیرہ طلبی کی رُوح نے تم پر غلبہ کر لیا، ہر چیز کو اپنے لیے ہی طلب کرنے لگو اور حاجت مندوں کو محروم کر دو تو تمھاری سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں،

---

[1] "راغبون"۔ "رغبت" کے مادہ سے ہے۔ یہ مادہ جب 'الیٰ' یا 'فی' کے ساتھ متعدّی ہوتا ہے تو کسی چیز کی طرف تمایل کے معنی دیتا ہے۔ جب 'عن' کے ساتھ متعدّی ہوتا ہے کسی چیز سے انصراف اور بے اعتنائی کے معنی میں ہوتا ہے

ہوگی۔ البتہ وہ ایک روز تھا کہ صاعقہ (بجلی) آئی اور اس نے اس باغ کو آگ لگادی۔ آج ممکن ہے کچھ اور آف
ہوں یا گھروں اور آبادیوں کو جلا دینے والی علاقائی یا عالمی جنگیں ان نعمتوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

* * *

چند نکات

۱: انحصار طلبی: ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت

انسان خواہ نخواہ مالِ دُنیا سے لگاؤ رکھتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا گزارہ اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ا
لگاؤ اعتدال کی حد میں مذموم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ضرورت مندوں کو بھی اپنے اموال میں شریک کرے
صرف الٰہی حقوقِ واجبہ کو ادا کرے بلکہ مستحب انفاق سے بھی ہاتھ نہ روکے۔

خصوصًا باغ اور زراعت کے بارے میں اسلامی روایات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حاضر آنے والے ضرورتمند
کو ایک حصّہ دیں، جو آیۂ شریفہ (وآتوا حقہ یوم حصادہ) اس کا حق فصل کاٹنے کے وقت دے دو، (انعام ا
سے اقتباس کرتے ہوئے حق الحصاد کے عنوان سے مشہور ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا حق ہے جو زکوٰۃِ معروف
حق سے الگ ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جو پھل توڑنے یا زراعت کاٹنے کے موقع پر حاضر آنے والے ضرورتمند
کو دی جاتی ہے اور اس کی کوئی حد معیّن نہیں ہے۔ [۱]

لیکن جب مال و ثروت سے لگاؤ افراط اور انحراف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو انحصار طلبی کی صورت اختیار کر
ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود وہ یہ چاہتا ہے کہ دُوسرے اس
سے محروم رہیں۔ یہ وہ عظیم مصیبت ہے خصوصیّت کے ساتھ جس کے آج بھی انسانی معاشروں میں بہت سے نمو
موجود ہیں اور اس کو ایک قسم کی خطرناک بیماری شمار کیا جا سکتا ہے۔

باغ والوں کی داستان جو اوپر والی آیات میں بیان کی گئی ہے ثروت مندوں کے ایک گروہ کے انحصار
طلبی کے جذبہ کی واضح طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔ یعنی وہ کس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں
ضرورت مندوں کے محروم کرنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ اور ان کی نظریں سجا کر عظیم منافع اور بڑے بڑے فوائد
حاصل کرتے ہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان محروموں کی آہ جلانے والی بجلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ان
انحصار طلب ثروت مندوں کے خرمن زندگی کو آگ لگا دیتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ بجلیاں انقلابوں کی صورت میں
ظاہر ہوتی ہیں اور جس چیز کو وہ باور نہیں کرتے تھے اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی آہ و فریاد آسمان

---

[۱] اس موضوع سے مربوط روایات کا وسائل الشیعہ کی جلد ۶ ابواب زکوٰۃ الغلات باب ۱۳ میں اور سنن بیہقی جلد ۴ ص ۱۳۳ میں مطالعہ فرمائیں۔

یک بلند ہوتی ہے اور وہ گزشتہ خطاؤں اور گناہوں سے توبہ اور تلافی کا دم بھرتے ہیں لیکن معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

۲ : گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ

اوپر والی آیات سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور قطع رزق کے درمیان قریبی رابطہ ہے ۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"ان الرجل لیذنب الذنب فیدرأ عنه الرزق وتلا هذه الأیة : اذاقسموا لیصرمنها مصبحین ولا یستثنون فطاف علیها طائف من ربك وهم نائمون۔

"بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے تو اس کی روزی منقطع ہو جاتی ہے۔اس کے بعد امام نے اوپر والی آیات کی تلاوت کی"۔

"جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح سویرے پھلوں کو توڑ لیں گے اور اپنے سوا کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے، لیکن اس وقت کہ جب وہ سوئے ہوئے تھے تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر مسلط ہوگئی اور اسے نابود کر دیا"۔ [1]

ابن عباس سے بھی یہ نقل ہوا ہے کہ گناہ اور روزی کے منقطع ہونے کا ربط سورج سے بھی زیادہ واضح ہے جیسا کہ خدا نے اسے سورۂ ن والقلم کی زیر بحث آیت میں بیان فرمایا ہے۔ [2]

٭ ٭ ٭

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۵ (حدیث ۴۴)

[2] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۳۷

۳۴ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○
۳۵ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ○
۳۶ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○
۳۷ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ○
۳۸ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ○
۳۹ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ○
۴۰ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ○
۴۱ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَ
صٰدِقِيْنَ ○

ترجمہ

۳۴ پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنّت کے پُرنعمت باغات ہیں۔

۳۵ کیا ہم مومنین کو مجرمین کی طرح قرار دے دیں؟

۳۶ تمھیں کیا ہوگیا ہے تم کس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟

۳۷ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس پڑھتے ہو؟

۳۸ کیا جسے تم انتخاب کرتے ہو وہ تمھارے لیے مخصوص ہے؟

۳۹ یا تم نے قیامت کے دن تک کے لیے کوئی تاکیدی عہدو پیمان لے لیا ہے کہ جو کچھ تم اپنے نفع کے لیے اختیار کرو گے وہ اسے تمھارے لیے قرار دے دے گا؟

۴۰ ان سے پوچھ لیجئے ان میں سے کون اس قسم کی چیز کی ضمانت لیتا ہے؟

۴۱ یا ان کے ایسے معبود ہیں (جنھیں انھوں نے خدا کا شریک قرار دیا ہے) اور وہ ان کے لیے شفاعت کرتے ہیں۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اپنے معبودوں کو سامنے لائیں۔

تفسیر

مکمّل بازپرس

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی روش اور طریقہ یہ ہے کہ بُروں اور اچھوں کے حالاتِ زندگی کو ایک دوسرے کے مقابل لاتا ہے تاکہ ایک دُوسرے کے ساتھ موازنہ میں بہتر طور پر پہچانے جائیں۔ یہ طریقہ تربیتی لحاظ سے بہُت ہی مُؤثر ہے۔

اسی روش کے مُطابق "اصحاب الجنّۃ" (سرسبزو شاداب باغ والوں) دردناک سرنوشت کے ذکر کے بعد، جو گزشتہ آیات میں گزری ہے، پرہیزگاروں کا حال بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنّت کے پُرنعمت باغ ہیں" (ان للمتقین عند ربھم جنات النعیم)۔

جنّت کے ایسے باغات جن میں ہر وہ نعمت جس کا تصوّر کیا جائے، اس کی کامل ترین نوع موجُود ہے۔ اِس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی ہوں گی جو کسی انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔

چونکہ مشرکین اور ثروت مندوں کی ایک جماعت خود خواہ تھی، جن کا دعوٰی یہ تھا کہ جس طرح دنیا میں ہماری حالت بہتر اور اعلیٰ ہے اسی طرح قیامت میں بھی بہت اچھی ہوگی۔ خدا نے بعد والی آیت میں ان کا شدّت کے ساتھ مؤاخذہ کیا ہے کہ فرماتا ہے: "کیا ہم مومنین کو جو حق و عدالت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں،

مشرکین اور مجرمین کی مانند قرار دیں گے۔" (افنجعل المسلمین کالمجرمین)۔

٭ ٭ ٭

"تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ یہ تم کس طرح کے فیصلے کرتے ہو۔" ؟ (مالکم کیف تحکمون)۔

کیا کوئی عقلمند انسان یہ باور کرلے گا کہ عادل وظالم، مطیع ومجرم، ایثار گر اور انحصار طلب کی سرنوشت ایک جیسی ہو گی ؟ وہ بھی اس خدا کی بارگاہ میں جس کے سارے کام بچے تلے اور حکیمانہ نظام کے ماتحت ہوتے ہیں۔

سورہ حٰم سجدہ کی (آیت ۵۰) میں بھی اسی قسم کے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (و لئن اذقناہ رحمۃ منا من بعد ضراء مستہ لیقولن ھذا لی وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنٰی)۔

جب ہم اسے اپنی طرف سے تکلیف و پریشانی کے بعد رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: یہ میری شائستگی اور استحقاق کی بناء پر تھا اور میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی قیامت برپا ہو گی۔ اگر بالفرض قیامت ہوئی بھی تو جس وقت میں اپنے پروردگار کے پاس لوٹوں گا تو میرے لیے اس کے پاس اچھے اجر اور اچھے بدلے ہی ہوں گے۔ ہاں یہ خود پسند اور مغرور گروہ دنیا و آخرت کو اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اگر عقل وخرد نے اس قسم کے حکم میں تمھاری رہنمائی نہیں کی ہے تو کیا اس پر کوئی "نقلی" دلیل تمھارے پاس ہے؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس لیتے ہو؟" (ام لکم کتاب فیہ تدرسون)۔

"کہ جسے تم انتخاب کرتے ہو اور اس کی طرف میلان رکھتے ہو وہ تمھارے لیے مخصوص ہے۔" (ان لکم فیہ لما تخیرون) [1]

تم یہ توقع رکھتے ہو کہ تم جیسے مجرم بھی مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ جس کا نہ عقل حکم کرتی ہے اور نہ ہی کسی معتبر کتاب میں آئی ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں بات کو اس طرح جاری رکھے ہوئے ہے:

"اگر تمھارے پاس عقل ونقل سے کوئی مدرک اپنے دعوے کے لیے نہیں ہے تو کیا تم نے کوئی تاکیدی

---

[1] "ان لکم"... کا جملہ "تدرسون" کا مفعول ہے۔ قاعدہ کی رو سے ان کو ہمزہ کی زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے لیکن لام کی مناسبت سے جو "انّ" کے اسم کے اوپر آئی ہے "انّ" زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے کیونکہ فعل عمل کرنے سے معلق ہو جاتا ہے۔

عہد و پیمان ہم سے لے لیا ہے جو قیامت تک برقرار رہے گا کہ تم جو کچھ بھی اپنے نفع میں فیصلہ کرلو، اسے وہ تمھارے لیے قرار دے دے گا۔" (ام لکم ایمان علینا بالغۃ الیٰ یوم القیامۃ ان لکم لما تحکمون)۔

کون شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے خدا سے یہ عہد و پیمان لے لیا ہے کہ وہ جو چاہیں گے خدا اسے تسلیم کرلے گا، جو مقام و منصب وہ چاہیں گے وہ بے چون وچرا ان کو دے دے گا؟ یہاں تک کہ مجرمین مسلمانوں کے ہم پلّہ ہو جائیں۔[۱]

٭ ٭ ٭

پھر انھیں سوالات کو جاری رکھتے ہوئے، جو ہر طرف سے ان پر راستوں کو بند کر رہے ہیں مزید کہتا ہے: "ان سے پوچھ لیجئے کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن ہے کہ مجرمین اور مومنین برابر ہیں یا جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا ان کے اختیار میں دے دے گا۔" (سلھم ایھم بذالک زعیم)۔

٭ ٭ ٭

آخری مرحلہ میں ان سے ایک عجیب سوال کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یا ان کے ایسے معبود ہیں جو خدا کے ہاں ان کی شفاعت و حمایت کریں گے۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو ان کو سامنے لائیں اور ان کا تعارف کرائیں۔" (ام لھم شرکاء فلیأتوا بشرکائھم ان کانوا صادقین)۔

کیا ان کے پاس کوئی معمولی سے معمولی دلیل ہے کہ یہ بے قدر و قیمت اور بے شعور جمادات خدا کے شریک ہیں اور اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں شرکاء کو شہداء (گواہوں) کے معنی میں لیا ہے۔

اس طرح اوپر والی آیات کے مجموعہ سے یکجائی طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انھیں اپنے مدّعا کو ثابت کرنے کے لیے، کہ وہ مومنین کے ہم پلّہ بلکہ ان سے افضل و برتر ہیں، چار میں سے کسی ایک وسیلہ کے ساتھ متمسک ہونا پڑے گا۔ یا عقل سے کوئی دلیل یا آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب، یا خدا کی طرف سے کوئی عہد و پیمان، یا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور گواہوں کی گواہی۔ چونکہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اس بناء پر مذکورہ دعویٰ کلی طور پر بے بنیاد اور بے قدر و قیمت ہے۔

---

[۱] "بالغۃ" کے لفظ کی تفسیر مؤکد کے معنی میں اور بعض نے جاری و مسلسل کے معنی میں کی ہے۔ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ اس بناء پر (الیٰ یوم القیامۃ) کا جار و مجرور اس کے متعلق ہے۔

و انه لذکرلك ولقومك : "قرآن تیرے اور تیری قوم کے لیے شرف اور آبرو کا موجب
لیکن جیسا کہ ہم نے مذکورہ آیت کے ذیل میں بھی کہا ہے کہ 'ذکر' وہاں بھی یاد آوری اور آگاہی بخشنے کے
ہے۔ نیز اصولی طور پر قرآن مجید کے ناموں میں سے ایک نام 'ذکر' ہے۔ اس بناء پر پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظ

ایک نکتہ

کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے؟

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض آنکھوں میں ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے۔ جب وہ کسی چ طرف توجہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ اُسے نابود کر دیں یا درہم برہم کر دیں اور اگر کوئی انسان ہے اسے بیمار یا دیوانہ کر دیں۔

یہ مسئلہ عقلی لحاظ سے کوئی امرِ محال نہیں ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ کے بہُت سے ماہرین کا نظریہ ہے آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی قوت چھپی ہوئی ہوتی ہے جو بہت سارے کام کرتی ہے۔ یہاں تک کے ذریعے اس کی پرورش ہو سکتی ہے۔ آنکھوں کی اسی مقناطیسی قوت کے ذریعہ دوسرے آدمی پر مقناطیسی طاری کی جاتی ہے۔

جس دنیا میں "لیزر شعاعیں" جو غیر مرئی ہیں، ایسا کام کر سکتی ہیں جو کسی انتہائی خطرناک اور تباہ کُن ہتھیار سے بھی نہیں ہو سکتا، تو بعض آنکھوں میں ایسی قوت کے وجود کو تسلیم کر لینا جو مخصوص لہروں کے ذریعے طرف مقابل اثر انداز ہو سکے، کوئی عجیب چیز نہیں ہو گی۔

بہت سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسے افراد دیکھے ہیں جو آنکھ کی ا مرموز توانائی کے حامل تھے، اور انھوں نے کچھ لوگوں، جانوروں یا پھر دوسری چیزوں کو اپنی آنکھوں کی اس طاقت سے بیکار کر دیا تھا۔

لہٰذا نہ صرف یہ کہ ان امور کے انکار پر اصرار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے وجود کے امکان کو عقل اور ع لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔

اِسلامی روایات میں بھی ایسی بہت سی مختلف تعبیریں نظر آتی ہیں جو اس امر کی اجمالاً تائید کرتی ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اسماء بنت عمیس نے پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا: "بعض اوقات جعفر بیٹوں کو نظر لگ جاتی ہے، کیا میں ان کے لیے "رقیہ" لے لوں۔ (رقیہ سے مراد وہ لکھی ہوئی دُعائیں ہیں، جو کچھ لوگ بُری نظر سے بچنے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اسے تعویز بھی کہتے ہیں)۔

پیغمبرؐ نے فرمایا:

"نعم، فلو کان شیء یسبق القدر لسبقة العین"

"ہاں! کوئی حرج نہیں ہے، اگر کوئی چیز قضاء و قدر پر سبقت لے سکتی ہے تو وہ نظرِ بد کا لگنا ہے"[1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"پیغمبرؐ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے لیے ایک تعویذ بنایا اور آپ نے یہ دعا پڑھی:

"اعیذ کما بکلمات التامة و اسماء الله الحسنیٰ کلها عامة، من شر السامة والهامة ومن شر کل عین لامة، ومن شر حاسد اذا حسد"

"میں تمھیں تمام کلمات اور خدا کے اسمائے حسنیٰ کے، موت، موذی جانوروں کے شر اور ہر بُری آنکھ اور حسد کرنے والے کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے، سپرد کرتا ہوں"

اس کے بعد پیغمبرؐ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا: حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کے لیے اسی طرح سے تعویذ بنایا تھا"[2]

نہج البلاغۃ میں بھی آیا ہے: "العین حق والرقی حق" نظرِ بد بھی حق ہے اور اس کے دفع کرنے کے لیے دعا و تعویذ سے متوسّل ہونا بھی حق ہے"[3]

اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ دعائیں اور وسیلے حکم خدا سے آنکھوں کی مرموز مقناطیسی قوت و توانائی کی تاثیر کو روک دیں، جیسا کہ دعائیں بہت سے دوسرے مخرب عوامل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انھیں خُدا کے حکم سے بے اثر کر دیتی ہیں۔

❊ ❊ ❊

یہ بات بھی یاد دلانی ضروری ہے کہ اجمالی طور سے نظرِ بد کی تاثیر کو قبول کرنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس قسم کے موارد میں بیہودہ کاموں اور عامیانہ اعمال کی پناہ لی جائے جو احکام شریعت کے برخلاف ہیں اور اصل موضوع میں بے خبر لوگوں کے شک و تردّد کا باعث بھی ہیں۔ جیسا کہ بہت سے حقائق کے ان خرافات کے ساتھ آلودہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۱

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۰

[3] نہج البلاغۃ کلمات قصار جملہ ۴۰۰ (یہ حدیث صحیح بخاری جلد ۷، ص ۱۷۰، باب العین حق میں بھی اس صورت میں نقل ہوئی ہے العین حق) "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی" میں یہی معنی مختلف منابع سے نقل ہوا ہے۔ (جلد ۴ ص ۴۵۱)

ہونے سے یہ غیر مطلوب تاثیر ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے۔

* * *

خداوندا! ہمیں شر اشرار اور دشمنوں کے مکروں سے اپنی پناہ میں محفوظ رکھ!

پروردگارا! ہمیں وہ صبر و استقامت مرحمت فرما جس کے سائے میں ہم تیری رضا کو حاصل کرسکیں۔

بارالٰہا! ہمیں اپنی بے پایاں نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مرحمت فرما، اس سے پہلے کہ ناشکریاں اسے ہم سے سلب کرلیں۔ آمین یا رب العالمین۔

سورۂ قلم کا اختتام

۲۸ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

ترجمہ کا اختتام

۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۸۷ء

بروز منگل بوقت صبح ساڑھے پانچ بجے

۸۱، ای، ماڈل ٹاؤن

لاہور

سورۂ

حاقّہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز

۲۸ر شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

سورۂ حاقہ کے مضامین

اِس سُورہ کے مباحث تین محوروں پر گردش کرتے ہیں :

پہلا محور : جو اس سورہ کی بحث کا اہم ترین موضوع ہے وہ قیامت سے مربُوط مسائل اور اس کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اسی لیے قیامت کے تین نام 'حاقہ'، 'قارعۃ' اور 'واقعہ' اس سورہ میں آئے ہیں۔

دُوسرا محور : وہ مباحث ہیں جو گزشتہ کافر اقوام خصوصاً قوم عاد، ثمود اور قوم فرعون کی سرنوشت کے بارے میں ہیں جو تمام کفار اور منکرین قیامت کے لیے قوی اور مُوکّد اندازوں پر مشتمل ہیں۔

تیسرا محور : وہ مباحث ہیں جو قرآن کی عظمت، پیغمبرؐ کے مقام نیز تکذیب کرنے والوں کی سزا اور عذاب کے بارے میں ہیں۔

❖ ❖ ❖

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرِ گرامیؐ سے آیا ہے :

"مَن قرأ سورۃ الحاقۃ حاسبہ اللّٰہ حسابًا یسیرًا"

"جو شخص سورہ حاقہ کی تلاوت کرے گا خدا قیامت میں اس کے حساب کو آسان کر دے گا۔" [1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"اکثروا من قرائۃ الحاقۃ، فان قرائتھا فی الفرائض والنوافل من الایمان باللّٰہ و رسولہ ولم یسلب قارئھا دینہ حتی یلقی اللّٰہ"

سُورہ حاقہ کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرو، کیونکہ فرائض و نوافل میں اس کی قرأت خدا اور اس کے رسُولؐ پر ایمان کی نشانی ہے، اور جو شخص اسے پڑھے گا اس کا دین محفوظ رہے گا، یہاں تک کہ لقاء اللہ پر پہنچ جائے۔[2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۲

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱ اَلۡحَآقَّةُ ۙ

۲ مَا الۡحَآقَّةُ ۚ

۳ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحَآقَّةُ ؕ

۴ كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَعَادٌۢ بِالۡقَارِعَةِ ‏

۵ فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِكُوۡا بِالطَّاغِيَةِ ‏

۶ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ

۷ سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ
حُسُوۡمًا ۙ فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ
اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ۚ

۸ فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ‏

❖ ❖ ❖

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

۱ وہ دن جو یقیناً واقع ہوگا۔

۲ اور یہ واقع ہونے والا دن کیا ہے؟

(۳) اور تجھے کیا معلوم کہ وہ واقع ہونے والا دن کیا ہے ؟

(۴) قوم ثمود و عاد نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا۔

(۵) تو قوم ثمود تو سرکش عذاب سے ہلاک ہوئی۔

(۶) اور قوم عاد طغیانی کرنے والی ٹھنڈی اور زور دار اور تیز آندھی سے ہلاک ہوئی۔

(۷) خدا نے بُنیادوں کو اُکھاڑنے والی اس تیز آندھی کو سات راتیں اور آٹھ دنوں تک پے در پے ان پر مُسلّط رکھا (اور اگر تو وہاں ہوتا) تو دیکھتا کہ وہ قوم بوسیدہ تنوں اور کھجور کے کھوکھلے درختوں کی مانند اس تیز آندھی کے درمیان زمین پر پڑی ہے اور ہلاک ہو گئی ہے۔

(۸) کیا ان میں سے تو کسی کو باقی دیکھتا ہے۔

٭ ٭ ٭

تفسیر

سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب

یہ سورۃ مسئلہ قیامت سے اور وہ بھی ایک نئے عُنوان کے ساتھ شروع ہوتا ہے، فرماتا ہے :

"وہ تحقق پانے والا دن" (الحاقۃ)۔

٭ ٭ ٭

"وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے۔" (ما الحاقۃ)۔[1]

٭ ٭ ٭

"اور تجھے کیا معلوم کہ وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے؟" (وما ادراٰک ما الحاقۃ)۔

تقریبًا تمام مفسّرین نے "حاقۃ" کی قیامت کے دن کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا دن ہے جو قطعی اور یقینی طور پر واقع ہو گا، جیسا کہ سورہ "واقعہ" میں "الواقعۃ" کی تعبیر ہے۔ یہی تعبیر اسی سورہ کی آیت ۱۶ میں بھی آئی ہے اور یہ سب اس عظیم دن کے یقینی ہونے کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

---

[1] اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے۔ "الحاقۃ" مبتداء ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

"ما الحاقۃ" کی تعبیر، اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں: فلاں شخص انسان ہے، کیا ہی انسان ہے؟ یعنی اس کی انسانیت کی تعریف و توصیف کے لیے کوئی حد نہیں ہے۔ (یعنی بہت اچھا انسان ہے)

❖ ❖ ❖

"ما ادراٰك ما الحاقۃ" کی تعبیر دوبارہ اس عظیم دن کے حوادث کی عظمت پر مزید تاکید ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر سے خطاب ہوتا ہے کہ تو نہیں جانتا وہ دن کس قسم کا ہے؟ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے حقائق کو درک کرنا ہم دنیاوی زنداں کے قیدیوں کے لیے امکان پذیر نہیں ہے، جیسا کہ دنیا سے مربُوط مسائل کا درک کرنا شکمِ مادر کے جنین کے لیے کسی بھی بیان سے میسّر نہیں ہے۔[1]

ایک اور احتمال جو ان آیات کی تفسیر میں ہے، اگرچہ بہت کم مفسّرین نے اسے قبول کیا ہے' یہ ہے کہ "الحاقۃ" ان عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو سرکش، طاغی، خود خواہ و خود پسند مجرموں کو اچانک اور ناگہانی طور پر اس دُنیا میں دامن گیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں "القارعۃ" بعض مفسّرین کے کلام میں اسی معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی تفسیر آئندہ والی آیات کے ساتھ جو قوم عاد، قومِ ثمود، قومِ فرعون اور قومِ لُوط کی سرکوبی کرنے والے عذابوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے۔ "الحاقۃ، الحذر بنزول العذاب"۔ جیسا کہ (سورۂ مؤمن کی آیت ۴۵ میں) آلِ فرعون کے بارے میں فرماتا ہے: وحاق باٰلِ فرعون سوء العذاب۔ بُرا عذاب آلِ فرعون پر نازل ہوا (اور اس نے انھیں گھیر لیا)[2]

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد ان قوموں کی سرنوشت کو بیان کرتا ہے جنھوں نے قیامت کے دن (یا دنیا میں عذابِ الٰہی کے نزول) کا انکار کیا۔ لہٰذا مزید کہتا ہے: "قوم عاد و ثمود نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا"۔ (کذبت ثمود وعاد بالقارعۃ)۔

❖ ❖ ❖

(بقیہ صفحہ سابقہ) اور ما استفہامیہ دوسرا مبتداء ہے۔ اس کے بعد والا "الحاقۃ" خبر ہے دوسرے مبتداء کی اور ان کا مجموعہ خبر ہے پہلے مبتداء کی۔

[1] بعض مفسّرین کا کہنا ہے کہ "ما ادراٰك" کا جملہ قرآن میں اس جگہ کہا گیا ہے جہاں مطلب معلوم اور مسلّم ہے۔ لیکن "وما یدریك" ان موارد میں آیا ہے جہاں مطلب نامعلوم ہے۔ (مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۳) بعض دوسرے مفسّرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۳۸۲۔

(توجہ رکھیں کہ "حاقۃ" اور "حاق" کا مادہ ایک ہی ہے۔)

"پس قوم ثمود تو سرکش عذاب کے ذریعہ ہلاک ہوئی" (فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ)۔
ثمود وہ قوم تھی جو حجاز و شام کے درمیان کوہستانی علاقہ میں آباد تھی۔ حضرت صالحؑ ان کی طرف مبعوث ہو[ئے] لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے اور ان سے مبارزہ کے لیے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت صالحؑ سے [کہا] کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ عذاب جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اسے نازل کر دے۔ اس وقت ایک تباہ کرنے والی بجلی ان پر مسلط ہو گئی جس نے چند لمحوں کے اندر ان کے مضبوط گھروں اور مستحکم محلوں میں لرزہ پیدا کر دیا۔ ان سب کو تہس نہس کر دیا اور ان کے بے جان جسم زمین پر پڑے رہ گئے۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس نافرمان قوم کی نابودی کے عامل کو سرکش عذاب شمار کرتا ہے۔" الطاغیۃ" اور یہ سرکش عذاب سورہ اعراف کی آیت ۷۸ میں "رجفۃ" (زلزلہ) کے عنوان سے ذکر ہوا۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۳ میں "صاعقۃ" اور سورہ ہود کی آیت ۶۷ میں "صیحۃ" کے نام سے مذکور ہے۔ یہ سب الفاظ حقیقت میں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ صاعقہ (بجلی) ہمیشہ ایک مہیب آواز کے ساتھ ہوتی ہے (کڑکتی ہے) جس جگہ آ کر گرتی ہے اس میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ سرکش عذاب بھی ہے۔[1]
اس کے بعد قوم عاد کی سرنوشت بیان کرتا ہے۔ وہ قوم جو سرزمینِ احقاف (جزیرہ نمائے عرب یا یمن) میں آباد تھے ان کے قد و قامت طویل، بدن قوی، شہر آباد، زمینیں سرسبز و شاداب اور ہرے بھرے باغات تھے۔ ان کے پیغمبر حضرت ہودؑ تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنے طغیان و سرکشی کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ خدا نے ایسے دردناک عذاب کے ساتھ جس کی تشریح انھیں آیات میں آئی ہے، ان کی زندگی کے دفتر کو لپیٹ دیا۔ پہلے فرماتا ہے: "باقی رہی قوم عاد تو وہ ایک تیز، سرکش، زناٹے دار، اونچی آواز والی سرد اور زہریلی آندھی کے ذریعہ ہلاک ہو گئی" (و اما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ)۔
"صرصر" (بروزن دفتر) سرد یا زناٹے دار آواز والی یا زہریلی ہواؤں کو کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ تینوں معانی ذکر کیے ہیں، اور ان کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔
"عاتیۃ" "عتو" (بروزن غلو) کے مادہ سے سرکش کے معنی میں ہے۔ البتہ فرمانِ خدا سے سرکش نہیں بلکہ معمولی اور سبک رفتار ہواؤں کے معیار سے سرکش۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس تیز سرکوبی کرنے والی آندھی کی ایک دوسری توصیف کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا نے اس کو اس قوم پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان کی بنیادیں اکھاڑنے کے لیے مسلط کیے رکھا": (سخرھا علیھم سبع لیال وثمانیۃ ایام حسومًا)۔

---

[1] قوم ثمود کی سرگزشت تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

حُسومًا۔ حُسم (بروزن اسم) کے مادہ سے کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر تلوار کو حسام (بروزن غلام) کہا جاتا ہے تو وہ اسی مُناسبت سے ہے۔ بعض اوقات زخم کی جڑ کو جلانے کے لیے اس پر داغ لگانے کو بھی حسم کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ سخت آندھی نے سات راتوں اور آٹھ دنوں میں اس عظیم قوم کی وسیع اور بارونق زندگی کو یکسر تباہ و برباد کیا، اور ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پراگندہ کر دیا۔[1]

نتیجہ وہ ہوا کہ قرآن کہتا ہے: "اگر تو وہاں ہوتا تو مشاہدہ کرتا کہ وہ ساری کی ساری قوم منہ کے بَل گری پڑی ہے۔" (فترى القوم فيها صرعىٰ كانهم اعجاز نخل خاوية)۔

کتنی عمدہ تشبیہ ہے، جو ان کے طویل قد و قامت کو بھی مشخص کرتی ہے، ان کے جڑ سے اکھڑ جانے کو بھی ظاہر کرتی ہے اور خُدا کے عذاب کے مقابلہ میں ان کے اندر سے خالی ہونے کو بھی بیان کرتی ہے، اِس طرح کہ وہ تیز آندھی جدھر چاہتی ہے انھیں آسانی کے ساتھ لے جاتی ہے۔

"خاویۃ"۔ "خواء" (بروزن ہواء) کے مادہ سے اصل میں خالی ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر بھوکے شکموں، (زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عقیدے کے مطابق) بارش سے خالی ستاروں اور بے مغز اخروٹ کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا تم ان میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو؟" (فهل ترىٰ لهم من باقية)۔[2]

ہاں! آج نہ صرف قوم عاد کا کوئی نام ونشان باقی نہیں بلکہ ان کے آباد شہروں اور پُرشکوہ عمارتوں کے کھنڈرات اور ان کے سرسبز کھیتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

قوم عاد کی سرگزشت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورۃ ہودؑ کی آیت ۵۸ تا ۶۰ اور اسی طرح جلد ۱۱ میں بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔)

❖ ❖ ❖

---

[1] توجہ رہے کہ حسومًا، سبع ليال وثمانية ايام (سات راتیں اور آٹھ دن) کی صفت ہے اور بعض نے اسے ریح سے حال یا مفعول لہ سمجھا ہے۔

[2] باقیۃ ایک مقدر موصوف کی صفت ہے اور اصل میں "نفس باقیۃ" ہے۔

(۹) وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ
بِالْخَاطِئَةِ ۚ
(۱۰) فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝
(۱۱) اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝
(۱۲) لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝

ترجمہ

(۹) اور فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔

(۱۰) انھوں نے اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کی اور خدا نے بھی انھیں شدید عذاب میں گرفتار کیا۔

(۱۱) ہم نے اس وقت، جب پانی میں طغیانی آئی، تو تمھیں کشتی میں سوار کر دیا۔

(۱۲) تاکہ ہم اسے تمھارے لیے تو تذکّر کا وسیلہ قرار دیں اور سننے والے کان اسے یاد رکھتے ہیں

تفسیر

سننے والے کان کہاں ہیں؟

قوم عاد و ثمود کی سرگزشت کے ایک گوشہ کو بیان کرنے کے بعد دوسری اقوام جیسے قوم نوح اور قوم لُوط کی طرف

توجہ کرتا ہے تاکہ ان کی زندگی سے بیدار دل افراد کو ایک اور درس عبرت دے، فرماتا ہے : فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لُوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔" (وجاء فرعون ومن قبلہ والمؤتفکات بالخاطئۃ)۔

"خاطئۃ" خطا کے معنی میں ہے (دونوں مصدری معنی رکھتے ہیں۔) اور یہاں خطا سے مُراد شرک وکفر، ظلم و فساد اور انواع واقسام کے گناہ ہیں۔

"مؤتفکات"، "مؤتفکہ" کی جمع ہے۔ "ائتفاك" کے مادّہ سے اُلٹ پلٹ اور تہ و بالا ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں قوم لُوط کے شہروں کی طرف اشارہ ہے جو ایک شدید زلزلے کی وجہ سے تہ و بالا ہو گئے۔

"من قبلہ" سے مُراد وہ قومیں ہیں جو فرعون سے پہلے تھیں۔ مثلاً قوم شعیب اور قوم نمرود جیسے سرکش لوگ۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "وہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہُوئے رسُول کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور خُدا نے انھیں شدید عذاب میں گرفتار کر لیا۔" (فعصوا رسول ربھم فاخذھم اخذۃ رابیۃ)۔

فرعونی، موسیٰ اور ہارون کی مُخالفت کے لیے کھڑے ہوگئے۔ سدوم کے شہروں میں رہنے والوں نے لُوطؑ کی مخالفت کی اور دوسری اقوام نے بھی اپنے پیغمبروں کے فرمان سے روگردانی کی۔ ان سرکشوں میں سے ہر گروہ ایک خاص قسم کے عذاب میں گرفتار ہُوا۔ فرعونی نیل کی موجوں میں، جو ان کی حیات و آبادی اور مُلک کی برکت کا سبب تھا، غرق ہو گئے، اور قوم لُوطؑ کے لوگ شدید زلزلہ اور اس کے بعد پتھروں کی بارش سے تباہ و برباد اور نابُود ہو گئے۔

"رابیۃ" اور "ربا" ایک ہی مادّہ سے ہیں اور آزمائش اور اضافہ کے معنی میں ہیں، یہاں وہ عذاب مُراد ہے، جو بہت ہی سخت اور شدید تھا۔

قوم فرعون کی داستان کی تفصیل قرآن کی بہت سی سورتوں میں آئی ہے۔ سب سے زیادہ تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۸ سُورہ شعراء کی آیت (۱۰ تا ۶۸) میں، تفسیر نمونہ جلد ۴ (سُورہ اعراف آیت ۱۰۳ تا ۱۳۷) میں اور تفسیر نمونہ جلد ۷ (سورہ طٰہٰ آیۃ ۲۴ سے ۷۹) میں آئی ہے۔

قوم لُوطؑ کی داستان بھی قرآن کی بہت سی سورتوں میں ہے، چنانچہ تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورہ حجر آیت ۶۱ تا ۷۷) اور تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورہ ھود آیت ۷۷ تا ۸۳) میں آیا ہے۔

آخر میں قوم نوح کی سرنوشت اور ان کے دردناک عذاب کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہُوئے کہتا ہے :
"ہم نے اس وقت جب پانی میں طغیانی آئی تو تمھیں کشتی میں سوار کر دیا۔" (انا لما طغا الماء حملناکم فی الجاریۃ)۔

پانی کی طغیانی اِس طرح تھی کہ تیرہ و تاریک بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایسی بارش ہوئی کہ گویا آسمان کی طرف سے سیلاب گر رہا ہے اور زمین سے بھی چشمے اُبلنے لگے ۔پھر یہ دونوں طرف کے پانی ایک دُوسرے کے ساتھ مل گئے اور ہر چیز پانی میں ڈوب گئی ،پس باغات ، کھیتیاں اور سرکش قوم کے محلات اور مکانات سب غرقاب ہوگئے ۔جن لوگوں نے نجات پائی ان میں صرف وہ مومنین تھے جو نوحؑ کے ہمراہ کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔

"حملناکم" (تمھیں کشتی میں سوار کیا) کی تعبیر ہمارے اسلاف اور بڑوں سے کنایہ ہے ،کیونکہ اگر انھوں نے نجات حاصل نہ کی ہوتی تو آج ہم موجود نہ ہوتے۔[1]

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد ان سزاؤں کے ہدف اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: "مقصد یہ تھا کہ اسے تمھاری یاد آوری اور تذکر کے لیے وسیلہ قرار دیں" (لنجعلها لكم تذكرة)۔

"اور سننے والے کان اس کی حفاظت کریں" (وتعيها اذن واعية)۔

ہم ہرگز ان سے انتقام لینا نہیں چاہتے تھے ،بلکہ ہدف انسانوں کی تربیت اور راہِ کمال میں ان کی ہدایت، راستہ دکھانا اور مطلوب تک پہنچانا تھا۔

"تعیھا"، 'وعی' (بروزن سعی) کے مادّہ سے ہے جس طرح 'راغب' نے 'مفردات' میں اور 'ابن منظور' نے 'لسان العرب' میں کہا ہے ۔اصل میں کسی چیز کو دل میں محفوظ رکھنے کے معنی میں ہے ۔ اس کے بعد ہر برتن کو 'وعاء' کہا گیا، کیونکہ وہ اپنے اندر کسی چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں یہ صفت کانوں کے لیے بیان ہُوئی ہے ۔وہ کان جو حقائق کو سنتے ہیں اور اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔

یا دوسرے لفظوں میں بعض اوقات انسان ایک بات کو سنتا ہے اور فوراً اُسے کان سے باہر نکال دیتا ہے، جیسا کہ عام لوگوں کی تعبیروں میں کہا جاتا ہے: "ایک کان سے سُنی اور دوسرے کان سے نکال دی"۔ لیکن بعض اوقات وہ اس بات میں غور و فکر کرتا ہے ، اسے اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اس کو اپنی زندگی کی راہ کا چراغ شمار کرتا ہے ۔یہی وہ چیز ہے جسے 'وعی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] اس طرح بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں حملنا اٰباءکم تھا۔

چند نکات

۱: علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت

بہت سی مشہور اسلامی کتابوں میں، چاہے وہ تفسیر کی ہوں یا حدیث کی، یہ آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے اوپر والی آیہ (وتعیھا اذن واعیۃ) کے نزول کے وقت فرمایا:

"سألت ربی ان یجعلھا اذن علیؑ"

"میں نے خدا سے سوال کیا ہے کہ علیؑ کے کان کو ان سننے والے حقائق کو محفوظ رکھنے والے کانوں میں سے قرار دے۔"

اس کے بعد امام علیؑ فرماتے تھے:

"ما سمعت من رسول اللهؐ شیئًا قط فنسیتہ الا وحفظتہ"

"میں نے رسولِ خداؐ سے کوئی چیز نہیں سنی جسے بھول گیا ہوں، بلکہ وہ ہمیشہ میرے حافظہ میں رہی ہے۔"[1]

"غایۃ المرام" میں اس سلسلہ میں سولہ احادیث شیعہ اور اہلِ سنّت کے طرق سے نقل ہوئی ہیں، اور محدث بحرانی نے تفسیر "البرہان" میں محمد بن عبّاس سے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں تیس احادیث عامہ اور خاصہ کے طرق سے نقل ہوئی ہیں۔

ہاں! یہ اسلام کے عظیم پیشوا اور امام علیؑ کی ایک عظیم فضیلت ہے کہ وہ اسرارِ پیغمبرؐ کے خزینہ اور رسولِ خداؐ کے تمام علوم کے وارث ہیں۔ اسی بناء پر آنحضرتؐ کے بعد ان مشکلات میں جو اسلامی معاشرے کو پیش آتی تھیں، موافق و مخالف سبھی لوگ آپ کی پناہ لیتے، اور آپ سے ہی مشکل کا حل چاہتے تھے۔ یہ واقعات کتبِ تواریخ میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۲: گناہ اور سزا میں تناسب

جو تعبیریں اوپر والی آیات میں آئی ہیں قابلِ توجہ ہیں۔ قومِ ثمود کے عذاب کے بارے میں "طاغیۃ"، قومِ عاد

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۴۲۔ مجمع البیان، روح البیان، روح المعانی، ابو الفتوح رازی، المیزان میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، نیز یہ حدیث "مناقب ابن مغازلی شافعی" ص ۲۶۵ (طبع اسلامیہ) میں بھی آئی ہے۔

کے بارے میں "عاتیۃ" قوم فرعون اور قوم لوط کے بارے میں رابیۃ اور قوم نوح کے بارے میں "طغا
الماء" کی تعبیر لاتا ہے، ان سب میں طغیان اور سرکشی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ اس طرح سے اس سرکشی کرنے والی
قوم کے عذاب میں زندگی کی بعض نعمتوں کے سرکش ہونے کو شمار کیا گیا ہے، چاہے وہ پانی، ہوا یا مٹی اور آگ ہو۔
یہ تعبیریں اس حقیقت پر ایک تاکید ہیں کہ دنیا و آخرت کے عذاب خود ہمارے اعمال ہی کا تجسم ہیں اور
یہ خود انسانوں کا کردار ہی ہے جو انھیں کی طرف لوٹایا جائے گا۔

✻ ✻ ✻

(۱۳) فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ نَفۡخَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۙ

(۱۴) وَّ حُمِلَتِ الۡاَرۡضُ وَ الۡجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً ۙ

(۱۵) فَیَوۡمَئِذٍ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ۙ

(۱۶) وَ انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَہِیَ یَوۡمَئِذٍ وَّاہِیَۃٌ ۙ

(۱۷) وَّ الۡمَلَکُ عَلٰۤی اَرۡجَآئِہَا ؕ وَ یَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّکَ فَوۡقَہُمۡ
یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ ؕ

ترجمہ

(۱۳) جونہی کہ ایک مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا۔

(۱۴) اور زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اُٹھا لیے جائیں گے، اور وہ یکایک ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جائیں گے۔

(۱۵) اس دن (یہ عظیم واقعہ) واقع ہوگا۔

(۱۶) آسمان پھٹ جائیں گے اور کمزور ہو کر گر پڑیں گے۔

(۱۷) فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے۔ (اور ماموریتوں کی انجام دہی کے لیے تیار ہوں گے) اور اس دن تیرے پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھالیں گے۔

تفسیر

وہ دن جس میں وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا۔

اس سورۃ کی ابتدائی آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو معاد اور قیامت کے مسئلہ کو بیان کرتی تھیں، زیر بحث آیا اس عظیم قیامت کے حوادث کے مباحث کو پیش کرتی ہیں، ایسی ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی تعبیروں کے جو انسان کو ان وقائع کی عظمت سے آشنا کرتی ہیں جو اسے درپیش ہوں گے۔

پہلے فرماتا ہے: "جب ایک دفعہ صور میں پھونکا جائے گا" (فاذا نفخ فی الصور نفخة واحدة)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے کے آغاز میں، ناگہاں اور اچانک ایک عظیم صدا پیدا ہوگی، جسے "نفخ صور" (ناقوس میں پھونکنے سے) تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ میں اور آج بھی لشکر کو اکٹھا اور تیار کرنے کے لیے یا اُسے آرام گاہ یا چھاؤنی کی طرف بھیجنے کے لیے بگل سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ جب آرام کرنے اور سونے کا بگل بجایا جاتا ہے تو سب سپاہی آرامگاہ میں جاتے ہیں اور جب جمع کرنے اور تیاری کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو تمام سپاہی اپنی جگہ سے چل پڑتے ہیں اور صفوں کو منظم کرتے ہیں۔ گویا خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس جہان کے ختم کرنے اور دوسرے جہان کے آغاز کا مسئلہ میری قدرت کے مقابلہ میں ایک بگل میں پھونکنے جتنا آسان ہے۔ ایک ہی فرمان سے ایک لحہ کے اندر اندر تمام اہل آسمان اور سب اہل زمین مرجائیں گے۔ پھر ایک دوسرے فرمان کے ساتھ سب کے سب زندہ ہو جائیں گے اور حساب کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

"صُور" کی خصوصیات اور اس میں 'نفخ' کی کیفیت، پھونکنے کی تعداد اور ان کے درمیان فاصلہ کے بارے میں بہت سے مطالب ہیں۔ وہ ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورہ زمر کی آیت ۶۸ کی تفسیر میں بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ نفخۂ صُور، جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو نفخے ہیں، "موت کا نفخہ" اور "حیات جدید کا نفخہ"۔ اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں جو نفخہ آیا ہے پہلا نفخہ ہے یا دوسرا، مفسّرین کا اس سلسلہ میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے کیونکہ جو آیات بعد میں آئی ہیں ان میں سے بعض موت کے نفخہ سے اور بعض حیات و معاد اور قبروں کے اُٹھنے کے نفخہ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر یہ آیات پہلے نفخہ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور وہ اختتام جہاں کا نفخہ ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور جب زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے اور ایک ہی ضرب

کے ساتھ درہم برہم اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔" (وحملت الارض والجبال فدکتا دکة واحدة)۔

"دك" جیسا کہ راغب، مفردات میں کہتا ہے: اصل میں صاف اور نرم زمین کے معنی میں ہے چونکہ ایک ناہموار زمین کو صاف کرنے کے لیے اسے کوٹنا پیٹنا پڑتا ہے۔ لہٰذا بہت سے موارد میں یہ لفظ شدت سے کوٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لیکن بعض منابع لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ "دك" کا اصل معنی کوٹنا اور ویران کرنا ہے۔ چونکہ کوٹنے اور ویران کرنے کا لازمہ صاف اور ہموار کرنا ہے لہٰذا یہ لفظ اس معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

بہرحال زیربحث آیت میں یہ لفظ پہاڑوں اور ناہموار زمینوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور کوٹے جانے کے معنی میں ہے، اس طرح کہ ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ ہو کر ہموار ہو جائیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس دن جہان میں واقعۂ عظیم رُونما ہوگا اور قیامت برپا ہوگی۔" (فیومئذ وقعت الواقعة)۔

❖ ❖ ❖

نہ صرف زمین اور پہاڑ بکھر کر پراگندہ ہو جائیں گے بلکہ "آسمانوں اور زمینوں میں بھی شگاف پڑ جائیں گے اور وہ کمزور اور غیرمحکم ہو جائیں گے۔" (وانشقت السماء فھی یومئذ واھیة)۔

عظیم آسمانی کرّے بھی اس ہولناک اور وحشتناک حادثہ سے بچ کر نہیں رہ سکتے، وہ بھی شگافتہ اور پراگندہ ہو کر بکھر جائیں گے اور اپنی مضبوطی اور استحکام کے باوجود وہ اس قدر کمزور ہو جائیں گے کہ سورہ الرحمٰن کی آیت ۳۷ میں قرآن کے قول کے مطابق، "آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے روغن کی طرح سُرخ ہو جائیں گے۔" فاذا انشقت السماء فکانت وردة کالدھان۔"

یا دوسرے لفظوں میں موجودہ زمین و آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں اور کھنڈرات پر ایک نیا جہان برپا ہوگا جو موجودہ جہاں سے برتر، بالاتر اور کامل تر ہوگا۔

❖ ❖ ❖

"اور فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے۔" (والملك علیٰ ارجائھا)۔

"ارجاء" "رجا" کی جمع ہے جو کسی چیز کے اطراف، جوانب کے معنی میں ہے۔ "ملك" اگرچہ یہاں صیغۂ مفرد میں آیا ہے۔ لیکن اس سے مراد جنس و جمع ہے۔

گویا فرشتے اس دن مامورین کی طرح، جو کسی میدان کے اطراف میں کھڑے ہوں اور کام انجام دینے کے لیے

---

[1] اقرب الموارد مادہ "دك"

فرمان کے منتظر ہوں، آسمان کے گرداگرد صف باندھے ہوئے ہوں گے اور حق تعالیٰ کے فرمان کے منتظر ہوں گے

٭ ٭ ٭

اس کے بعد فرماتا ہے: "اور اس دن آٹھ فرشتے اپنے پروردگار کا عرش اُٹھائے ہوتے ہوں گے۔" (ویحمل عرش ربک فوقھم یومئذ ثمانیۃ)۔

یہ حاملین عرش اگرچہ صراحت کے ساتھ اس آیت میں مُعیّن نہیں ہوئے ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں گے لیکن پُوری آیت کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے، لیکن یہ مشخص نہیں ہے کہ وہ آٹھ فرشتے ہوں گے یا وہ فرشتوں کے آٹھ چھوٹے یا بڑے گروہ ہوں گے۔

البتہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ اس وقت بھی حاملینِ عرش چار نفر ہیں، لیکن قیامت میں وہ دُگنے ہو جائیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"انھم الیوم اربعۃ فاذا کان یوم القیامۃ ایدھم باربعۃ اٰخرین، فیکونون ثمانیۃ"

"وہ اس وقت چار افراد ہیں اور قیامت کے دن دُوسرے چار افراد سے ان کو تقویت دے گا اور وہ آٹھ ہو جائیں گے۔" [1]

لیکن عرش کیا ہے؟ اور یہ فرشتے کون ہیں؟ مسلّمہ طور پر عرش سے مراد ایک جسمانی تختِ سلطنت نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لفظ عرش کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ جہانِ ہستی کے مجموعہ کے معنی میں ہے جو خدا کی حکومت کا عرش ہے۔ پس ان فرشتوں کے ذریعہ، جو خدا کے حکم و فرمان کو جاری کرتے ہیں، اس کا ارادہ و تدبیر کی جاتی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک روایت میں آیا ہے قیامت میں عرش خدا کے اٹھانے والے چار افراد اوّلین میں سے اور چار آخرین میں سے ہوں گے۔ اوّلین میں سے تو نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ ہوں گے اور آخرین میں سے محمدؐ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے۔ [2]

یہ تعبیر ممکن ہے ان حضرات کے اوّلین و آخرین میں مقامِ شفاعت کی طرف اشارہ ہو، لیکن یہ شفاعت ایسے افراد کے بارے میں ہوگی جو شفاعت کے لائق ہوں گے۔ بہرحال یہ تعبیر 'عرش' کے مفہوم کی وسعت کو بتاتی ہے۔

البتہ اگر عرش کے اٹھانے والے آٹھ گروہ ہوں تو پھر ممکن ہے کہ کچھ گروہ تو فرشتوں کے ہوں اور کچھ گروہ انبیاء اور اولیاء کے ہوں کہ جو اس اہم مقام کے عہدہ دار ہوں گے۔ گویا اس طرح اس دن کے نظام کی تدبیر کے ایک حصّہ کو تو فرشتے چلا رہے ہوں گے اور ایک حصّہ کے عہدہ دار انبیاء و اولیاء ہوں گے۔ لیکن یہ سب حکمِ خُدا کے ساتھ ہوگا۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۲۸۴

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۶

اِس بارے میں کہ فوقھم (ان کے اوپر) میں ھم کی ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے یا فرشتوں کی طرف، کئی احتمال دیئے گئے ہیں۔ چونکہ اس سے قبل کے جُملہ میں گفتگو فرشتوں کے بارے میں ہے لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر انہیں کی طرف لوٹتی ہے۔ اس طرح سے فرشتے سارے جہان کو ہر طرف سے گھیرلیں گے۔ اور (مقام کے لحاظ سے) ان کے اوپر آٹھ فرشتے خُدا کے عرش کو اٹھانے والے ہوں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کے عرش کو اٹھانے والے ایسے افراد ہیں جو فرشتوں سے برتر و بالاتر ہیں۔ اِس صورت میں یہ بیان گذشتہ حدیث جو خدا کے عرش کو اٹھانے والے انبیاء و اولیاء میں سے آٹھ افراد کو شمار کرتی ہے کے مطابق ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اس دن عرش کو اٹھانے والوں کا تو کہنا ہی کیا قیامت سے مربُوط حوادث بھی اس قسم کی چیز نہیں ہیں جو ہم اس محدُود و تاریک جہان کے رہنے والوں کے لیے دقیق طور پر واضح و روشن ہوں، جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ ایک شبح (سایہ یا ہیولا سا) ہے جسے ہم آیاتِ الٰہی کے سائے میں بہت دُور سے دیکھتے ہیں، ورنہ ان کی حقیقت تو ہمیں وہاں جانے کے بعد ہی نظر آئے گی۔[1]

اِس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پہلے "نفخۂ صُور" میں آسمانوں اور زمین کے تمام ذی رُوح مرجائیں گے۔ اس بناء پر عرش کے اٹھانے والوں کے بارے میں جو بحث ہے وہ نفخۂ دوم کے ساتھ مربُوط ہے جس میں سب زندہ ہوجائیں گے، اگرچہ آیت میں دوسرے نفخہ کے بارے میں گفتگو نہیں ہے۔ لیکن قرائن سے واضح ہوتا ہے کہ جن مطالب کو ہم بعد والی آیات میں پڑھتے ہیں وہ بھی اسی نفخۂ دوم کے ساتھ ہی مربُوط ہیں۔[2]

---

[1] 'لغت' اور 'قرآن مجید' کے لحاظ سے عرش کے معانی کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ میں کئی مرتبہ بحث کی ہے۔ منجملہ ان کے جلد ۴ سورۂ اعراف آیت ۵۴ کے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

[2] حقیقت میں آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ "ثم نفخ فیہ اخرٰی" (پھر اس میں دوبارہ پھونکا جائے گا)

(۱۸) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ○
(۱۹) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ
اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ○
(۲۰) اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ○
(۲۱) فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○
(۲۲) فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○
(۲۳) قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ○
(۲۴) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ
الْخَالِيَةِ ○

ترجمہ

(۱۸) اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے کاموں میں سے کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔

(۱۹) لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، (وہ فرطِ مسرت اور فخر کے ساتھ) پکار اُٹھے گا کہ (اے اہلِ محشر) لو میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

(۲۰) مجھے یقین تھا کہ (قیامت آ کے رہے گی اور) میرے اعمال کا حساب ہوگا۔

وہ ایک کامل پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا۔

ایک عالی جنت ۲۲

جس کے پھل دسترس میں ہوں گے۔ ۲۳

(اور ان سے کہا جائے گا) مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے ۲۴
گذشتہ ایّام میں انجام دیا تھا۔

تفسیر

اے اہل محشر میرا نامۂ اعمال پڑھو

گذشتہ آیات کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "نفخِ صور" دو مرتبہ رُونما ہوگا۔ پہلی دفعہ سب ذی رُوح مر جائیں گے اور نظامِ زندگی بکھر کر رہ جائے گا۔ دوسری مرتبہ ایک نیا جہان اور ایک نیا عالم برپا ہوگا، انسان اور فرشتے ایک نئی زندگی حاصل کریں گے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ان آیات کا آغاز تو پہلے نفخہ کی اور ان کا آخر دوسرے نفخہ کی خبر دیتا ہے۔

اسی مطلب کو جاری رکھتے ہوئے زیرِ بحث آیات میں فرماتا ہے: "اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے اعمال میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی" (یومئذ تعرضون لا تخفٰی منکم خافیۃ)۔

تعرضون، عرض کے مادّہ سے کسی چیز کو دکھانے اور پیش کرنے کے معنی میں ہے۔ چاہے معاملہ کے وقت مال اور جنس ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔ البتّہ انسان اور ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس دنیا میں بھی ہمیشہ اس کے سامنے ہیں۔ لیکن یہ بات قیامت میں زیادہ سے زیادہ نمایاں اور ظاہر ہوگی جیسا کہ خدا کی حاکمیت عالمِ ہستی پہ دائمی ہے لیکن یہ حاکمیت اس دن ہر زمانہ اور وقت سے زیادہ واضح اور آشکار ہوگی۔

"لا تخفٰی منکم خافیۃ" کا جُملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس دن غیب اور لوگوں کے اسرار، شہود و ظہور میں بدل جائیں گے، جیسا کہ قرآن قیامت کے بارے میں کہتا ہے: یوم تبلی السرائر: وہ ایسا دن ہوگا جس میں سارے پوشیدہ صفات ظاہر ہو جائیں گے۔ (طارق-۹)

نہ صرف انسانوں کے مخفی اعمال، بلکہ ان کے صفات، جذبات، اخلاق اور نیتیں، سب کھل کر سامنے آجائیں گی۔

یہ ایک عظیم حادثہ ہے اور بعض مفسرین کے مطابق پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے اور آسمانوں کے ٹکڑوں کے پھٹ جانے سے زیادہ عظیم، بدکاروں کی عظیم رسوائی اور مومنین کی بے مثال سربلندی کا دن ہے۔ وہ ایسا دن ہو گا جس میں انسان اس میدان میں، اعمال اور اندرونی اسرار کے لحاظ سے عُریاں ظاہر ہو گا۔ ہاں! اس دن ہمارے وجود کی کوئی چیز پنہاں اور مخفی نہیں رہے گی۔

ممکن ہے کہ یہ اس دن خُدا کے ہر چیز پر احاطۂ علمی کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

٭ ٭ ٭

لٰہذا اس کے بعد کہتا ہے: "لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہو گا وہ فرطِ مسرت میں پکار اُٹھے گا، لو آؤ اور میرا نامۂ اعمال پڑھو" (فاما من اوتی کتابه بیمینه فیقول هاؤم اقرءوا کتابیه)۔[1]

گویا خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور ان سب نعمتوں، توفیقات اور ہدایت کی وجہ سے جو خُدا نے اُسے دی ہیں اس کے وجود کا ہر ہر ذرہ شکر گزار ہے اور وہ بے ساختہ 'الحمدللہ' پکار رہا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اپنے عظیم ترین افتخار کو اس کلمہ میں خلاصہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مجھے یقین تھا کہ قیامت آکے رہے گی اور مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا" (انی ظننت انی ملاق حسابیه)۔[2]

'ظن' اِس قسم کے موارد میں 'یقین' کے معنی دیتا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے جو کچھ نصیب ہوا ہے، وہ اس دن پر ایمان کی وجہ سے ہے۔ واقعاً بات یہی ہے کہ حساب و کتاب پر ایمان، انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی رُوح عطا کرتا ہے، تعہد اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسان کی تربیت کا اہم ترین عامل ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں اس قسم کے افراد کے اجر و ثواب کے ایک گوشہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایک کامل اور پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا" (فهو فی عیشة راضیة)۔[3]

---

[1] 'هاؤم' اربابِ لغت کے قول کے مُطابق، 'لے لو' کے معنی میں ہے۔ اگر مخاطب مردوں کی جماعت ہو تو 'ھاؤم' کہا جاتا ہے۔ عورتوں کی جماعت ہو تو ھاؤمّن اور اگر مفرد مذکر ہو تو 'ھاءَ' (زبر کے ساتھ) اور مفرد مونث ہو تو "ھاءِ" (زیر کے ساتھ) اور تثنیہ کے لیے "ھاؤما" کہا جاتا ہے راغب مفردات میں کہتا ہے۔ "ھا" لینے کے معنی میں اور 'ھات' دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "حسابیہ" میں ھاء استراحت کی یا سکتہ کی ہے اور اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے، جیسا کہ کتابیہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

[3] اگرچہ "رضایت اور خوشی" اس زندگی والوں کی ایک صفت ہے لیکن اوپر والی آیت میں اسے خود زندگی کی صفت قرار دیا ہے۔ یہ چیز انتہائی تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی زندگی ہے جو ساری کی ساری رضایت و خوشی ہے۔

اگرچہ اس نے اسی ایک جُملہ کے ساتھ تمام کہنے کی باتیں کہہ دی ہیں لیکن مزید وضاحت کے لیے کہتا ہے :
"وہ عالی مرتبہ بہشت میں ہوگا" (فی جنۃ عالیۃ)۔
وہ بہشت جو اتنی بلند و بالا اور رفیع و والاقدر ہے کہ نہ کسی شخص نے دیکھی ہے نہ سُنی ہے اور نہ ہی کبھی اس کا تصوّر کیا ہے۔

ٌ ٌ ٌ

ایسی بہشت جس کے پھل دسترس میں ہوں گے" (قطوفھا دانیۃ)۔
نہ پھلوں کو توڑنے کی زحمت اٹھانا پڑے گی، نہ ہی اس کے لدے پھندے درختوں کے قریب ہونے میں کوئی مشکل ہوگی اور اصولی طور پر اس کی تمام نعمتیں بغیر کسی استثناء کے دسترس میں ہوں گی۔[1]

ٌ ٌ ٌ

آخری زیرِ بحث آیت میں، ان بہشتیوں کے لیے خدا کے محبّت آمیز خطاب کو اس طرح بیان کیا ہے :
"مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے گذشتہ ایّام میں انجام دیا تھا" (کلوا واشربوا هنیئًا بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ)۔
ہاں! یہ عظیم نعمتیں بے حساب نہیں ملیں گی۔ یہ تمھارے اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے دنیا میں آج کے لیے ذخیرہ کیا اور آگے بھیجا ہے، لیکن یہ ناچیز اعمال جب فضل و رحمتِ الٰہی کے افق میں قرار پائے ہیں تو اس قسم کے ثمرات و نتائج تک منتہی ہوئے ہیں۔

چند نکات

ا : لفظِ عرش کی ایک اور تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادق ؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :
حملۃ العرش۔ والعرش العلم۔ ثمانیۃ اربعۃ منا،
و اربعۃ ممن شاء اللّٰہ۔
حاملین عرش۔ عرش سے مراد علمِ خدا ہے۔ آٹھ افراد میں چار تو ہم میں سے ہیں اور چار ان میں سے جنھیں خُدا نے چاہا ہے۔[2]

---

[1] قطوف، قطف (بروزن حزب) کی جمع ہے جو چنے ہوئے پھلوں کے معنی میں ہے اور کبھی چُننے کے لیے تیار پھلوں کے لیے بھی آیا ہے۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۶ حدیث ۲۸

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے :

"فالذین یحملون العرش، هم العلماء، الذین حملهم الله علمه۔"

"حاملینِ عرش وہ عُلماء اور دانش مند ہیں جنھیں خدا نے اپنے علم کی تعلیم دی ہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آیا ہے :

"العرش لیس هو الله والعرش اسم علم وقدرة۔"

"عرش خدا نہیں ہے، بلکہ اس کے علم و قدرت کا نام ہے۔"[2]

ان احادیث سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عرش کی اس تفسیر کے علاوہ، جو ہم نے پہلے بیان کی تھی، ایک اور تفسیر بھی ہے۔ یعنی وہ خدا کے "علم وقدرت" جیسی صفات ہیں۔ اس بناء پر عرش الٰہی کے حامل اس کے علم کے حامل ہیں۔ پس انسان یا فرشتے جتنا زیادہ علم رکھتے ہوں گے، اتنا ہی زیادہ حصّہ اس عظیم عرش کا اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اِس طرح یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کہ عرش تختِ سلطنت کے مشابہ کسی جسمانی تخت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو مختلف کنائی معانی رکھتا ہے۔

۲ : علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام

کئی روایات میں آیا ہے آیت فاما من اوتی کتابہ بیمینہ ... علیؑ کے بارے میں ہے، یا علیؑ اور ان کے شیعوں کے بارے میں ہے۔[3]

حقیقت میں یہ واضح مصادیق کے بیان کے قبیل سے ہے۔ اس سے آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

۳ : ایک سوال کا جواب

ممکن ہے یہاں ایک سوال کیا جائے کہ کیا وہ مومنین جو اوپر والی آیات کے مطابق پکاریں گے۔ "اے

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۰۵ حدیث ۲۶

[2] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۰۵ حدیث ۲۷

[3] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۶۶

اہل محشر آؤ اور ہمارے نامۂ اعمال کو پڑھو، توکیا ان کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہو گا۔

اس سوال کا جواب بعض احادیث سے معلوم کیا جا سکتا ہے، منجملہ ان کے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے:

"خدا قیامت میں پہلے اپنے بندوں سے ان کے گناہوں کا اقرار لے لے گا پھر فرمائے گا، "میں نے تمہارے یہ گناہ دنیا میں بھی مستور اور پوشیدہ رکھے ہیں اور آج بھی میں انھیں بخشتا ہوں"، اس کے بعد (صرف) ان کے حسنات اور نیکیوں کا دفتر ان کے دائیں ہاتھ میں دے دے گا۔ [1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس دن خدا مومنین کے سیئات اور برائیوں کو حسنات اور نیکیوں میں بدل دے گا۔ اسی وجہ سے ان کے سارے نامۂ اعمال میں کوئی ضعیف نقطہ نہیں ہو گا۔

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۵۶

(۲۵) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَ
اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ

(۲۶) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ

(۲۷) يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ

(۲۸) مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۚ

(۲۹) هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ

ترجمہ

(۲۵) لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا : اے کاش !
میرا نامہ اعمال مجھے ہرگز نہ دیا جاتا۔

(۲۶) اور میں یہ نہ ہی جانتا کہ میرا حساب کیا ہے ؟

(۲۷) اے کاش ! مجھے تو موت ہی آجاتی۔

(۲۸) میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا۔

(۲۹) میری قدرت بھی ہاتھ سے نکل گئی۔

تفسیر

اے کاش مجھے موت آجاتی۔

گذشتہ آیات میں گفتگو 'اصحابُ الیمین' اور ان مومنین کے بارے میں تھی کہ جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ فخریہ اہلِ محشر کو پکاریں گے اور انھیں اپنے اعمال کو پڑھنے کی دعوت دیں گے، اس کے بعد بہشتِ جاوداں میں پہنچ جائیں گے۔

لیکن زیر بحث آیات ٹھیک ان کے نقطۂ مقابل یعنی 'اصحاب شمال' کو پیش کرتی ہیں اور ایک موازنہ میں ان دونوں کی کیفیت کو کامل طور پر واضح کر دیتی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "لیکن جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش میرا نامۂ اعمال کبھی بھی مجھے نہ دیا جاتا" (و اما من اوتی کتابہ بشمالہ فیقول یالیتنی لم اوت کتابیہ)[1]

⁂

"اور اے کاش! میں اپنے حساب کتاب سے ہرگز خبردار نہ ہوا ہوتا" (ولم ادر ما حسابیہ)۔

⁂

"اور اے کاش مجھے موت آجاتی جو میری اس حسرت ناک زندگی کو ختم کر دیتی" (یالیتھا کانت القاضیۃ)۔[2]

ہاں! اس عظیم عدالت میں، اس 'یوم البروز' اور 'یوم الظہور' میں جب اپنے تمام قبیح اعمال کو برملا دیکھے گا تو اس کی فریاد بلند ہوگی۔ وہ دل سے پے در پے آہِ سوزاں کھینچے گا۔ ایسی آہ جو حسرت بار ہوگی اور ایسا نالہ جو شرر بار ہوگا۔ وہ یہ آرزو کرے گا کہ اس کا اپنے ماضی سے کلی طور پر رابطہ ختم ہوجائے۔ وہ خدا سے موت و نابودی اور اس عظیم رُسوائی سے نجات کی آرزو کرے گا، جیسا کہ سورۂ 'نبا' کی آیت ۴۰ میں بھی آیا ہے: "ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابا"، "کافر اس دن یہ کہے گا۔ اے کاش! میں مٹی ہوتا اور ہرگز انسان نہ بنتا"۔

"یالیتھا کانت القاضیۃ" کے جملہ کی اور تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ 'قاضیۃ' سے

---

[1] کتابیہ میں اور اسی طرح حسابیہ و مالیہ وسلطانیہ میں 'ھا' جو بعد میں آیات میں آئے گا ھاء سکت یا ھاء استراحت ہے۔ نیز جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے بلکہ یہ اس قسم کے کلمات میں ایک خوبصورت وقف شمار ہوتا ہے۔ یہ ان اشخاص کے حالات اور نفس کی کیفیت کے ساتھ ایک قسم کی مناسبت رکھتا ہے، جو یہ بات کریں گے۔

[2] "کانت القاضیۃ" کے جملہ میں ایک محذوف ہے اور 'تقدیر' میں اس طرح ہے۔ (کانت ھذہ الحالۃ القاضیۃ)

مراد پہلی موت ہے، یعنی اے کاش! جب ہم دنیا میں مرہی گئے تھے تو پھر دوبارہ زندہ نہ ہوتے۔ یہ اس حالت میں ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی نظر میں موت سے زیادہ ناخوش آئند نہیں تھی، لیکن قیامت میں آرزو کرے گا اے کاش وہ موت ہی برقرار رہتی۔

بعض نے اسے صُور کے پہلے نفخہ کے بارے میں سمجھا ہے، جسے قارعۃ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ یعنی اے کاش دوسرا نفخہ واقع ہی نہ ہوتا۔

لیکن وہ تفسیر جو ہم نے ابتداء میں بیان کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ گنہگار مجرم اعتراف کرتے ہوئے کہے گا: "میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور آج کی مصیبت میں جو میری بیچارگی کا دن ہے، میرے کچھ کام نہ آیا" (ما اغنٰی عنی مالیہ)۔

* * *

نہ صرف میرے مال و دولت نے مجھے بے نیاز نہیں کیا اور میری کسی مشکل کو حل نہیں کیا،" بلکہ میری قدرت سلطنت بھی نابود ہوگئی اور ہاتھ سے چلی گئی" (هلك عنی سلطانیه)۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مال ہی کام آیا اور نہ ہی مقام و منصب، آج خالی ہاتھ، انتہائی ذلت و شرمساری کے ساتھ دادگاہِ عدلِ الٰہی میں حاضر ہوں، نجات کے تمام اسباب منقطع ہو گئے ہیں، میری طاقت و قدرت برباد ہوگئی ہے اور میری اُمید ہر جگہ سے ختم ہو چکی ہے۔

بعض نے یہاں سلطان کو دلیل و برہان کے معنی میں سمجھا ہے جو انسان کی کامیابی کا سبب ہوتا ہے یعنی آج میرے پاس کوئی ایسی دلیل اور حجت نہیں ہے جس کے ذریعے میں بارگاہِ خدا میں اپنے اعمال کی توجیہ کرسکوں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "سلطان" سے مُراد سلطہ و حکومت نہیں ہے، کیونکہ وہ سب لوگ جو دوزخ میں وارد ہوں گے کسی مُلک کے بادشاہ یا کچھ شہروں کے امیر تو نہیں تھے بلکہ اس سے مُراد انسان کا اپنے نفس اور اپنی زندگی پر تسلط ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سے دوزخی اس جہان میں تسلط و نفوذ رکھتے تھے یا وہ سردار اور امیر کبیر لوگ تھے، لہٰذا یہ صحیح نظر آتا ہے۔

ایک نکتہ

چند عبرت انگیز داستانیں

یہاں بہت سے واقعات نقل ہوئے ہیں جو سب کے سب اوپر والی آیات کے مضمون پر ایک تاکید، اور

ان لوگوں کے لیے ایک درس عبرت ہیں جنہوں نے مال و مقام اور منصب پر تکیہ کیا اور سر تا پا غرور و غفلت اور گناہ میں آلودہ ہیں، منجملہ :

ا : سفینۃ البحار میں کتاب نصائح سے اس طرح سے نقل ہوا ہے۔ "خراسان میں جب ہارون الرشید کی بیماری شدید ہوگئی تو اس نے طوس سے کسی طبیب کو بلانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس کا پیشاب دوسرے چند بیماروں اور کچھ صحیح و سالم افراد کے پیشاب کے ساتھ طبیب کے سامنے پیش کیا جائے۔ طبیب ان شیشیوں کو یکے بعد دیگرے دیکھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ہارون الرشید کے پیشاب والی شیشی تک پہنچ گیا۔ چنانچہ یہ جانے بغیر کہ یہ شیشی کس کی ہے اُس نے کہا : اس شیشی والے سے کہہ دیں کہ وہ اپنی وصیت کر دے، کیونکہ اس کی طاقت و قوت مضمحل ہو چکی ہیں اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ہارون الرشید طبیب کی اس بات کو سُن کر اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا، اور یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

ان الطبیب بطبه و دوائه
لا یستطیع دفاع نحب قد اُتی
ما للطبیب یموت بالداء الذی
قد کان یبرء مثله فیما مضی

"طبیب اپنی طبابت اور دواؤں کے ذریعے اس موت کا دفاع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا جو آپہنچی ہے۔"
"اگر وہ یہ قدرت رکھتا ہوتا تو پھر وہ خود اُسی بیماری سے کیوں مرتا کہ جس کا وہ پہلے علاج کیا کرتا تھا۔"

اسی اثناء میں اُسے خبر ملی کہ لوگوں نے اس کی موت کی خبر پھیلا دی ہے۔ اس شہرت کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک سواری لانے کا حکم دیا اور کہا کہ مجھے اس پر سوار کر دو، لیکن اچانک اس جانور کا زانو کمزور ہو گیا۔ تب اس نے کہا : "مجھے سواری سے اُتار دو کیونکہ اس خبر کو اُڑانے والے سچ کہتے ہیں"۔ اس کے بعد اس نے وصیت کی کہ اس کے لیے کئی کفن لائے جائیں، ان میں سے اس نے ایک کو پسند کر کے رکھ لیا اور کہا "میرے بستر کے قریب ہی میری قبر تیار کرو"۔ پھر اس نے قبر کی طرف دیکھا اور ان آیات کی تلاوت کی : ما اغنیٰ عنی مالیہ ۔ ھلک عنی سلطانیہ اور اسی دن دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1]

---

[1] سفینۃ البحار جلد اول ص ۵۲۳ مادہ رشد

۲ : اسی کتاب میں عالم بزرگوار شیخ بہائی سے بھی اسی طرح نقل ہوا ہے :

"ایک شخص جس کا نام 'توبہ' تھا اور غالباً وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا تھا، ایک دن اس نے اپنی گزری ہوئی عمر کا حساب لگایا تو وہ ۲۱۵۰۰ دن تھے۔ تب اس نے کہا : وائے ہو مجھ پر! اگر میں ہر دن کے مقابلہ میں صرف ایک ہی گناہ کیا ہو تو وہ بھی اکیس ہزار سے زیادہ بنتے ہیں۔ تو کیا میں سے اکیس ہزار گناہوں کے ساتھ ملاقات کروں گا۔ اسی وقت اس نے ایک چیخ ماری، زمین پر گر پڑا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔[1]

۳ : 'ثعالبی' کی کتاب 'یتیمہ' میں اس طرح آیا ہے :

"جب عضد الدولہ کی موت کا وقت آن پہنچا تو اس کی زبان سے سوائے اس آیت کی تلاوت کے کچھ نہ نکلتا تھا : ما اغنیٰ عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ۔ "میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا اور میری سلطنت بھی برباد ہو گئی"۔

[1] سفینۃ البحار جلد اول ص ۴۸۸ مادہ ذنب (اقتباس کے ساتھ)

(۳۰) خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝

(۳۱) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝

(۳۲) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا
فَاسْلُكُوْهُ ۝

(۳۳) اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝

(۳۴) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

(۳۵) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝

(۳۶) وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝

(۳۷) لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِــُٔوْنَ ۝

ترجمہ

(۳۰) اسے پکڑو اور طوق وزنجیر میں جکڑ دو۔

(۳۱) پھر اسے جہنم میں پھینک دو۔

(۳۲) اس کے بعد اسے ایسی زنجیر میں باندھ دو جو ستر ہاتھ ہے۔

(۳۳) کیونکہ وہ ہرگز خداوند عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا۔

(۳۴) اور مساکین کو کھانا کھلانے کی لوگوں کو تشویق نہیں کرتا تھا۔

(۳۵) لہٰذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور یار و یاور نہیں ہے۔

(۳۶) اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ کوئی اور کھانا ہے۔

(۳۷) ایسی غذا جسے خطا کاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں کھاتا۔

تفسیر

اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو۔

گذشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو اصحاب شمال کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ان کے آہ و نالہ کی فریاد بلند ہوگی اور وہ موت کی آرزو کریں گے۔ زیر بحث آیات میں ان کے عذاب کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس وقت عذاب کے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا: "اسے پکڑ لو اور طوق و زنجیر میں جکڑ دو" (خذوہ فغلوہ)۔

غلوہ، غل کے مادہ سے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے، ایسی زنجیر کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بعض اوقات مجرموں کے ہاتھ پاؤں ان کی گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں اور وہ بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

* * *

اس کے بعد کہا جائے گا: "اس کو جہنم کی آگ میں داخل کر دو" (ثم الجحیم صلّوہ)۔

* * *

"پھر اسے اتنی لمبی زنجیر میں جکڑ دو جو ستر ہاتھ ہے۔" (ثم فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعاً فاسلکوہ)۔

"سلسلہ" زنجیر کے معنی میں ہے اور اصل میں تسلسل کے مادہ سے لیا گیا ہے جو ہلنے اور لرزنے کے معنی میں ہے کیونکہ زنجیر کے حلقے اور کڑیاں لرزتی اور ہلتی رہتی ہیں۔

"ستر ہاتھ" کی تعبیر ممکن ہے "تکثیر" کے عنوان سے ہو، کیونکہ ستر کا عدد ایسے اعداد میں سے ہے جو عام طور پر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ستر کا عدد ہی مُراد ہو۔ بہر حال اس قسم کی زنجیر کو مجرموں کے گرد اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ وہ انھیں سر سے لے کر پاؤں تک گھیر لے گی۔ بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ یہ طولانی زنجیریں ایک ہی شخص کے لیے نہیں ہوں گی، بلکہ ہر گروہ کو ایک

زنجیر میں باندھیں گے۔ گذشتہ آیات میں غل و زنجیر کے ذکر کے بعد اس سزا کا ذکر اسی معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ذراع کہنی سے لے کر اُنگلیوں کی نوک تک کے فاصلہ کے معنی میں ہے (جو تقریباً آدھا میٹر ہوتا ہے) اور یہ عربوں کے نزدیک ایک ہی طول تھا جو ایک طبیعی پیمانہ ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ عام ذراع سے مختلف ہے۔ اس طرح کہ اس کی ایک ذراع بہت زیادہ فاصلوں کو گھیر لیتی ہے اور سارے کے سارے دوزخیوں کو اسی ایک زنجیر کے ساتھ باندھ دیں گے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ قیامت سے مربُوط مسائل کو ہم دُنیا کے رہنے والوں کی زبان میں پُورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ آیات و روایات میں آیا ہے وہ صرف اس کی ایک شبح (سایہ یا ہیولے) کی تصویر کشی کرتا ہے۔

اِس آیت میں ثمّ کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ جہنّم میں داخل ہونے کے بعد ستّر ذراع کی زنجیر میں جکڑے جائیں گے اور یہ ان کے لیے ایک نئی سزا ہوگی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام انفرادی اور اجتماعی زنجیریں جہنّم میں وارد ہونے سے پہلے ہوں گی اور ثمّ اصطلاح کے مطابق ذکر میں تاخیر کے لیے ہے۔

☆ ☆ ☆

بعد کی دو آیات میں اس سخت و شدید عذاب کی اصلی علّت بیان کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "کیونکہ وہ خدائے عظیم پر ایمان نہ لانے پر مصر تھا" (انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم)۔

انبیاء و اولیاء اور پروردگار کے رسول اسے جس قدر خدا کی طرف دعوت دیتے تھے وہ اسی قدر انکار کرتا اور قبول نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اپنے خالق سے اس کا رشتہ کلّی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اور وہ لوگوں کو، مساکین کو کھانا کھلانے کی تشویق نہیں کرتا تھا" (ولا یحض علیٰ طعام المسکین)۔

اِس طرح سے اس نے مخلوق سے بھی اپنا رشتہ توڑا ہُوا تھا۔

اس بناء پر اس کی بدبختی کا سب سے بڑا عامل خالق و مخلوق سے رابطے کا منقطع ہونا تھا۔

اِس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عمدہ اطاعتوں، عبادتوں اور شرعی احکام کو انھیں دو اعمال میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز "اطعام مساکین" کا ایمان پر عطف، اِس عظیم انسانی عمل کی حد سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ ہے اور واقعاً ایسا ہی ہے، کیونکہ بعض کے قول کے مطابق بدترین عقیدہ کفر ہے اور رذائل اخلاقی میں سے بدترین بُخل ہے۔

قابلِ توجہ بات ہے کہ یہ نہیں کہتا: "وہ کھانا نہیں کھلاتا تھا" بلکہ یہ کہتا ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلانے

پر آمادہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے :

اولاً : صرف ایک شخص کا کھانا کھلانا فقراء و مساکین کی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ، لہٰذا دوسروں کو بھی اس کارِ خیر کی دعوت دینا چاہیے تاکہ وہ عمومیت کا پہلو اختیار کرلے ۔

ثانیاً : ممکن ہے کہ انسان شخصی طور پر کھانا کھلانے کی توانائی اور قدرت نہ رکھتا ہو لیکن ہر شخص دوسروں کو ترغیب دلانے کی قدرت تو رکھتا ہے ۔

ثالثاً : بخیل افراد اس قسم کے ہوتے ہیں جو نہ صرف خود عطاء اور بخشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی عطاء اور بخشش سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔

بعض قدماء سے نقل ہوا ہے جو اپنی بیوی کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ کھانا زیادہ پکایا کرے تاکہ وہ فقراء و مساکین کو بھی دے سکیں ، اس کے بعد یہ کہا کرتے :

" اس زنجیر کا آدھا حصّہ خدا پر ایمان لانے کی وجہ سے ہم نے باہر نکال دیا ہے اور اس کا دوسرا آدھا حصّہ کھانا کھلوا کر باہر نکالتے ہیں۔" [1]

❁ ❁ ❁

اِس کے بعد مزید کہتا ہے : " چونکہ اس کا کوئی عقیدہ و عمل ایسا نہ تھا ، لہٰذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور مددگار نہیں ہے " (فلیس له الیوم ههنا حمیم)۔

اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ اس کے لیے یہاں کوئی اور کھانا ہے ۔" (ولا طعام الّا من غسلین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کی جزا اور عمل کامل طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ خالق سے رشتہ توڑنے کی وجہ سے وہاں ان کا کوئی گرم جوش اور گہرا دوست نہیں ہو گا ، نیز فقراء اور مساکین کو کھانا نہ کھلوانے کی وجہ سے ، پیپ اور خون کے سوا اور کوئی کھانے کی چیز ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی ، کیونکہ وہ سالہا سال تک لذیذ ترین کھانے کھاتے رہے تھے جبکہ بے نوا اور بے کس لوگوں کے پاس خونِ دل کے سوا اور کوئی کھانا نہیں تھا ۔

" راغب " مفردات میں کہتا ہے کہ ' غسلین ' اس پانی کے معنی میں ہے جو کفّار کے بدن کو دھونے سے جہنّم میں گرے گا ۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ اس سے مُراد وہ پیپ اور خون ہے جو دوزخیوں کے بدن سے گرے گی ، شاید راغب کی مراد بھی یہی ہو اور طعام کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ غاشیہ کی آیت ۶ میں آیا ہے : لیس لھم طعام الّا

---

[1] رُوح المعانی جلد ۲۹ ص ۵۱

من ضریع : ان کا کھانا "ضریع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا" اور ضریع کی تفسیر ایک قسم کے کانٹے سے کی ہے۔ سورہ دخان کی آیت ۴۳، ۴۴ میں آیا ہے : ان شجرت الزقوم طعام الاثیم: "درخت زقوم گنہگاروں کا کھانا ہے۔ اور "زقوم" کی ایک کڑوے بدبودار اور بدذائقہ نبات کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے، جس کا نمونہ سرزمین 'تہامہ' میں اگا کرتا تھا جو تلخ اور جلانے والا شیرہ رکھتا تھا۔ پس ان آیات اور زیربحث آیت کو کیسے جمع کیا جاسکتا ہے؟

اِس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے : یہ تینوں الفاظ 'ضریع'، 'زقوم'، 'غسلین' ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں۔ (اور وہ ایک سخت اور ناگوار نبات ہے جو اہلِ دوزخ کی غذا ہے۔)

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے : دوزخیوں کے مختلف طبقات ہیں، ان تینوں چیزوں میں سے ایک ایک چیز ایک گروہ کی غذا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ ان کی غذا تو 'زقوم وضریع' ہے، پینے کے لیے غسلین ہے اور مشروب کے بارے میں 'طعام' کی تعبیر نئی نہیں ہے۔

❊ ❊ ❊

آخری زیربحث آیت میں تاکید کے لیے مزید کہتا ہے : "اس غذا کو خطاکاروں کے سوا اور کوئی نہیں کھائے گا" (لا یأکلہ الا الخاطئون)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خاطی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جان بوجھ کر غلط کام کرے، لیکن "مخطی" عمدًا خطا کرنے والے اور سہوًا خطا کرنے والے کو بھی کہا جاتا ہے ——— اِس بنا پر دوزخ کی یہ غذا ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو جانتے بوجھتے عمدًا طغیان وسرکشی کے عنوان سے شرک وکفر اور بخل کی راہ پر چلتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

ایک نکتہ

حروفِ قرآن پر اعراب لگانے کی ابتداء

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "صعصہ بن صوحان جو امام علیؑ کے اصحاب میں سے تھے کہتے ہیں : "ایک عرب امام علیؑ کی خدمت میں آیا اور آیت " لا یأکلہ الا الخاطئون" کے بارے میں سوال کیا اور اس نے خاطئون یعنی خطاکاروں کی بجائے "خاطون" (جو قدم اٹھانے والوں کے معنی میں ہے) پڑھا اور پوچھا کہ قدم تو سب ہی لوگ اُٹھاتے ہیں، تو کیا خدا ان سب ہی کو یہ غذا دے گا؟

امام نے تبسم فرمایا ؛ کہا : اسے مردِ عرب ! اس آیت کے صحیح الفاظ لا یأکلہ الّا الخاطئون ہیں۔ اس نے عرض کیا : اے امیرالمومنینؑ ! آپ نے سچ فرمایا ہے، خدا کسی بے خطا بندے کو عذاب کے سپرد نہیں کرے گا۔ اس کے بعد امامؑ نے 'ابوالاسود' کی طرف جو ایک ادیب شخص تھا رُخ کیا اور فرمایا : اس وقت عربی زبان سے بیگانہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے ہیں۔ ایسا کام کرو کہ وہ اپنی زبان کی اصلاح کر سکیں۔ اس حکم کے بعد ابوالاسود نے الفاظِ قرآن پر نصب اور کسر (زبر، زیر، پیش) کی علامت لگائی۔

❖ ❖ ❖

(۳۸) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ
(۳۹) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ
(۴۰) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ
(۴۱) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ
(۴۲) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ
(۴۳) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ترجمہ

(۳۸) قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھ رہے ہو۔
(۳۹) اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے۔
(۴۰) کہ یہ قرآن، ایک بزرگوار رسول کی زبان سے نکلا ہوا کلام ہے۔
(۴۱) اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔
(۴۲) اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ لیکن تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو۔
(۴۳) (بلکہ یہ وہ کلام ہے جو) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

تفسیر

یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں قیامت اور مومنین و کفّار کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں قرآن مجید اور نبوت کے بارے میں ایک فصیح و بلیغ بحث کرتا ہے تاکہ "نبوّۃ" اور "معاد" کی بحث ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔

پہلے فرماتا ہے: "قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھتے ہو" (فلا اقسم بما تبصرون)۔

"اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے" (وما لا تبصرون)۔

مشہور یہ ہے کہ لفظ لا اس قسم کے موارد میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ لا یہاں بھی نفی کے معنی دیتا ہے۔ یعنی میں ان امور کی قسم نہیں کھاتا، کیونکہ اولاً تو اس قسم کی ضرورت نہیں اور ثانیاً، قسم خدا کے نام کی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اور مُناسب وہی پہلا معنی ہے کیونکہ قرآن مجید میں خدا کے نام اور غیر خدا کے نام کی قسمیں بہت زیادہ ہیں۔

ماتبصرون وما لاتبصرون کا جملہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام چیزوں کو جنھیں انسان دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے، گھیرلیتا ہے، دُوسرے لفظوں میں یہ سارے عالمِ "شہود" اور "غیب" کو شامل ہے۔

ان دو آیات کی تفسیر میں دیگر احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے: "ما تبصرون" سے مراد عالمِ خلقت ہے اور "ما لا تبصرون" سے مُراد خالق ہے، یا یہ کہ اس سے مُراد ظاہری اور باطنی نعمتیں، یا انسان اور فرشتے، یا اجسام و ارواح، یا دُنیا و آخرت ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ان دونوں تعبیروں کے مفہوم کی وسعت اس کے معنی کو محدود کرنے سے مانع ہے۔ اس بناء پر افقِ نگاہ میں جو کچھ آتا ہے اور جو نہیں آتا وہ سب اس سوگند وقسم میں داخل ہے لیکن اس کا شمول خدا کی نسبت بعید نظر آتا ہے، کیونکہ خالق کو مخلوق کے ساتھ قرار دینا مناسب نہیں ہے، خصوصاً "ما" کی تعبیر کے ساتھ کہ جو عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انسان آنکھ سے نہیں دیکھتا وہ بہت کچھ ہے۔ موجودہ علم و دانش نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ محسوسات، موجودات کے ایک محدود دائرے کو ہی شامل ہوتے ہیں اور جو کچھ افق حس میں نہیں آتا، چاہے وہ رنگ ہوں یا آوازیں، ذائقے ہوں یا امواج وغیرہ، وہ کئی درجے زیادہ ہیں۔

وہ ستارے جو کرۂ ارض کے دونوں آدھے حصّوں کے مجموعہ میں آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں، ماہرین کے حساب کے مطابق تقریباً پانچ ہزار ستارے ہیں جبکہ وہ ستارے جو آنکھ سے دیکھے نہیں جاتے وہ اربوں کھربوں سے بھی زیادہ ہیں۔

وہ صوتی امواج (آواز کی لہریں) جن کا ادراک کرنے پر انسان کے کان قُدرت رکھتے ہیں بہت ہی محُدود لہریں ہیں جبکہ ہزارہا دوسری ایسی صوتی لہریں موجُود ہیں کہ جن کے سننے کی انسانی کان قدرت نہیں رکھتے۔

وہ رنگ جنھیں ہم دیکھ سکتے ہیں سات مشہور رنگ ہیں لیکن آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بنفشئی اور قرمزی رنگوں کے علاوہ بے شمار دُوسرے ایسے رنگ ہیں کہ جن کے مشاہدے کی ہماری آنکھ میں بالکل ہی قدرت نہیں ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے جانداروں کی تعداد جو آنکھ سے دیکھے نہیں جا سکتے اس قدر زیادہ ہے کہ اس نے تمام دُنیا کو پُر کر رکھا ہے، بعض اوقات وہ پانی کے ایک قطرے میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اس حال میں یہ بات کتنی دردناک ہے کہ ہم اپنے آپ کو محسوسات کے زندان میں قید کرلیں اور محسوسات کی دنیا کے باہر سے بے خبر ہو جائیں یا اس کا انکار کر دیں؟

عالم ارواح ایک ایسا عالم ہے جو دلائل عقلی بلکہ تجرباتی دلائل سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔ وہ عالم ہمارے عالم جسم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں محسوسات کی چار دیواری میں کس طرح قید رہا جا سکتا ہے؟

⁂

اس کے بعد والی آیہ میں اس عظیم و بے نظیر سوگند و قسم کے نتیجہ اور جواب کو ذکر کرتے ہُوئے فرماتا ہے:

"یہ قرآن ایک بزرگوار رسُول کی گفت گُو ہے" (انّه لقول رسول کریم)۔

"رسُول" سے مُراد یہاں بلاشک وشبہ اسلام کے پیغمبر گرامیؐ ہیں نہ کہ جبرئیل، کیونکہ بعد والی آیات وضاحت کے ساتھ اس معنی کی گواہی دیتی ہیں۔

اور یہ جو کہتا ہے کہ یہ ایک بزرگوار رسُول کی گفتگو ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ اس کی تبلیغ کرنے والے ہیں، خصوصًا جبکہ ان کی 'رسالت' کے وصف کا ذکر ہوا ہے جیسا کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسُول جو کچھ لاتا ہے وہ بھیجنے والے کی بات ہوتی ہے، اگرچہ وہ رسُول کی زبان سے جاری اور اس کے لب ہائے مُبارک سے سُنا جاتا ہے۔

⁂

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو" (وما هو بقول شاعر قليلًا ما تؤمنون)[1]

(حاشیہ [1] اگلے صفحہ پر)

اور یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں ہے ، اگرچہ تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو" (ولا بقول کاهن ما تذکرون)۔

حقیقت میں یہ دونوں آیات ان ناروا نسبتوں کی نفی ہیں ، جو مشرکین اور مخالفین ذاتِ پیغمبرؐ کی طرف دیتے تھے ۔ کبھی کہتے تھے کہ وہ شاعر ہے اور یہ آیات اس کے اشعار ہیں ، کبھی کہتے کہ وہ کاہن ہے یہ آیات اس کی کہانت ہیں کیونکہ کاہن ایسے لوگ ہوتے تھے جو بعض اوقات جنّ یا شیاطین سے ارتباط کی بناء پر غیب کے بعض اسرار بیان کیا کرتے ۔ اور خصوصیت کے ساتھ اپنے الفاظ کو مسجع اور موزوں جملہ بندی کے ساتھ پیش کرتے تھے ، چونکہ قرآن میں غیب کے اخبار بھی ہیں اور مخصوص نظم و ترتیب بھی ہے ، لہٰذا وہ پیغمبرؐ پر یہ تہمت لگاتے تھے ، حالانکہ کہانت اور قرآن کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

بعض نے ان آیات کے شانِ نزول میں نقل کیا ہے کہ جس شخص نے پیغمبرؐ کی طرف شعر و شاعری کی نسبت دی وہ ابوجہل تھا اور کہانت کی نسبت دینے والا "عقبہ" یا "عتبہ" تھا اور دوسرے لوگ ان کی پیروی کرتے ہوئے ان تہمتوں کی تکرار کرتے تھے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کے الفاظ میں ہم آہنگی اور ایسی خوبصورت موزونیت ہے ، جو کانوں کو بھلی لگتی ہے اور رُوح کو سکون بخشتی ہے ۔ لیکن یہ چیز نہ تو شاعروں کے شعر سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ ہی کاہنوں کے سجع و قوافی سے اس کا واسطہ ہے ۔

"شعر" عام طور پر تخیلات کی پیداوار اور بر افروختہ احساسات و عاطفی ہیجانات کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں ۔ اسی وجہ سے ان میں نشیب و فراز اور اُٹھنے اور گرنے کا عمل زیادہ ہوتا ہے ، جبکہ قرآن زیبائی اور جاذبیت کے باوجود ، کامل طور پر استدلالی ، منطقی اور عصلاتی مضامین کا حامل ہے ۔ اگر بعض اوقات یہ آئندہ کی پیش گوئیاں کرتا ہے تو یہ پیش گوئیاں قرآن کی اصلیت نہیں ہیں ، نیز یہ کاہنوں کی خبروں کے برخلاف سب کی سب سچی ہوتی ہیں ۔

"قلیلاً ما تؤمنون" اور "قلیلاً ما تذکرون" کے جملے ایسے افراد کی توبیخ و سرزنش کے لیے ہیں جو اس آسمانی وحی کو واضح نشانیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں ، لیکن کبھی اسے شعر قرار دیتے ہیں اور کبھی کہانت اور بہت کم ایمان لاتے ہیں ۔

٭ ٭ ٭

آخری زیرِ بحث آیت میں تاکید کے عنوان سے صراحت کے ساتھ کہتا ہے : "یہ قرآن عالمین کے پروردگار

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

۱۔ قلیلاً اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں ایک محذوف "مفعول مطلق" کی صفت ہے اور "ما" زائدہ ہے ، تقدیر میں اس طرح ہے : (تؤمنون ایماناً قلیلاً)

کی طرف سے نازل ہوا ہے": (تنزیل من رب العالمین) ۔[1]

اِس بنا پر قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت ، نہ پیغمبر اسلامؐ کے ذہن کی پیداوار اور نہ ہی جبریل کا کلام ہے، بلکہ وہ خدا کا کلام ہے جو بیشک وحی کے ذریعہ پیغمبرؐ کے پاک دل پر نازل ہوا ہے، یہی تعبیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں گیارہ مقامات پر آئی ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تنزیل مصدر ہے، اسم مفعول کے معنی میں اور ایک محذوف مبتداء کی خبر ہے، تقدیر میں اس طرح ہے "ھو منزل من رب العالمین"۔

۴۴ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ

۴۵ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ

۴۶ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۡ ۖ

۴۷ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ○

۴۸ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○

۴۹ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ○

۵۰ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○

۵۱ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ○

۵۲ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۠

ترجمہ

۴۴ اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا

۴۵ تو ہم اسے پوری قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے۔

۴۶ اس کے بعد ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔

۴۷ اور تم میں سے نہ کوئی روک سکتا نہ اس کی حمایت کرتا۔

۴۸ یہ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ایک تذکّر ہے۔

۴۹ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

۵۰ اور یہ کافروں کے لیے مایۂ حسرت ہے۔

۵۱ اور وہ خالص یقین ہے۔

۵۲ (اب جبکہ ایسا ہے تو) تم اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کرو۔

تفسیر

اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے۔

قرآن سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے ان آیات میں اس کی اصالت پر ایک واضح دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا ہے" (ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل)۔

❖ ❖ ❖

"تو ہم پوری قدرت کے ساتھ اس کو پکڑ لیتے" (لاخذنا منه بالیمین)۔

❖ ❖ ❖

"پھر ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔" (ثم لقطعنا منه الوتین)۔

❖ ❖ ❖

"اور تم میں سے کوئی بھی اس کام میں مانع نہ ہوتا اور نہ ہی اِس کی حمایت کرتا" (فما منکم من احد عنه حاجزین)۔[1]

اقاویل جمع ہے اقوال کی اور اقوال اپنی نوبت میں جمع ہے قول کی، تو اس بنا پر اقاویل جمع ہے اور یہاں اس سے مراد جھوٹی باتیں ہیں۔

"تقوّل" تَقَوُّل (بروزن تکلّف) کے مادہ سے ان باتوں کے معنی میں ہے جنھیں انسان خود اپنی طرف سے گھڑے اور ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

لاخذنا منه بالیمین (ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور سزا دیتے۔ کیونکہ انسان بہت سے کاموں

---

[1] "من احد" میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

کو دایئں ہاتھ سے انجام دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں زیادہ قدرت ہوتی ہے، اس طرح "یمین" قدرت ہے۔ [1]

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اور احتمالات بھی دیئے ہیں، چونکہ وہ غیر مانوس اور غیر موزوں ہیں لہٰذا ہم نے ان سے صرفِ نظر کیا ہے۔

"وتین" "دل کی رگ" کے معنی میں ہے، یعنی شہ رگ جو تمام اعضاء میں خون پہنچاتی ہے۔ اگر وہ کٹ جائے تو انسان کو فوراً اور ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر موت آجاتی ہے، یہ وہ سریع ترین سزا ہے جو کسی شخص کے بارے میں انجام پا سکتی ہے۔

بعض نے اس کی تفسیر اس رگ سے کی جس کے ساتھ دل آویزاں ہوتا ہے یا اس رگ سے جو جگر کو خون پہنچاتی ہے، یا رگِ نخاع جو مہروں کے ستون کے وسط میں ہوتی ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے صحیح نظر آتی ہے۔

"حاجزین" حاجز کی جمع ہے جو مانع اور رکاوٹ کے معنی میں ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر جھوٹ بولے اور خدا فوراً اس کو سزا دے اور اسے ہلاک کر دے تو پھر نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو تیزی کے ساتھ نابود ہو جانا چاہیے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اور ان میں بہت سے سالہا سال زندہ رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کا باطل مذہب ان کے بعد باقی رہا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "ہر مدعی" بلکہ یہ کہتا ہے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ اس طرح کا کام کرے، یعنی وہ پیغمبرؐ جسے خدا نے معجزہ دیا اور حقانیت کے دلائل نے اس کی تائید کی ہے، اگر وہ طریقِ حق سے منحرف ہو جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی اُسے مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ چیز لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا سبب بنے گی۔ [2]

لیکن جو شخص باطل دعویٰ کرتا ہے اور کوئی معجزہ یا واضح دلیل اپنی حقانیت پر نہیں رکھتا تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ خدا اُسے فوراً ہلاک کرے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا بطلان ہر اس شخص کے لیے جو حق کا طالب ہے واضح اور روشن ہے۔ مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں نبوّت کا مدّعی دلائل و معجزات کے ہمراہ ہو اور وہ حق کی راہ سے منحرف ہو جائے۔

اِس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض گمراہ فرقے اپنے پیشواؤں کے دعوے کے اثبات کے لیے اس

---

[1] اوپر والے جُملہ میں "مِن" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے اور تقدیر میں اِس طرح ہے۔ "لاخذناه باليمين"

[2] یہ وہی چیز ہے جو علم کلام کی کتب میں جھوٹے کے ہاتھ میں معجزہ قرار دینے کے عنوان سے پیش ہوتی ہے اور اس کو قبیح قرار دیا جاتا ہے۔

آیت سے تمسک کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے، ورنہ مسیلمہ کذاب جیسے افراد اور دوسرے جھوٹے مدعی بھی اس آیت سے اپنی حقانیت پر استدلال کر سکتے ہیں۔

* * *

بعد والی آیت میں تاکید اور یاد آوری کے لیے فرماتا ہے: "یہ قرآن یقینی طور پر پرہیزگاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔" (و انہ لتذکرۃ للمتقین)۔

ان کے لیے جو اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لیے تیار ہوں، راہِ حق کو طے کرنے پر آمادہ ہوں، ان کے لیے جو جستجو میں لگے رہتے ہیں، حقیقت کے طالب ہیں، قرآن ان کے لیے ذکر اور نصیحت ہے۔لیکن جو لوگ تقوٰی کی یہ حد نہیں رکھتے وہ یقیناً قرآنی تعلیمات سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

اِس لحاظ سے قرآن جو گہری، عمیق اور حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے وہ اس کی حقانیت کی ایک اور دلیل ہے۔

* * *

اس کے بعد کہتا ہے: "اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے ایک گروہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔" (و انّا لنعلم انّ منکم مکذبین)۔

لیکن ہٹ دھرم جھٹلانے والوں کا وجود ان کے حق پر نہ ہونے کی دلیل میں رُکاوٹ نہیں بن سکتا ہے، کیونکہ پرہیزگار اور حقیقت کے طالب ہی اس سے متذکر ہوتے ہیں۔وہ اس میں حق کی نشانیاں دیکھتے ہیں اور راہِ خدا میں قدم رکھ دیتے ہیں۔

اِس بناء پر جس طرح ایک روشن چراغ سے فائدہ اٹھانے کے لیے کم از کم یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی آنکھ کو کھلا رکھے اسی طرح نورِ قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی دل کی آنکھ اس کے اوپر کھُلی رکھنی چاہیے۔

* * *

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اور یہ قرآن کافروں کے لیے حسرت کا باعث ہے۔" (و انہ لحسرۃ علی الکافرین)۔

آج یہ اس کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن کل جو "یوم الظہور" اور "یوم البروز" ہونے کے ساتھ ساتھ "یوم الحسرت" بھی ہے وہ سمجھ لیں گے کہ انھوں نے ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کتنی عظیم نعمت کو ہاتھ سے دے دیا ہے اور کیسے کیسے دردناک عذاب اپنے لیے خرید لیے ہیں، وہ دن جس میں وہ مومنین کی بلندیاں اور پستیاں دیکھیں گے اور ان کا آپس میں موازنہ کریں گے تو حسرت کے ساتھ انگلی منہ میں داب لیں گے اور غصّہ اور غصّہ کی شدت سے اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹیں گے۔ "و یوم یعض الظالم علیٰ یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلاً۔" اس دن کو یاد کرو جب ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو شدتِ حسرت سے کاٹے گا اور کہے گا کہ اے کاش! میں رسُول کے راستے پر چلتا۔" (فرقان۔۲۷)

اِس بناء پر کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ مُنکرین کا شک وتردید یا تکذیب ، قرآن کے مفاہیم کے ابہام کی وجہ سے ہے ، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : "یہ قرآن یقینِ خالص اور حق یقین ہے" (وانہ لحق الیقین)۔

بعض مفسرین کے قول کے مُطابق حق الیقین کی تعبیر کسی چیز کی اپنی ذات کی طرف نسبت کی قبیل سے ہے کیونکہ 'حق' عین یقین ہے اور یقین عین حق ہے ، جیسا کہ ہم کہتے ہیں 'مسجد الجامع' اور 'یوم الخمیس' اور یہ ادبی اصطلاح کے مطابق اضافتِ بیانیہ ہے ۔

لیکن بہتر ہے یہ کہا جائے کہ یہ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے ۔ یعنی قرآن خالص یقین ہے ، یا دوسرے لفظوں میں یقین کے کئی مراحل ہوتے ہیں ۔

کبھی وہ دلیل عقلی سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ہم دھوئیں کو دور سے دیکھتے ہیں تو اس سے آگ کے وجود کا یقین حاصل ہو جاتا ہے حالانکہ ہم نے آگ کو نہیں دیکھا ، اس کو "علم الیقین" کہتے ہیں ۔

بعض اوقات ہم اور نزدیک جا کر آگ کے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں ۔اِس سے یقین اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے اور اس کو عین الیقین کا نام دیتے ہیں ۔

بعض اوقات ہم اس سے بھی زیادہ نزدیک چلے جاتے ہیں ، آگ کے پاس یا آگ کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اس کی سوزش کو اپنے ہاتھ سے لمس کرتے ہیں ۔ یقیناً یہ یقین کا بالاتر مرحلہ ہے اور اس کو حق الیقین کہتے ہیں ۔

اوپر والی آیت کہتی ہے کہ قرآن یقین کے اس قسم کے مرحلہ میں ہے ۔لیکن اس کے باوجود دل کے اندھے اس کا انکار کرتے ہیں ۔

❖ ❖ ❖

پھر آخری زیرِ بحث آیت جو سورۂ حاقہ کی آخری آیت ہے ، اس میں فرماتا ہے : "اب جبکہ ایسا ہے ، تو اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کر اور اس کو ہر قسم کے عیب ونقص سے منزہ شمار کر (فسبح باسم ربك العظیم)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت کا مضمون تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۃ واقعہ کے آخر میں بھی آیا ہے ، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں گفتگو قرآن مجید کے بارے میں ہے اور اس کی توصیف "حق الیقین" کے ساتھ ہوئی ہے ، لیکن سورۃ واقعہ کے آخر میں قیامت میں نیکو کاروں کے مختلف گروہوں کے بارے میں گفتگو ہے ۔

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں قرآن کی توصیف چار صفات کے ساتھ کی گئی ہے۔
پہلے کہتا ہے: یہ رب العلمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔
اس کے بعد کہتا ہے: یہ متقین کے لیے یاد آوری اور تذکر ہے۔
پھر کہتا ہے: کافروں کے لیے حسرت و ندامت کا باعث ہے۔
اور آخری مرحلہ میں مزید کہتا ہے: یہ "حق الیقین" ہے۔
ان میں سے پہلی صفت تمام لوگوں کے لیے ہے۔
دوسری صفت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔
تیسری صفت کفار کے ساتھ مربوط ہے۔
اور چوتھی صفت خاصانِ خدا اور مقربین سے مربوط ہے۔

❖ ❖ ❖

خداوندا! تو خود جانتا ہے کہ کوئی چیز سرمایۂ یقین سے برتر نہیں ہے۔ ہمیں ایسا ایمان اور یقین مرحمت فرما جو "حق الیقین" کا مصداق ہو۔

پروردگارا! قیامت کا دن یوم الحسرت ہے، ہمیں کم از کم ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جنھیں طاعتوں کی کمی پر حسرت ہو، نہ کہ کثرتِ گناہ اور ترکِ طاعت پر حسرت و ندامت ہو۔

بارِ الٰہا! ہمارا نامۂ اعمال ہمارے دائیں ہاتھ میں دینا اور ہمیں اپنی جنتِ عالیہ اور عیشۂ راضیہ (پسندیدہ زندگی) میں داخل فرمانا۔ آمین یا ربّ العالمین۔

❖ ❖ ❖

سورہ حاقہ کا اختتام ۵ ذی القعد ۱۴۰۶ھ
تفسیر نمونہ جلد ۲۴ کا اختتام

اختتامِ ترجمہ

بروز اتوار بوقت ساڑھے پانچ بجے دوپہر
بتاریخ ۲۰ ذی الحجۃ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۹۸۷ء
بدستِ حقیر پُرتقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم
بر مکان سیٹھ نوازش علی ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور
الحمد للہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و آلہ سرمداً ابداً

سورۂ معارج

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۴ آیات ہیں

تاریخ شروع

۵؍ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ

سُورۂ معارج کے مطالب

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ سورہ معارج مکّی سورتوں میں سے ہے اور "فہرست ابنِ ندیم" و "کتاب نظم الدرر" و "تناسق الآیات والسور" کی بنیاد پر، ابوعبداللہ زنجانی کی "تاریخ القرآن" کے مطابق، یہ سُورہ (۷۷) سترہواں سُورہ ہے جو مکّہ میں نازل ہوا۔

لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہے کہ اس کی بعض آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور یہ بات سورہ معارج پر ہی منحصر نہیں ہے کیونکہ قرآن کے بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکّی ہیں لیکن ان میں ایک یا کئی آیات ایسی ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور اسی طرح اس کے برعکس بعض مدنی سورتوں میں مکّی آیات موجود ہیں۔

اس موضوع کے بہت سے نمونے "علامہ امینی" نے "الغدیر" میں پیش کیے ہیں [1]

اس بات کی دلیل کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ بہت سی روایات ہیں جو ان شاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی۔

بہرحال مکی سورتوں کی خصوصیات، مثلاً اصولِ دین کے بارے میں بحث، خاص طور پر معاد اور مشرکین و مخالفین کو ڈرانے کے بارے میں اس سورہ میں کامل طور سے نمایاں ہے اور مجموعی طور سے یہ سُورہ چار حصّوں پر مشتمل ہے۔

__پہلا حصّہ__: اس شخص کے لیے جلدی ہونے والے عذاب کی بات کرتا ہے جس نے پیغمبر کے بعض ارشادات کا انکار کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر یہ بات حق ہے تو مجھ پر عذاب نازل فرما اور عذاب نازل ہوگیا۔ (آیہ ۱ تا ۳)

__دوسرا حصّہ__: قیامت کی بہت سی خصوصیات اور اس کے مقدّمات، اور اس دن کفّار کے حالات کے بارے میں آیا ہے (آیہ ۴ تا ۱۸)۔

__تیسرا حِصّہ__: اچھے اور بُرے انسانوں کی صفات کے ان حصوں کو بیان کرتا ہے جو اسے جنتی اور دوزخی بنا دیتے ہیں۔ (آیہ ۱۹ تا ۳۴)

__چوتھا حصّہ__: مشرکین و منکرین کو ڈرانے والی باتوں پر مشتمل ہے اور پھر دوبارہ مسئلہ قیامت کی طرف لوٹتا اور سُورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرؐ سے آیا ہے:

---

[1] الغدیر جلد ۱ ص ۲۵۵ تا ۲۵۷

"من قرأ "سأل سائل" اعطاه الله ثواب الذين هم لاماناتهم وعهدهم راعون و الذين هم على صلواتهم يحافظون".

"جو شخص سورہ "سأل سائل" کو پڑھے تو خدا اسے ان لوگوں کا ثواب دے گا جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں" [1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

"من ادمن قرأته "سأل سائل" لم يسأله الله يوم القيامة عن ذنب عمله واسكنه جنته مع محمد (ص)".

"جو ہمیشہ سورہ "سأل سائل" کو پڑھے تو خدا قیامت کے دن اس سے اس کے گناہوں کی باز پرس نہیں کرے گا اور اس کو جنت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سکونت عطا فرمائے گا" [2]

یہی مضمون امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ بات جو انسان کو ان سب عظیم ثوابوں کا مشمول قرار دیتی ہے، وہ ایسی تلاوت ہے جو عقیدہ و ایمان کے ساتھ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی ہو، نہ یہ کہ وہ آیات اور سورہ کو تو پڑھے لیکن اس کی روح اور فکر و عمل میں کسی قسم کا انعکاس نہ ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۰

[2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

۱۔ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ○

۲۔ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ لَيۡسَ لَهٗ دَافِعٌ ○

۳۔ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الۡمَعَارِجِ ○

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

۱۔ ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا سوال کیا جو واقع ہو گیا۔

۲۔ یہ عذاب کفّار کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص اسے دفع نہیں کر سکتا۔

۳۔ یہ ذی المعارج خدا کی طرف سے ہے (وہ خدا جس کے فرشتے آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں)۔

شانِ نزول

بہت سے مفسّرین اور محدّثین نے ان آیات کی ایک شانِ نزول بیان کی ہے، جس کا ماحصل اس طرح ہے:

"جب رسولِ خدا نے علیؑ کو "غدیرِ خم" کے دن خلافت پر نصب فرمایا تو ان کے بارے میں یہ ارشاد کیا من کنت مولاہ فعلی مولاہ" "جس جس کا میں مولیٰ و ولی ہوں، اس اس کے علی مولیٰ و ولی ہیں"۔ زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ یہ بات سارے شہروں اور بستیوں میں پھیل گئی۔ نعمان بن حارث فہری، پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم یہ گواہی دیں کہ خدا واحد و یگانہ ہے اور آپ اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں تو ہم نے گواہی دی۔ اس کے بعد آپ نے ہمیں جہاد، حج، روزہ، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہم نے ان سب کو قبول کر لیا لیکن آپ ان سب چیزوں پر راضی نہ ہوئے یہاں تک کہ اس جوان کو (علی کی طرف اشارہ کیا) اپنی جانشینی اور خلافت پر نصب فرمایا اور یہ کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کیا یہ بات خود آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی جانب سے ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: "قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ بات خدا کی طرف سے ہے۔"

نعمان نے منہ پھیر لیا اور یہ کہتا جاتا تھا:

اللّٰھم ان کان ھٰذا ھوالحق من عندك فامطر علینا حجارة من السماء:

خداوندا! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسا"

اسی وقت ایک پتھر آسمان سے اس کے سر پر گرا اور اسے مار ڈالا، اسی موقع پر آیہ سأل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہ دافع" نازل ہوئی۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، یہ اس عبارت کا خلاصہ ہے جو "مجمع البیان" میں "ابوالقاسم حسکانی" سے اس کے سلسلہ سند کے ساتھ "امام صادق" سے نقل ہوئی ہے۔[1]

اس مضمون کو اہلِ سنت کے بہت سے مفسرین اور راویانِ حدیث نے بھی مختصر فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مرحوم "علامہ امینی" نے "الغدیر" میں اسے اہلِ سنت کے تیس مشہور علماء سے نقل کیا ہے (حوالہ اور اصل عبارت کے ساتھ) منجملہ ان کے:

- تفسیر "غریب القرآن"۔ حافظ ابوعبید ہروی۔
- تفسیر "شفاء الصدور"۔ ابوبکر نقاش موصلی۔
- تفسیر "الکشف والبیان"۔ ابواسحاق ثعالبی۔
- تفسیر "ابوبکر یحییٰ"۔ القرطبی۔
- تذکرہ "ابواسحاق"۔ ثعلبی۔
- کتاب "فرائد السمطین"۔ حموائتی۔
- کتاب "درر السمطین"۔ شیخ محمد زرندی۔
- تفسیر "سراج المنیر"۔ شمس الدین شافعی۔
- کتاب "سیرۂ حلبی"
- کتاب "نورالابصار"۔ سید مومن شبلنجی۔
- کتاب "شرح جامع الصغیر سیوطی"۔ شمس الدین شافعی۔ وغیرہ[2]

ان کتابوں میں سے بہت سی میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اوپر والی آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، البتہ اس سلسلہ میں کہ یہ شخص "حارث بن نعمان" تھا یا "جابر بن نذر" یا "نعمان بن حارث فہری" اختلاف ہے، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اس بات کا اصل مطلب پر کوئی مختلف اثر نہیں پڑتا۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۲

[2] الغدیر، جلد ا ص ۲۳۹ تا ۲۴۶

البتہ بعض مفسرین و محدثین جو علی کے فضائل کو خوشی سے قبول نہیں کرتے، انھوں نے اس شانِ نزول پر مختلف اعتراضات کیے ہیں جن کی طرف انشاء اللہ بحث کے آخر میں اشارہ ہوگا۔

تفسیر

فوری عذاب

سورۂ معارج یہاں سے شروع ہوتی ہے: "ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا تقاضا کیا جو واقع ہو گیا (سأل سائل بعذاب واقع)۔

یہ سوال کرنے والا جیسا کہ ہم نے شانِ نزول میں بیان کیا ہے "نعمان بن حارث" یا "نضر بن حارث" جو علی کے "غدیر خم" کے مقام پر خلافت و ولایت پر منصوب ہونے، اور اس خبر کے تمام شہروں میں منتشر ہونے پر بہت غصہ میں بھرا ہوا تھا، پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: کیا یہ بات آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی طرف سے ہے؟ پیغمبرؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: یہ بات خدا کی طرف سے ہے تو وہ اس سے اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا اور اس نے کہا: خداوندا! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر نازل فرما، اسی وقت ایک پتھر گرا اور اس کے سر پر لگا اور اسے مار ڈالا۔[1]

اس تفسیر کے مقابلہ میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے پیغمبرؐ سے سوال کیا کہ یہ عذاب جو آپ کہتے ہیں کس پر واقع ہوگا تو بعد والی آیت جواب دیتی ہے کہ کافروں کے لیے ہوگا۔

اور تیسری تفسیر کے مطابق یہ سوال کرنے والے خود پیغمبر ہیں جنھوں نے کفّار کے لیے عذاب کا تقاضا کیا اور وہ نازل ہوا۔

لیکن پہلی تفسیر، علاوہ اس کے کہ خود آیت کے ساتھ سازگار ہے، ان متعدد روایات پر منطبق بھی ہے جو شانِ نزول میں وارد ہوئی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ عذاب کافروں کے لیے مخصوص ہے اور کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا" (للکافرین لیس لہ دافع)۔[2]

بعد والی آیت میں اس ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس کی طرف سے یہ عذاب ہے، کہتا ہے: "یہ عذاب اس خدا کی طرف

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "بعذاب واقع" "میں" باء "زائد اور تاکید کے لیے ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق "عن" کے معنی میں ہے اور یہ دوسری تفسیر کے مطابق ہے (اس پر توجہ رہے کہ اگر سوال، تقاضا اور درخواست کے معنی میں ہو تو پھر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور اگر "استخبار" کے معنی میں ہو تو پھر اس کا دوسرا مفعول یقیناً "عن" کے ساتھ ہوگا)

[2] "واقع" عذاب کی صفت ہے اور "للکافرین" دوسری صفت ہے اور "لیس لہ دافع" تیسری صفت۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "للکافرین" "عذاب" سے متعلق ہو اور اگر "لام" "علی" کے معنی میں ہو تو پھر "واقع" سے متعلق ہوگا۔

سے ہے، جو ان آسمانوں کا مالک ہے جن کی طرف فرشتے صعود کرتے ہیں (من اللہ ذی المعارج)۔

"معارج" "معرج" کی جمع ہے، جو سیڑھی یا اس جگہ کے معنی میں ہے جہاں سے صعود کرتے اور اوپر جاتے ہیں اور چونکہ خدا نے فرشتوں کے لیے مختلف مقامات قرار دیئے ہیں کہ وہ مراتب کے لحاظ سے قربِ خدا کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، لہٰذا خدا کی "ذی المعارج" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔

ہاں فرشتے ہی کافروں اور مجرموں کے عذاب پر مامور ہوتے ہیں اور وہ بھی فرشتے ہی تھے جو ابراہیم خلیل پر نازل ہوئے تھے اور انھیں یہ خبر دی تھی کہ ہم قوم لوط کی بربادی پر مامور ہوئے ہیں اور صبح کے وقت انھوں نے اس آلودہ جرائم قوم کے شہروں کو تہ و بالا کر دیا[1] یہی فرشتے دوسرے مجرموں پر عذاب نازل کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "معارج" کی فضائل و مواہب الٰہیہ کے معنی میں اور بعض نے "فرشتوں" کے بارے میں تفسیر کی ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب اور اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے،

ایک نکتہ

بہانہ تراشوں کے بے ہودہ اعتراضات

عام طور پر وہ موارد، جن میں آیات و روایات، امیرالمومنین علیؑ کے مخصوص فضائل کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ان میں بعض لوگ اتنا اصرار کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے مطلب کو اہمیت نہ دی جائے، یا تو اسے نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی کوئی انحرافی توجیہہ کر دی جائے اور ایک خاص وسوسے اور باریکی کے ساتھ مسئلہ کو بیان کیا جائے، حالانکہ اگر یہ فضائل دوسرے لوگوں کے ہوتے تو دریا دلی اور سہولت کے ساتھ انھیں قبول کرتے۔

اس بات کا زندہ ثبوت اور واضح نمونہ وہ سات اعتراضات ہیں جو "ابن تیمیہ" نے "کتاب منہاج السنہ" میں ان احادیث کے بارے میں کیے ہیں جو اوپر والی آیات کے شانِ نزول میں آئی ہیں، جنھیں ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غدیر کا واقعہ، پیغمبرؐ کے حجۃ الوداع سے لوٹنے کے بعد یعنی سن دس ہجری میں واقع ہوا جبکہ سورۂ معارج مکی سورتوں میں سے ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

جواب: جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں بہت سے سُورے ایسے ہیں جو مکی کے نام سے موسوم ہیں جبکہ ان کی بعض ابتدائی آیات مفسرین کی تصریح کے مطابق مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے برعکس کچھ سورتیں ایسی ہیں جو مدنی کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان کی بعض آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔

۲۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ "حارث بن نعمان" پیغمبرؐ کی خدمت میں "ابطح" میں پہنچا اور ہم جانتے ہیں کہ "ابطح"

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۲۰۲ تا ۲۱۰ کی طرف رجوع کریں۔

زمین ایک درّہ ہے اور یہ اُمر واقعہ غدیر کے بعد آیت کے نزول کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

جواب: - اوّلاً: " ابطح " کی تعبیر صرف بعض روایات میں ہے نہ کہ سب میں، ثانیاً: " ابطح " و" بطحاء" ہر اس ریگزار زمین کے معنی میں ہے جس میں سیلاب کا پانی بہتا ہو اور اتفاقاً مدینہ کی سرزمین میں ایسے علاقے موجود ہیں جنھیں " ابطح " یا " بطحاء " کہا جاتا ہے اور اشعار عرب اور روایات میں ان کی طرف بہت زیادہ اشارہ ہوا ہے۔

۲۔ آیۂ (و اذ قالوا اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندك فامطر علینا حجارة من السماء) (انفال ــــ ۳۲) مسلّمہ طور پر جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی اور یہ واقعہ غدیر سے کئی سال پہلے ہے۔

جواب: کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ مذکورہ آیت کا شانِ نزول واقعہ غدیر ہے، بلکہ بحث آیہ رسأل سائل بعذاب واقع) کے بارے میں ہے۔

لیکن سُورۂ انفال کی آیہ ۳۲ ایک ایسی چیز ہے جس سے حارث بن نعمان نے اپنے کلام میں استفادہ کیا ہے اور اس بات کا شانِ نزول کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، لیکن افراطی تعصبات کے سبب سے، انسان ایسے واضح مطلب سے غافل ہوجاتا ہے۔

۴۔ قرآن مجید کہتا ہے؛ و ما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم و ما کان اللہ معذبھم و ھم یستغفرون)۔ خدا انھیں عذاب نہیں کرے گا جبکہ تم ان میں موجود ہو اور خدا انھیں عذاب نہیں کرے گا، درآنحالیکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔ (انفال ــــ ۳۳)۔ یہ آیت کہتی ہے کہ: پیغمبرؐ کی موجودگی میں ہرگز کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا۔

جواب: وہ بات جو قابلِ قبول ہے، یہ ہے کہ پیغمبر کے ہوتے ہوئے عمومی اور سب لوگوں کے لیے عذاب نہیں تھا۔ لیکن خصوصی اور شخصی عذاب بارہا بعض لوگوں پر نازل ہوئے، جیسا کہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کئی افراد مثلاً " ابوزمعہ " و " مالک بن طلالہ " و " حکم بن ابی العاص " وغیرہ پیغمبر کی نفرین سے یا اُس کے بغیر عذاب میں گرفتار ہوئے۔

علاوہ ازیں اوپر والی آیت کی اور تفاسیر بھی ہیں، جن کے مطابق اس مقام پر اس آیت سے استدلال ممکن نہیں ہے (تفسیر نمونہ جلد ۷ ص ۱۵۴ میں اسی آیہ ۳۳ انفال کے ذیل میں رجوع کیا جائے)۔

۵۔ اگر اس قسم کا شانِ نزول صحیح ہوتا تو اصحاب فیل کی داستان کی طرح مشہور ہوتا۔

جواب: - یہ شانِ نزول بقدر کافی مشہور و معروف ہے اور ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کم از کم تیس کتب تفسیر و حدیث میں آیا ہے اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ ایک شخصی واقعہ، اصحاب فیل جیسے عمومی واقع کی طرح مشہور ہو، کیونکہ وہ داستان ایک عمومی پہلو رکھتی تھی سارا مکہ اس کی لپیٹ میں تھا اور ایک بہت بڑا لشکر اس کے اندر نابود ہوا تھا۔ لیکن " حارث بن نعمان " کا واقعہ صرف ایک ہی شخص کے ساتھ مربوط تھا۔

۶۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ " حارث بن نعمان " کو صحابی اسلام قبول تھے، تو کسی مسلمان کا عصر پیغمبرؐ میں، اس قسم کے عذاب میں گرفتار ہوجانا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔

جواب: - یہ اعتراض بھی شدید تعصب کی پیداوار ہے کیونکہ اوپر والی احادیث اچھی طرح سے بتاتی ہیں کہ وہ نہ صرف پیغمبرؐ کے ارشاد کو قبول نہیں کرتا تھا بلکہ خدا پر بھی معترض تھا کہ اُس نے اس قسم کا حکم علیؑ کے بارے میں کیوں دیا، اور یہ کفر و ارتداد کا شدید ترین مرتبہ

شمار ہوتا ہے ۔

۷۔ "استیعاب" جیسی مشہور کتاب، جن میں "صحابہ" کے نام آئے ہیں "حارث بن نعمان" کا نام نہیں ہے ۔

جواب: اس کتاب میں یا اسی جیسی دوسری کتابوں میں صحابہ کے جتنے نام آئے ہیں وہ صحابہ کے صرف ایک حصّہ کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں ۔ مثلاً کتاب "اسد الغابہ" میں جو ایک اہم ترین کتاب ہے جس نے اصحاب پیغمبرؐ کو شمار کیا ہے صرف سات ہزار پانچ سو چون افراد کے نام آئے ہیں ۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف حجۃ الوداع میں ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد بارگاہِ پیغمبرؐ میں حاضر تھے ۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے اصحابِ پیغمبرؐ کے نام ان کتب میں نہیں آئے ہیں [1]

---

[1] اوپر والے جوابات کے سلسلے میں، اور ہر ایک کے تاریخی یا روایتی شواہد کے بارے میں کتاب نفیس "الغدیر" کی جلد ا ص ۲۴۷ تا ۲۶۶ کا مطالعہ فرمائیں ۔

۴۔ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ○

۵۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ○

۶۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ ○

۷۔ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ ○

ترجمہ

۴۔ فرشتے اور روح (مخصوص فرشتے) اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی۔ اس کی طرف عروج کریں گے۔

۵۔ اس بناء پر صبر جمیل اختیار کر۔

۶۔ کیونکہ وہ تو اس دن کو دور سمجھتے ہیں۔

۷۔ اور ہم اسے نزدیک سمجھتے ہیں۔

تفسیر

پچاس ہزار سال کے برابر دن

ایک شخص کے دنیاوی عذاب کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد۔ جس نے عذابِ الٰہی کا تقاضا کیا تھا۔ معاد اور مجرموں کے اس دن کے اخروی عذابوں کے مباحث کا بیان شروع کرتا ہے، پہلے فرماتا ہے: وہ فرشتے اور روح، اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی، اس (خدا) کی طرف عروج کریں گے (تعرج الملائکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ)۔

مسلمہ طور سے "فرشتوں کے عروج" سے مراد جسمانی عروج نہیں ہے بلکہ اس سے مراد روحانی عروج ہے، یعنی وہ خدا کے مقام قرب کی طرف بڑھیں گے، اور اس دن، جو قیامت کا دن ہے، فرمانِ خداوندی کو حاصل کرنے اور اس کے اجراء کے لیے آمادہ ہوں گے۔ جیسا کہ ہم نے سورہ "حاقہ" کی آیہ ۱۷ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "والملک علیٰ ارجائھا" (فرشتے آسمان کے اطراف میں قرار پائیں گے) کے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس دن وہ آسمانوں کے گرداگرد کھڑے ہوں گے اور ہر قسم کے فرمان کو انجام دینے کے لیے

آمادہ ہوں گے [1]

"روح" سے مراد وہی "روح الامین" ہے جو سب فرشتوں سے بزرگ ہے اور جس کی طرف سورہ "قدر" میں بھی اشارہ ہوا ہے، جہاں کہتا ہے: تنزل الملائکة والروح فیها باذن ربهم من کل امر:

"شب قدر میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے امور کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں" (قدر ـــــ ۴)

البتہ "روح" کے مختلف معانی ہیں اور ممکن ہے کہ وہ ہر موقع پر موجود قرائن کی مناسبت سے ایک خاص مفہوم دے۔ روح انسان روح بمعنی قرآن، روح بمعنی روح القدس اور روح بمعنی فرشتۂ وحی، یہ سب روح کے معانی ہیں۔ جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے [2]

اب رہی پچاس ہزار سال کی تعبیر تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ زیر بحث دن دنیا کے سالوں کے حساب سے اتنا طولانی ہوگا اور یہ بات اس چیز سے کہ جو سورۂ سجدہ کی آیہ ۵ میں آئی ہے کہ اس کی مقدار ایک ہزار سال ہے، اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ ـــــ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے ـــــ قیامت میں پچاس موقف ہوں گے اور ہر موقف ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر ہوگا [3]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "پچاس ہزار سال" کا عدد تکثیر کے لیے ہے نہ کہ تعدد کے لیے، یعنی وہ دن بہت طولانی ہوگا بہرحال یہ مجرموں، ظالموں اور کافروں کے لیے ہوگا، اسی لیے ایک حدیث میں "ابوسعید خدری" سے آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! وہ دن کتنا طولانی ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ انه لیخف علی المؤمن حتّٰی یکون اخف علیه من صلاة مکتوبة یصلیها فی الدنیا

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے وہ دن مومن کے لیے بہت ہی ہلکا اور آسان ہوگا، یہاں تک کہ وہ ایک واجب نماز سے بھی زیادہ آسان ہوگا، جو وہ دنیا میں پڑھا کرتا تھا" [4]

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "صبر جمیل اختیار کر اور ان کے استہزاء، تکذیب اور آزار کے مقابلہ میں صبر سے کام لے (فاصبر صبرًا جمیلًا)۔

---

[1] "فرشتوں کے عروج" کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نزول و صعود کا زمانہ ہے جو آغاز دنیا سے لے کر اس کے اختتام تک ہے اور وہ مجموعی طور پر پچاس ہزار سال ہے، جو دنیا کی تمام عمر ہے لیکن بعد والی آیات اچھی طرح بتاتی ہیں کہ گفتگو قیامت کے دن کے بارے میں ہے نہ کہ دنیا کے متعلق (غور کیجیے)۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۱۲ ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ کی طرف رجوع کریں۔

[3] یہ حدیث امالی شیخ میں امیرالمومنین علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۱۲

[4] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۵۲، اور "قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۷۶۱

" صبر جمیل " کا معنیٰ خوبصورت اور قابلِ توجہ صبر و شکیبائی ہے اور وہ وہی صبر و استقامت ہے جس میں دوام و استمرار ہو، جس میں یاس و ناامیدی نہ ہو، اور وہ بے تابی، جزع و فزع و شکوہ اور آہ و نالہ سے توأم نہ ہو، اس صورت کے علاوہ وہ جمیل نہیں ہے[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: " کیونکہ وہ اس قسم کے دن کو بعید اور دور سمجھتے ہیں (انھم یرونہ بعیدًا)۔

اور ہم اسے قریب اور نزدیک سمجھتے ہیں (ونراہ قریبًا)۔

وہ بالکل باور ہی نہیں کرتے کہ اس قسم کا دن بھی ہوگا جس میں تمام مخلوق کا حساب لیا جائے گا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی گفتار و رفتار کا بھی محاسبہ ہوگا۔ وہ بھی ایسے دن میں جو پچاس ہزار سال طولانی ہوگا لیکن حقیقت میں ایسے لوگوں نے خدا کو پہچانا نہیں اور وہ اس کی قدرت میں شک اور تردد رکھتے ہیں۔

وہ یہ کہتے ہیں: کیا یہ ممکن ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں اور وہ مٹی جس کا ہر ذرہ مختلف گوشوں میں پراگندہ ہوجائے گا، دوبارہ جمع ہوکر زندگی کا لباس زیبِ تن کریں گی۔ (جیسا کہ قرآن نے اپنی آیات میں یہ تعبیریں ان سے نقل کی ہیں)۔ اس کے علاوہ کیا پچاس ہزار سال کا دن ممکن ہے ؟!۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا علم یہ کہتا ہے کہ آسمانی کرات میں، دن کی مقدار ہر کُرہ کی دوسرے کُرہ سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ کی مقدار کے تابع ہوتی ہے، جس میں وہ کُرہ اپنے محور کے گرد ایک مرتبہ چکر لگاتا ہے، اسی لیے چاند کے کُرہ کا دن زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہے، یہاں تک کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ زمین زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اپنی وضعی حرکت کی سرعت اور تیزی میں کمی کر دے اور اس کے ایک دن کی مقدار ایک ماہ یا ایک سال یا کئی سو سال کے برابر ہوجائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قیامت کا دن اس طرح ہوگا، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کے برابر دن، اس دنیا کے اندازوں کے ساتھ بھی کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔

---

[1] " صبر جمیل " کے سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ (جلد ۵) میں یعقوب و یوسف کی داستان میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۸۔ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ

۹۔ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ

۱۰۔ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۚ

۱۱۔ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ

۱۲۔ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ

۱۳۔ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ

۱۴۔ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۙ

۱۵۔ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۙ

۱۶۔ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ۚ

۱۷۔ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۙ

۱۸۔ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ

ترجمہ

۸۔ اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائے گا۔

۹۔ اور پہاڑ رنگین بکھری ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔

۱۰۔ اور کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبر گیری نہیں کرے گا۔

۱۱۔ وہ انھیں دکھائے جائیں گے (لیکن ہر شخص اپنے کام میں گرفتار ہوگا) گنہ گار چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے بدلے میں اپنی اولاد کو فدا کر دے۔

اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی (کو بھی)
اور اپنے اس قبیلہ کو بھی جو ہمیشہ اس کی حمایت کرتا تھا۔
اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو بھی، تاکہ وہ اس کی نجات کا سبب بن جائے۔
لیکن ہرگز ایسا نہیں ہوگا، آگ کے جلانے والے شعلے ہوں گے۔
جو ہاتھ پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کرلے جائیں گے۔
اور وہ ان لوگوں کو، جنھوں نے حکمِ خدا کی طرف سے روگردانی کی تھی، پکاریں گے:
اور انھیں بھی کہ جنھوں نے مال کو جمع کیا اور ذخیرہ کیا

تفسیر

وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبرگیری نہیں کریگا

ان آیات میں، قیامت کے بارے میں، گزشتہ مباحث کو، مزید تشریح و توضیح کے ساتھ جاری رکھا گیا ہے، فرماتا ہے:
"اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کے مانند ہوجائے گا (یوم تکون السماء کالمھل)[1]

اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہوجائیں گے (وتکون الجبال کالعھن)۔
"مھل" (بروزن قفل) پگھلی ہوئی دھات کے معنی میں ہے اور کبھی ایک خاص قسم کی تلچھٹ کے معنی میں ہوتا ہے جو زیتون کے تیل کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے اور یہاں وہی پہلا معنی ہی مناسب ہے، اگرچہ تشبیہ کے اعتبار سے آپس میں کوئی خاص فرق نہیں رکھتے۔
"عھن" دھنکی ہوئی رنگین اون کے معنی میں ہے۔
ہاں! اس دن آسمان ایک دوسرے سے جدا ہو کر پگھل جائیں گے اور پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اور پھر تیز آندھی سے فضا میں بکھر جائیں گے، اس اون کی طرح جسے تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا کرلے جاتی ہے، اور چونکہ پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں رنگین اون سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس ویرانی کے بعد، ایک نیا عالم ایجاد ہوگا اور انسان اپنی حیاتِ نو کو نئے سرے سے حاصل کرے گا۔

---

[1] "یوم" کے محل اعراب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ "قریبًا" سے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے بدل ہو یا ایک فعل محذوف سے متعلق ہو، مثلاً "اذکر"

جب اس جہانِ نو میں قیامت برپا ہوگی تو اس طرح سے حساب وکتاب اور اعمال کی جانچ پڑتال کی کیفیت وحشت ناک ... ہر شخص کو اپنی ہی فکر ہوگی، کوئی دوسرے کی خبر نہیں لے گا اور کوئی گہرا اور مخلص دوست اپنے دوست کا حال نہیں پوچھے گا (ولا ... حمیم حمیمًا)[1]

سب کے سب اپنے کام میں مشغول ہوں گے، ہر ایک کو اپنی ہی نجات کی فکر ہوگی، جیسا کہ سورۂ عبس کی آیہ ۳۷ میں آیا ... (لکل امرئٍ منهم یومئذ شأن یغنیه) اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح گرفتار ہوگا کہ اسے صرف ... ہی اپنی فکر ہوگی[2]

ایسا نہیں ہوگا کہ دوست وہاں پر دوستوں کو پہچانیں گے نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ "ان کے دوست انھیں دکھائے جائیں ... لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنی ہی مصیبت میں مبتلا ہوگا" (یبصرونهم)[3]

مسئلہ یہ ہے کہ ہول و وحشت اس سے کہیں زیادہ ہوگی کہ کوئی دوسرے کی فکر کر سکے۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اور اس وحشت ناک منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: حالت یہ ہوگی کہ مجرم و گنہگار ... گا کہ اپنی اولاد کو اس دن کے عذاب کے بدلے میں فدا کر دے (یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیه)۔

نہ صرف اپنی اولاد کو، بلکہ وہ یہ چاہے گا کہ "اپنی بیوی کو بھی اور اپنے بھائی کو بھی فدا کر دے (وصاحبته واخیه)

اور اسی بناء پر اس خاندان اور قبیلہ کو بھی جو اس سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی حمایت کیا کرتا تھا (وفصیلته التی تؤویه)

بلکہ تمام لوگوں کو جو روئے زمین میں ہیں، سب کو فدا کر دے تاکہ اس کی نجات ہو جائے (ومن فی الارض جمیعًا ...

---

[1] "حمیم" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اصل میں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے، اس کے بعد یہ لفظ گرم جوشی دکھانے والے مخلص اور دلی دوستوں پر بھی بولا جانے لگا۔

[2] اوپر والی آیت کے لیے اور دوسری تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے حالات کے متعلق سوال نہیں کرے گا، کیونکہ سب کی وضع وکیفیت ان کے چہرے سے عیاں ہوگی (وآنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است)؛ دوسری یہ کہ کوئی شخص دوسرے سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ اس کے اعمال کی ذمہ داری اٹھائے، کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے، لیکن صحیح وہی اوپر والی تفسیر ہے۔

[3] باوجود اس کے کہ "حمیم" دونوں مرحلوں میں مفرد کی صورت میں ہے، لیکن "یبصرونهم" میں دونوں ضمیریں جمع کی صورت میں آئی ہیں، کیونکہ وہ جنس کے معنی میں ہے۔

ثم ینجیہ)۔

ہاں ! اس دن خدا کا عذاب اتنا ہولناک ہوگا، کہ انسان یہ چاہے گا کہ وہ اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو ——— جن کا یہاں چار گروہوں (اولاد، بیویاں، بھائی اور قریبی رشتہ دار جو اس کے یار و مددگار رہتے) میں خلاصہ کیا گیا ہے ——— اپنی نجات کے لیے قربان کر دے، نہ صرف انھیں کو، بلکہ وہ تو اس بات کے لیے بھی تیار ہوگا کہ روئے زمین کے تمام انسان اس کی عذاب سے رہائی کے لیے قربان ہو جائیں ۔ !

"یود" "ود" کے مادہ سے (جو حب کے وزن پر ہے)۔ "تمنی" سے توأم "دوست رکھنے" کے معنی میں ہے اور بقول "راغب" ان دونوں معانی میں سے ہر ایک کے لیے (بلکہ دونوں معانی میں) بھی استعمال ہوتا ہے ۔

"یفتدی" "فداء" کے مادہ سے، کوئی چیز دے کر اپنے آپ کو مصائب و مشکلات سے محفوظ کرنے کے معنی میں ہے۔

"فصیلۃ" بمعنی "عشیرہ" اس خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں جس سے انسان منفصل اور جدا ہوا ہو۔

"تئویہ" "ایواء" کے مادہ سے، ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد پناہ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "ثم ینجیہ" کے جملہ میں "ثم" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان فدیوں اور قربانیوں کا اثر کرنا بہت بعید ہے (کیونکہ "ثم" عام طور پر، بعد، فاصلہ اور تراخی کے لیے آتا ہے)۔

لیکن ان تمام تمناؤں اور آرزوؤں کے مقابلہ میں فرماتا ہے : "ہرگز ایسا نہیں ہوگا" کوئی فدیہ اور قربانی قبول نہیں کی جائے گی ۔ (کلا)۔ "وہ تو آگ کے جلانے والے شعلے ہیں" (انها لظی)۔

ہمیشہ اس کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں اور جو چیز بھی اس کے پاس یا اس کی راہ میں آتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔ "ہاتھ، پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے" (نزاعة للشوی)۔

"لظی" "آگ کے خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور جہنم کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے، اور اوپر والی آیات میں دونوں معنی ممکن ہیں ۔

"نزاعة" اس چیز کے معنی میں ہے جو پے در پے جدا کرتی ہے۔

اور "شوی" ہاتھ، پاؤں اور اطراف بدن کے معنی میں ہے اور بعض اوقات بریاں کرنے اور بھوننے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے، کیونکہ جس وقت جلانے والی اور شعلہ ور آگ کسی چیز کو لگتی ہے تو پہلے اس کے اطراف و جوانب اور شاخ و برگ کو جلاتی ہے اور اس سے جدا کر دیتی ہے ۔

بعض مفسرین نے یہاں "شوی" کی بدن کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے سر کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے پنڈلی کے گوشت کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ سب معانی، اس وسیع مفہوم میں جو ہم نے بیان کیا ہے، جمع ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ساری مصیبت اور تکلیف کے باوجود موت اور مرنا درمیان میں نہیں ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو اس قسم کی آگ کا لقمہ ہیں، فرماتا ہے: "یہ جلانے والا شعلہ ان لوگوں کو جنھوں نے حکم خدا سے پشت پھیری اور اس کی اطاعت سے روگردانی کی، آواز دیتا ہے اور اپنی طرف بلاتا ہے" (تدعوا من ادبر وتولّٰی)۔

اور انھیں بھی، کہ جنھوں نے مال جمع کیے اور ان کا ذخیرہ کیا، اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کیا (وجمع فاوعٰی)۔ اس طرح سے یہ جلانے والی آگ، زبان حال سے، اور اس مخصوص کشش کے ساتھ، جو وہ مجرموں کے لیے رکھتی ہے، یا زبان قال سے جو خدا نے اسے دی ہے مسلسل انھیں آواز دیتی ہے، اور انھیں اپنی طرف بلاتی ہے، انھیں کو جو ان دو صفات کے حامل ہیں، ایمان کی طرف سے پشت کیے ہوئے اور خدا و رسول کی اطاعت سے سرتابی کیے ہوئے، اور دوسری طرف سے، ہمیشہ حرام و حلال سے مال جمع کرنے اور اسے ذخیرہ کرنے میں لگے ہوئے تھے، اور فقرا و مساکین کے حقوق کی طرف کوئی توجہ نہیں کیا کرتے تھے، یا اصلاً اس نعمت الٰہی یعنی مال کے فلسفہ کو سمجھتے ہی نہ تھے۔

۱۹- اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۙ
۲۰- اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۙ
۲۱- وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ۙ
۲۲- اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ ۙ
۲۳- الَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ ۙ
۲۴- وَالَّذِيۡنَ فِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۙ
۲۵- لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ۙ
۲۶- وَالَّذِيۡنَ يُصَدِّقُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ۙ
۲۷- وَالَّذِيۡنَ هُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّهِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ۚ
۲۸- اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمۡ غَيۡرُ مَاۡمُوۡنٍ

ترجمہ

۱۹- انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے۔
۲۰- جب اسے کوئی برائی پہنچے تو بے تابی کرتا ہے۔
۲۱- اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے منع کرتا ہے۔
۲۲- سوائے نماز پڑھنے والوں کے۔
۲۳- جو نماز کو بلاناغہ ہمیشہ بجالاتے ہیں۔
۲۴- اور (سوائے ان لوگوں کے) جن کے مال میں حق معلوم ہے۔
۲۵- سوال کرنے والوں اور محروموں کے لیے۔
۲۶- اور وہ لوگ جو جزا کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲۷۔ اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔
۲۸۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو پروردگار کے عذاب سے ہرگز امان میں نہیں سمجھتے۔

تفسیر

شائستہ انسانوں کے اوصاف

قیامت کے عذابوں کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، بے ایمان افراد کے اوصاف اور ان کے مقابلہ میں سچے مومنین کے اوصاف بیان کرتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایک گروہ اہلِ عذاب کیوں ہے اور ایک گروہ اہلِ نجات کیوں ہے؟

پہلے فرماتا ہے: "انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے" (ان الانسان خلق هلوعًا)۔

جب اسے کوئی برائی پہنچے تو جزع وفزع اور بیتابی کرتا ہے (اذا مسه الشر جزوعًا)۔

اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے دریغ کرتا ہے (اور روکتا ہے)۔ (واذا مسه الخير منوعًا)۔

بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت نے "هلوع" کا معنی حریص کہا ہے اور ایک گروہ نے اس کی "کم طاقت" کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ پہلی تفسیر کی بناء پر یہاں اس قسم کے انسانوں کے وجود میں تین منفی اخلاقی نکتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے "حرص" "جزع" و "بخل"، کیونکہ دوسری اور تیسری آیت "هلوع" کے معنی کی تفسیر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس لفظ میں دونوں معانی اکٹھے مراد ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفات ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، حریص افراد عام طور پر بخیل ہوتے ہیں اور برے حوادث میں کم تحمّل ہوتے ہیں اور اس کا عکس بھی صادق اور سچا ہے۔

یہاں ایک یا کئی سوالات سامنے آتے ہیں، کہ اگر خدا نے انسان کو سعادت وکمال کے لیے پیدا کیا ہے، تو پھر اس کی طبیعت میں شر اور بدی کو کیوں قرار دیا ہے؟

اور پھر یہ بات بھی ہے، کہ اگر خدا کسی چیز کو، کسی صفت کے ساتھ پیدا کرے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ پھر اپنی خلقت کی مذمت بھی کرے؟

اور ان تمام باتوں سے قطع نظر، قرآن سورہ "تین کی آیہ ۴ میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" "ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت اور ساخت میں پیدا کیا ہے"۔

مسلمہ طور پر اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کا ظاہر تو اچھا ہے لیکن اس کا باطن قبیح اور بُرا ہے، بلکہ انسان کی تمام کی تمام خلقت "احسن تقویم" کی صورت میں ہے اور اسی طرح وہ دوسری آیات جو انسان کے بلند مقام کی تعریف کرتی ہیں، تو یہ سب کی سب آیات، زیر بحث آیت کے ساتھ کس طرح سازگار ہیں ؟

ان تمام سوالات کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان میں ایسی قوتیں، غرائز اور صفات خلق فرمائی ہیں، جو اس کے تکامل وارتقاء اور سعادت کا بالقوہ ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔ اس بناء پر مذکورہ صفات و غرائز ذاتی طور پر بُری نہیں ہیں، بلکہ کمال کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، لیکن جب یہی صفات انحرافی راہ اختیار کریں اور ان سے سوءِ استفادہ ہونے لگے، تو نکبت، بدبختی اور شر و فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔

مثلاً یہ حرص ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جلد ہی سعی و کوشش سے رُک جائے اور کسی نعمت تک پہنچ کر سیر ہوجائے۔ یہ تو ایک بھڑکی ہوئی پیاس ہے، جو انسان کے وجود پر مسلط ہے۔ اگر یہی صفت تحصیل علم و دانش کی راہ میں استعمال ہو، اور انسان علم کے حصول میں حریص ہوجائے یا دوسرے لفظوں میں علم کا پیاسا اور عاشق بے قرار ہوجائے تو مسلمہ طور پر یہ بات، اس کے کمال کا سبب بنے گی، لیکن اگر وہ مادیات کی راہ میں استعمال ہونے لگے، تو پھر شر و بدبختی اور بخل کا سبب بنے گی۔

دوسرے لفظوں میں، یہ صفت حُبِ ذات کی ایک شاخ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حُبِ ذات ایک ایسی چیز ہے، جو انسان کو کمال کی طرف لے جاتی ہے، لیکن اگر یہ انحرافی راہ پر پڑ جائے تو انحصار طلبی (خود غرضی) و بخل و حسد وغیرہ کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسرے مواہب کے بارے میں بھی مطلب اسی طرح سے ہے، خداوند تعالیٰ نے ایٹم کے اندر ایک عظیم قدرت پیدا کی ہے، جو مسلمہ طور پر مفید اور سودمند ہے لیکن اگر ایٹم کی اس اندرونی قوت سے سوءِ استفادہ ہونے لگے اور اس سے ویران و تباہ کرنے والے ایٹم بم بنائے جانے لگیں، نہ کہ بجلی کے پاور ہاؤس اور دوسری صنعتوں کے وسائل، تو پھر یہی شر و فساد کا سبب بن جائے گا۔

اوپر والے بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے، ان تمام آیات کے معانی و مطالب کو ـــــ جو قرآن مجید میں انسان کے بارے میں آئی ہیں ـــــ جمع کیا جاسکتا ہے [1]

اس کے بعد شائستہ اور لائق انسانوں کا بیان ـــــ ایک استثنائی صورت میں ـــــ نو (۹) عمدہ صفات کے ضمن میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مگر نماز پڑھنے والے" (الّا المصلّین)۔

وہی نمازگزار جو اپنی نمازوں کو دوام بخشتے ہیں (الذین ھم علٰی صلاتھم دائمون)۔

---

[1] ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۵ کے ص ۹۶ تا ۹۸ پر "انسان در قرآن کریم" کے عنوان کے تحت (یونس آیہ ۱۲ کے ذیل میں) ایک اور وضاحت بھی کی ہے۔

یہ ان کی پہلی خصوصیت ہے، جو خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مسلسل اور دائمی طور پر ارتباط رکھتے ہیں اور یہ ارتباط نماز کے ذریعے پورا ہوتا
وہ نماز جو انسان کو فحشاء و منکر سے روکتی ہے، وہ نماز جو انسان کی روح اور جان کی پرورش کرتی ہے، اور اس کو ہمیشہ خدا کی یاد دلاتی رہتی
یہ مسلسل اور دائمی توجہ، غفلت و غرور اور دریائے شہوات میں ڈوب جانے، اور شیطان اور ہوائے نفس کے چنگل میں اسیر ہونے
باز رکھتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نماز پر مداومت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ حالتِ نماز میں رہیں، بلکہ مراد یہ ہے، کہ وہ معیّن اوقات
نماز کو انجام دیتے ہیں۔

اصولی طور پر ہر کارِ خیر اسی وقت انسان میں مثبت اثر کرتا ہے، جب کہ اس کی مداومت ہو، اور اسی لیے پیغمبر اکرمؐ سے ایک
حدیث میں آیا ہے:

ان احب الاعمال الی اللہ ما دام و ان قل

خدا کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہے کہ جس میں مداومت ہو، چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے یہ آیا ہے کہ: "اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی انسان نوافل میں سے کوئی چیز
اپنے اوپر فرض کرے تو ہمیشہ اس کی مداومت کرتا رہے"[2]

ایک اور حدیث میں اسی امام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ آیت نافلہ کی طرف اشارہ ہے اور آیہ والذین ھم علیٰ صلاتھم یحافظون)
(جو کچھ آیات کے بعد آئے گی) نماز فریضہ کو بیان کرتی ہے"[3]

یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ محافظت کی تعبیر تو واجب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے اور انھیں خاص طور پر معیّن اوقات میں ہی
انجام دینا چاہیے۔ باقی رہی مدام کی تعبیر تو یہ مستحب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے، کیونکہ انسان انھیں انجام بھی دے سکتا ہے اور کبھی چھوڑ
بھی سکتا ہے۔

بہر حال نماز کے ذکر کے بعد ــــ جو بہترین عمل اور مومنین کی بہترین حالت ہے ــــ ان کی دوسری خصوصیت پیش کرتے
ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جن کے اموال میں ایک حق معلوم ہے" (والذین فی اموالھم حق معلوم)۔

"سوال کرنے والوں اور محروموں کے لیے" (للسائل والمحروم)۔

---

[1] المعجم المفہرس للالفاظ الحدیث، جلد ۲ ص ۱۶۰ (مادہ دوام)

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۵

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۶

اس طرح سے وہ خالق سے اپنے ارتباط کی بھی حفاظت کرتے ہیں، اور مخلوقِ خدا کے ساتھ بھی اپنے رشتہ اور تعلق کو برقرار رکھتے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں "حق معلوم" سے مراد وہی "زکات" ہے۔ جس کی ایک مقدار معین ہے اس کے مصارف میں سے "سائل" اور "محروم" ہیں، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے، اور زکوٰۃ کا حکم مکہ میں نازل نہیں ہوا تھا یا اگر نازل ہوا تھا تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں تھی، لہٰذا بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ "حق معلوم" سے مراد زکات کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، جسے انسان اپنے اوپر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ حاجت مندوں کو دے گا، اس تفسیر کا شاہد و گواہ وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے، کہ جس وقت لوگوں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا کہ کیا وہ زکات کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

"هوالرجل یؤتیه الله الثروة من المال فیخرج منه الالف و الالفین والثلاثة آلاف و الاقل و الاکثر، فیصل به رحمه، و یحمل به الکل عن قومه":

ہاں! یہ اس شخص کے بارے میں ہے، جسے خدا مال و ثروت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس میں سے ایک ہزار، دو ہزار اور تین ہزار یا اس سے زیادہ یا کم الگ کر دیتا ہے اور اس سے صلہ رحمی کرتا ہے، اور اس کے ذریعے اپنی قوم سے مشقت اور بوجھ کو اٹھا لیتا ہے۔[1]

"سائل" اور "محروم" کے درمیان فرق یہ ہے کہ سائل تو اس شخص کو کہتے ہیں، جو اپنی حاجت پیش کر کے تقاضا اور سوال کرتا ہے اور "محروم" وہ شخص ہے جسے شرم و حیا، سوال و تقاضا کرنے سے مانع ہوتی ہے، اور ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"محروم" وہ شخص ہے جو کسب و کار میں زحمت و تکلیف اٹھاتا ہے لیکن اس کی زندگی پیچیدہ ہوگئی ہے۔[2]

مذکورہ حق کی مزید تشریح اور "سائل" و "محروم" کی تفسیر، تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ ص ۲۷۵ میں آچکی ہے۔ (ذاریات آیہ ۱۹ کے ذیل میں)۔

بہرحال اس کام کا انجام دینا ایک طرف تو اجتماعی اثر رکھتا ہے اور فقر و فاقہ اور محرومیت کے ساتھ مبارزہ کرتا ہے، اور دوسری طرف ان لوگوں پر جو اس پر عمل کرتے ہیں، اخلاقی اثر چھوڑتا ہے اور ان کے دل و جان کو حرص و بخل اور دنیا پرستی سے پاک کرتا ہے۔

بعد والی آیت ان کی تیسری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "وہ لوگ جو روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں"۔ (والذین یصدقون بیوم الدین)۔

اور چوتھی خصوصیت میں کہتا ہے: "اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں" (والذین هم من

---

[1] "نورالثقلین"، جلد ۵ ص ۴۱۷ (حدیث ۲۵ - ۲۷)

[2] ایضاً

عذاب ربھم مشفقون)۔

"کیونکہ وہ کسی شخص کو پروردگار کے عذاب سے امان میں نہیں سمجھتے" (ان عذاب ربھم غیر مأمون)۔

وہ ایک طرف تو روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اور "یصدقون" کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس بات پر توجہ رکھتے ہیں کہ حساب و کتاب اور جزا و سزا سے واسطہ پڑے گا۔

بعض مفسرین نے اس کی "تصدیقِ عملی" کے معنی میں، یعنی انجام وظائف اور ترک محرمات سے تفسیر کی ہے، لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے جو علمی اور عملی دونوں تصدیقوں کو شامل ہے۔

لیکن چونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص روزِ جزا پر ایمان تو رکھتا ہو، لیکن وہ اپنے آپ کو سزا کا مشمول نہ سمجھتا ہو، اس لیے کہتا ہے: وہ ہرگز اپنے آپ کو امان میں نہیں سمجھتے"۔ یعنی وہ ہمیشہ بازپرس کا احساس رکھتے ہیں۔ اپنے حسنات اور نیکیوں کو ناچیز اور اپنی برائیوں کو بڑا شمار کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

خف الله خوفًا انك لو اتيته بحسنات اهل الارض لم يقبلها منك، و ارج الله رجاءً انك لو اتيته بسيئات اهل الارض غفرها لك:

اے میرے فرزند! تو خدا سے اس طرح خائف رہ کہ اگر تو روئے زمین کے لوگوں کی نیکیاں لے کر بھی آئے تو بھی یہ احتمال دے کہ (شاید) خدا تجھ سے قبول نہ کرے، اور اس طرح اس سے امیدوار رہ کہ اگر تو تمام اہلِ زمین کے گناہ بھی رکھتا ہو تو بھی یہ احتمال دے کہ وہ تجھے بخش دے"۔[1]

یہاں تک کہ خود پیغمبر یہ فرمایا کرتے تھے:

لن يدخل الجنة احدًا عمله قالوا ولا انت يا رسول الله؟ قال ولا انا، الا ان يتغمدني الله برحمته!

"کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا، لوگوں نے عرض کیا اے رسولِ خدا کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں! میں بھی اسی طرح ہوں مگر یہ کہ خدا کی رحمت میرے شاملِ حال ہو"

---

[1] جامع الاخبار، ص ۱۱۳

۲۹۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ

۳۰۔ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ

۳۱۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ

۳۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ

۳۳۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۙ

۳۴۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۭ

۳۵۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۭ

ترجمہ

۲۹۔ اور وہ لوگ جو اپنے دامن کو بے عفتی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

۳۰۔ اور اپنی بیویوں اور کنیزوں کے سوا (جو بیویوں کے حکم میں ہیں) وہ کسی سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے، اور ان سے بہرہ مند ہونے پر ان کی کوئی ملامت نہیں ہوگی۔

۳۱۔ اور جو شخص اس سے زیادہ طلب کرے تو وہ تجاوز کرنے والا ہے۔

۳۲۔ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرتے ہیں۔

۳۳۔ اور وہ لوگ جو شہادتِ حق کے ادا کرنے کے لیے قیام کرتے ہیں۔

۳۴۔ اور وہ لوگ جو نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

۳۵۔ یہی لوگ جنت کے باغات میں عزت و تکریم سے رہیں گے۔

تفسیر

بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصّہ

گزشتہ آیات میں مومنین اور ان لوگوں کی، جو قیامت میں اہل جنت ہوں گے، مخصوص اوصاف میں سے چار صفات کا بیان ہوا تھا اور ان آیات میں دوسری پانچ صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو مجموعی طور پر نو صفات ہو جاتی ہیں۔

پہلی توصیف کے بارے میں فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی عفت[1] کی حفاظت کرتے ہیں"۔ (والذین ھم لفروجھم حافظون)۔

"مگر اپنی بیویوں اور کنیزوں کی نسبت، جن سے فائدہ اٹھانے میں انھیں کسی قسم کی ملامت اور سرزنش نہیں ہے (الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ خواہش جنسی، انسان کی سرکش خواہشات میں سے ہے اور بہت سے گناہوں کا سرچشمہ ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ تمام اہم جرائم کے اعمال ناموں میں، اسی خواہش کا اثر نظر آتا ہے، اس لیے اس پر کنٹرول کرنا اور اس کے حدود کی حفاظت کرنا، تقویٰ و پرہیزگاری کی اہم نشانیوں میں سے ہے، اسی بناء پر نماز، ضرورت مندوں کی مدد، قیامت کے دن پر ایمان اور عذابِ الٰہی سے خوف کے ذکر کے بعد، اسی خواہش پر کنٹرول کا ذکر ہوا ہے۔

وہ استثناء جو اس کے ذیل میں بیان ہوا ہے، وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام کی ہرگز یہ منطق نہیں ہے کہ یہ غریزہ اور خواہش کلی طور پر محو اور نابود ہو جائے اور کوئی شخص راہبوں اور پادریوں کی طرح قانونِ خلقت کے برخلاف قدم اٹھائے، کیونکہ یہ عمل غالباً غیر ممکن ہے اور یہ فرض امکان غیر منطقی ہے، اسی لیے راہب بھی اس خواہش کو زندگی کے منظر سے حذف نہیں کر سکے اور اگر وہ رسمی طور پر شادی بیاہ نہیں کرتے، تو ان میں سے بہت سے "چون بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" (جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو پھر دوسرا ہی کام کرتے ہیں)۔

اور اس طریقہ سے جو رسوائیاں ہوئی ہیں وہ کم نہیں ہیں، مسیحی مؤرخین "ویل دورانت" وغیرہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

"ازدواج" کی تعبیر دائمی اور مؤقت دونوں بیویوں کے لیے استعمال ہوتی ہے اور یہ جو بعض نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت "ازدواج موقت" (متعہ) کی نفی کرتی ہے، اس بناء پر ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ (عقد متعہ) بھی ازدواج (شادی) کی ایک قسم ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "اور جو لوگ اس کے علاوہ طلب کریں وہ تجاوز کرنے والے، اور خدائی حدود سے خارج ہیں" (فمن ابتغی وراء ذالک فاولٰئک ھم العادون)۔

---

[1] "فروج"، "فرج" کی جمع ہے۔ عضو تناسل کی طرف کنایہ ہے۔

اور اس طرح سے اسلام ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالتا ہے کہ جس میں فطری غرائز وخواہشات کا جواب بھی مل سکے اور وہ فحشاء وفساد جنسی اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بھی آلودہ نہیں ہے۔

البتہ کنیزیں اسلام کے نقطۂ نظر سے بیوی کے بہت سے شرائط اور قانونی ضابطوں کی حامل ہیں، اگرچہ ہمارے زمانے میں ان کا موضوع نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے اور تیسرے اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد وپیمان کی رعایت کرتے ہیں" (والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون)۔

البتہ "امانت" کا ایک وسیع معنی ہے، جو نہ صرف لوگوں کی ہر قسم کی مادی امانتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، بلکہ خدا، پیغمبروں اور ائمہ معصومین کی امانتوں کو بھی شامل ہے۔

خدا کی نعمتوں میں سے ہر نعمت اس کی ایک امانت ہے، اجتماعی مناصب خصوصاً حکومت کا منصب اہم ترین امانتوں میں سے ہے، اسی لیے امام باقرؑ اور امام صادقؑ کی مشہور حدیث میں آیہ" ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا "کی تفسیر میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ" ولایت وحکومت کو اس کے اہل کے سپرد کرو"۔[1]

سورۂ احزاب کی آیہ ۲، میں بھی یہ آیا ہے کہ تکلیف ومسئولیت (فرائض وواجبات) کا مسئلہ، خدا کی ایک عظیم امانت ہے: (انّا عرضنا الامانة علی السماوات والارض) اور سب سے اہم ترین، خدا کا دین وآئین اور اس کی کتاب قرآن، اس کی عظیم امانت ہے، جس کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیے۔

"عھد" بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو لوگوں کے عہد اور پیمانوں کو بھی شامل ہے اور خدا کے عہد اور پیمانوں کو بھی۔ کیونکہ "عہد" ہر وہ اقرار اور وعدہ ہے جو انسان دوسرے کے ساتھ کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاتا ہے، تو اس نے اس ایمان کے ساتھ ہی بہت وسیع ذمہ داریوں کو قبول کر لیا ہے۔

اسلام میں امانت کی حفاظت اور معاہدوں کا پابند ہونے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسے اسلام کی اہم ترین نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۲، سورۂ نساء کی آیہ ۵۸ کے ذیل میں، تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

چوتھی صفت کے بارے میں مزید کہتا ہے: "وہ لوگ جو شہادتِ حق کی ادائیگی کے لیے قیام کرتے ہیں" (والذین ھم بشھاداتھم قائمون)۔

کیونکہ عادلانہ شہادت کو قائم کرنا اور اس کو نہ چھپانا انسانی معاشرے میں قیامِ عدالت کی اہم ترین بنیادوں میں سے ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۱ ص ۳۸۰

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں، کہ ہم کسی کے خلاف گواہی دے کر ان کی عداوت ودشمنی مول کیوں لیں، اور اپنے لیے دردِ سر کیوں پیدا کریں لوگ حقوق انسانی کی طرف سے بے اعتنا، روحِ اجتماعی کے ناقد اور اجرائے عدالت کے سلسلہ میں غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو کئی آیات میں شہادتِ حق کی دعوت دی ہے اور شہادت کے چھپانے کو گناہ قرار دیا ہے[۱] نفقہ اسلامی میں بھی شہادت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، اور بہت سے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے اثبات کے لیے بنیاد شمار ہوتی ہے، اور اس کے لیے خاص احکام ہیں۔

آخری صفت میں جو حقیقت میں اس مجموعۂ صفات کی نویں صفت ہے، پھر دوبارہ نماز کے مسئلہ کی طرف لوٹتا ہے، جیسا کہ ان کا آغاز بھی نماز ہی سے ہوا تھا، فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں (والذین ھم علیٰ صلاتھم یحافظون)۔

اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، بعض قرائن کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نماز" "واجب نماز" کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ آیت میں "نماز نافلہ" کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ پہلی صفت میں، نماز کے ہمیشہ قائم رکھنے کی طرف اشارہ تھا، لیکن یہاں اس کے آداب وشرائط، ارکان وخصوصیات کی حفاظت کے متعلق گفتگو ہے، ایسے آداب جو نماز کے ظاہر کو بھی اس چیز سے کہ جو باعثِ فساد ہے، محفوظ رکھتے ہیں اور روحِ نماز کو بھی، جو حضورِ قلب ہے۔ تقویت دیتے ہیں اور اخلاقی رکاوٹوں کو بھی جو اس کی قبولیت کی راہ میں مانع ہوتے ہیں، دُور کر دیتے ہیں، تو اس بناء پر یہ ہرگز تکرار شمار نہیں ہوگا۔

یہ آغاز واختتام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ ان تمام اوصاف میں، نماز کی طرف توجہ، ان سب سے زیادہ برتر اور سب سے زیادہ اہم ہے، ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ "نماز تربیت کا عالی مکتب" اور تہذیبِ نفوس اور معاشرہ کی پاکسازی کا اہم ترین وسیلہ ہے۔

اور اس گفتگو کے آخر میں، ان اوصاف والوں کی اصلی راہ کو بیان کرتا ہے، جیسا کہ گزشتہ آیات میں مجرموں کی اصلی راہ کی تشریح کی تھی یہاں ایک مختصر اور پُر معنی جملہ میں فرماتا ہے: "وہ لوگ جو ان اوصاف کے حامل ہیں، ان کا ٹھکانا جنّت کے باغات ہیں اور انھیں ہر لحاظ سے عزت کے ساتھ رکھا جائے گا۔ (اولٰئک فی جنات مکرمون)[۲]

وہ محترم اور معزز کیوں نہ ہوں؟ جبکہ وہ خدا کے مہمان ہیں اور خدائے قادر ورحمٰن نے، تمام ضروری وسائل ان کے لیے فراہم کر دیئے ہیں، اور حقیقت میں یہ دونوں تعبیریں ("جنات" و "مکرمون") مادی ومعنوی دونوں قسم کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس گروہ کے شاملِ حال ہوں گی۔

۱۔ بقرہ ۲۸۲ - ۱۴۰، مائدہ ۱۰۶، طلاق ۲

۲۔ "فی جنات"، "اولئک" کی خبر ہے اور "مکرمون" دوسری خبر ہے، یا یہ کہ "مکرمون" خبر ہے اور "فی جنات" اس سے متعلق ہے (غور کیجیے)

۳۶۔ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝

۳۷۔ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝

۳۸۔ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝

۳۹۔ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

۴۰۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝

۴۱۔ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ ان کفار کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں ۔

۳۷۔ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی (جنّت کی طمع ہے)۔

۳۸۔ کیا ان میں سے ہر ایک کو یہ طمع ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں والی جنّت میں داخل ہوجائے ۔

۳۹۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا ، ہم نے انھیں اس چیز سے پیدا کیا ہے، جس کا انھیں خود علم ہے ۔

۴۰۔ مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم، ہم اس بات پر قادر ہیں ۔

۴۱۔ کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں، جو ان سے بہتر ہیں اور ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے ۔

تفسیر

کس منہ سے جنّت کی طمع ؟

اس سورہ کی گزشتہ آیات میں ، مومنین اور کفّار کی نشانیوں اور ان دونوں گروہوں کی سرنوشت کے بارے میں مختلف مباحث آئے ہیں ، اوپر والی آیات میں پھر کفّار کی وضع و کیفیت اور مقدساتِ اسلام کے بارے میں ان کے استہزاء اور تمسخر کی تفصیل کی طرف لوٹتا ہے ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات مشرکین کے ان گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس وقت جبکہ پیغمبرؐ معاد کی آیات کو

مسلمانوں کے سامنے پڑھتے تھے، تو وہ ہر گوشہ وکنار سے آجاتے تھے اور یہ کہتے تھے، کہ اگر معاد ہوئی تو ہماری وضع وکیفیت اس عالم میں ان افراد سے جو تجھ پر ایمان لائے ہیں، بہتر ہوگی، جیسا کہ اس دنیا میں بھی ہماری وضع وکیفیت ان سے بہتر ہے۔

قرآن ان کے جواب میں اس طرح کہتا ہے :

" ان کافروں کو کیا ہوگیا ہے، جو سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔ (فمال الذین کفروا قبلك مهطعین)۔

دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ در گروہ آتے ہیں اور جنت کی طمع رکھتے ہیں"۔ (عن الیمین وعن الشمال عزین)۔

"کیا ان میں سے ہر ایک یہ طمع رکھتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہوجائے گا" (ایطمع کل امرئ منهم ان یدخل جنّة نعیم)۔

یہ کون سے ایمان اور کون سے عمل کی بناء پر اپنے لیے اس قسم کی شائستگی اور لیاقت کے قائل ہیں ؟ !

"مهطعین" "مهطع" کی جمع ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے، جو گردن اٹھا کر تیزی کے ساتھ چلتا ہے اور کسی چیز کی جستجو میں ہوتا ہے اور کبھی صرف خبر معلوم کرنے کے لیے گردن اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔

"عزین" "عزة" (بروزن ہبہ) کی جمع ہے، جو پراگندہ جماعتوں اور گروہوں کے معنی میں ہے اور اس کا ریشہ اور اصلی جڑ "عزو" (بروزن جذب) نسبت دینے کے معنی میں ہے اور چونکہ وہ گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نسبت اور ارتباط رکھتے ہیں، یا ان کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے لہٰذا جماعت اور گروہ کو "عزہ" کہا گیا ہے۔

بہرحال خود غرض اور خود پرست مشرکین اس قسم کے بہت سے بے بنیاد دعوے رکھتے تھے اور اپنی مادی زندگی کے مرفہ اور خوش حال ہونے کو ــــــ جو عموماً ناجائز اور لوٹ مار وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، خدا کی بارگاہ میں اپنے مقام کی بلندی اور پروردگار کے نزدیک اپنی محبوبیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے بعد ایک بے معنی موازنہ کے ساتھ قیامت میں اپنے لیے بلند مقامات کے قائل تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ "معاد" پر اس طرح سے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے، عقیدہ نہیں رکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی احتمال کی بناء پر معاد پر بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہم اس دوسرے جہان میں اس طرح اور ایسے ہوں گے، شاید وہ یہ بات استہزاء اور تمسخر کے طور پر بھی کہتے تھے۔

یہاں قرآن ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے : " ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ بہشت میں داخل ہوجائیں، کیونکہ ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے، اس کا انھیں خود علم ہے"۔ (کلّا انّا خلقناهم ممایعلمون)۔

مسلمانوں کے سامنے پڑھتے تھے، تو وہ ہر گوشہ و کنار سے آجاتے تھے اور یہ کہتے تھے، کہ اگر معاد ہوئی تو ہماری وضع و کیفیت اس عالم میں ان افراد سے جو تجھ پر ایمان لائے ہیں، بہتر ہوگی، جیسا کہ اس دنیا میں بھی ہماری وضع و کیفیت ان سے بہتر ہے۔

قرآن ان کے جواب میں اس طرح کہتا ہے:

"ان کافروں کو کیا ہوگیا ہے، جو سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔ (فمال الذین کفروا قبلک مهطعین)۔

دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ در گروہ آتے ہیں اور جنت کی طمع رکھتے ہیں"۔ (عن الیمین وعن الشمال عزین)۔

"کیا ان میں سے ہر ایک یہ طمع رکھتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہوجائے گا" (ایطمع کل امرئ منهم ان یدخل جنة نعیم)۔

یہ کون سے ایمان اور کون سے عمل کی بناء پر اپنے لیے اس قسم کی شائستگی اور لیاقت کے قائل ہیں؟!

"مهطعین" "مهطع" کی جمع ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے، جو گردن اٹھا کر تیزی کے ساتھ چلتا ہے اور کسی چیز کی جستجو میں ہوتا ہے اور کبھی صرف خبر معلوم کرنے کے لیے گردن اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔

"عزین" "عزة" (بروزن ہبہ) کی جمع ہے، جو پراگندہ جماعتوں اور گروہوں کے معنی میں ہے اور اس کا ریشہ اور اصلی جڑ "عزو" (بروزن جذب) نسبت دینے کے معنی میں ہے اور چونکہ وہ گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نسبت اور ارتباط رکھتے ہیں، یا ان کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے لہٰذا جماعت اور گروہ کو "عزہ" کہا گیا ہے۔

بہرحال خود غرض اور خود پرست مشرکین اس قسم کے بہت سے بے بنیاد دعوے رکھتے تھے اور اپنی مادی زندگی کے مرفہ اور خوش حال ہونے کو ــــــ جو عموماً ناجائز اور لوٹ مار وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، خدا کی بارگاہ میں اپنے مقام کی بلندی اور پروردگار کے نزدیک اپنی محبوبیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے بعد ایک بے معنی موازنہ کے ساتھ قیامت میں اپنے لیے بلند مقامات کے قائل تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ "معاد" پر اس طرح سے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے، عقیدہ نہیں رکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی احتمال کی بناء پر معاد پر بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہم اس دوسرے جہان میں اس طرح اور ایسے ہوں گے، شاید وہ یہ بات استہزاء اور تمسخر کے طور پر بھی کہتے تھے۔

یہاں قرآن ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ بہشت میں داخل ہوجائیں، کیونکہ ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے، اس کا انھیں خود علم ہے"۔ (كلا انا خلقناهم مما یعلمون)۔

درحقیقت خدا یہ چاہتا ہے کہ پہلے تو اس جملہ کے ذریعہ ان کا غرور اور تکبر توڑ دے، کیونکہ وہ کہتا ہے: "تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے تمھیں کس چیز سے پیدا کیا ہے"؟ ایک بے قدر و قیمت نطفہ سے، ایک گندے اور پست پانی سے، تو پھر یہ اتنا غرور و نخوت کس بناء پر ہے؟۔

دوسرے معاد کا مذاق اڑانے والوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تم معاد و قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو، تو جاؤ اور نطفہ کی حالت کی تحقیق کرو اور دیکھو کہ ہم ایک بے قدر و قیمت پانی کے قطرے سے کس طرح ایک نیا اور عمدہ وجود پیدا کر دیتے ہیں، جو جنین کی صورت میں ہر روز ایک نئی خلقت اختیار کرتا ہے۔

تو کیا نطفہ سے انسان کو پیدا کرنے والا، اس بات پر قادر نہیں ہے، کہ وہ مٹی ہو جانے کے بعد، انسان کے بدن پر لباسِ حیات پہنا دے۔

"تیسرے" یہ لوگ کس طرح جنت کی طمع رکھتے ہیں، جبکہ وہ اپنے صحیفۂ اعمال میں اس قدر افعال گناہ رکھتے ہیں، کیونکہ وہ موجود جو ایک بے قدر و قیمت نطفہ سے پیدا ہوا ہے، مادی لحاظ سے تو کوئی شرافت و عظمت نہیں رکھتا، اگر کوئی شرف ہے تو وہ ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ہے اور وہ ان کے پاس نہیں ہے، تو پھر یہ لوگ کس طرح توقع رکھتے ہیں کہ وہ جنت کے باغوں میں قدم رکھیں گے[1]

اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم ہم اس بات پر قادر ہیں ...." (فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقادرون)۔

"کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں جو ان سے بہتر ہیں، اور ہم ہرگز بھی اس کام میں مغلوب نہیں ہوں گے" (علیٰ ان نبدل خیرًا منهم وما نحن بمسبوقین)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم نہ صرف اس بات پر قادر ہیں کہ انھیں مٹی ہو جانے کے بعد نئی زندگی اور حیات کی طرف پلٹا دیں، بلکہ ہم انھیں ایک زیادہ کامل اور بہتر موجودات میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں، اور اس کام میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

اس طرح سے اوپر والی تعبیر قیامت کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمارے لیے کوئی مانع نہیں ہے کہ ہم تمھیں تمھارے کیفر کردار کی بناء پر نابود کریں اور شائستہ، آگاہ اور مومن افراد کو تمھارا جانشین بنا دیں، تاکہ وہ ہمارے پیغمبر کے یار و مددگار ہوں، ہمیں اس کام سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

اس بناء پر اگر ہم تم سے یہ اصرار کرتے ہیں کہ تم ایمان لے آؤ، تو وہ کسی حاجت یا عجز کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ بشر کے لیے

---

[1] اوپر والی آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ "مما یعلمون" سے مراد [illegible] ساتھ پیدا کیا ہے، نہ کہ حیوانات اور بہائیم کی طرح، اس بناء پر وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں۔ دوسرا احتمال [illegible] ایسے اہداف و مقاصد کے لیے جنھیں وہ خود جانتے ہیں۔ یعنی انھیں فرائض کی ادائیگی اور اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ سب احتمال بعید نظر آتے ہیں، لہٰذا اکثر مفسرین نے وہی معنیٰ جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، قبول کیا ہے۔

ہدایت وتربیّت کی مصلحت کلی کا تقاضا ہے ۔

"رب المشارق والمغارب" (مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو اس بات پر قادر ہے، کہ اتنے عظیم سورج کو ہر روز ایک نئے مشرق اور ایک نئے مغرب میں قرار دیتا ہے، اور یہ حساب کتاب اتنا وہ کئی ملین سال سے اپنے سالانہ دورے کو بے کم وکاست طے کرے، تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ایک دفعہ پھر انسان کو زندگی کی طرف لوٹا دے، اور اسے ایک نئی زندگی بخش دے، یا ایک گروہ کو لے جائے اور کسی دوسرے شائستہ اور لائق گروہ کو ان کا جانشین بنا دے ۔

ایک نکتہ

"مشارق" و "مغارب" کا خدا

قرآن مجید کی آیات میں کبھی تو "مشرق ومغرب" کی تعبیر مفرد کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سُورۂ بقرہ کی آیہ ۱۱۵ میں و للّٰہ المشرق والمغرب "مشرق ومغرب خدا ہی کے لیے ہے اور کبھی تثنیہ کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سُورۂ رحمٰن کی آیہ ۱۷ میں "رب المشرقین ورب المغربین"، "دو مشرقوں کا پروردگار اور دو مغربوں کا پروردگار" اور کبھی "جمع" کی صورت میں المشارق والمغارب جیسے زیرِ بحث آیت ہے۔

بعض کوتاہ نظر لوگوں نے ان تعبیروں کو متضاد خیال کیا ہے، حالانکہ وہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، اور ہر ایک کسی ایک کی طرف اشارہ ہے، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ سورج ہر روز ایک نئے نقطہ سے طلوع اور ایک نئے نقطہ میں غروب کرتا ہے، اس بناء پر سال کے دنوں کی تعداد کے برابر مشرق ومغرب ہیں اور دوسری طرف ان تمام مشرقوں اور مغربوں میں دو مشرق اور دو مغرب ممتاز ہیں، جن میں سے ایک موسم گرما کے آغاز میں یعنی مدار شمالی میں، خورشید کی بلندی کی زیادہ سے زیادہ حد کے موقع پر، اور ایک موسم سرما کے آغاز میں، یعنی مدار جنوبی میں سورج کے نیچے اترنے کی آخری حد (جن میں سے ایک کو "مدار راس السرطان" سے اور دوسرے کو "مدار راس الجدی" سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں پورے طور پر ممتاز ہیں لہٰذا خصوصیّت کے ساتھ ان کی بات ہوئی ہے، ان کے علاوہ دوسری دو مشرقیں اور دو مغربیں بھی ہیں، جنھیں مشرق اعتدالی اور مغرب اعتدالی کا نام دیتے ہیں (اوّل بہار اور اوّل خزاں میں جبکہ ساری دنیا میں رات دن برابر ہوتے ہیں) یہ بھی مشخص ہیں اور بعض نے "رب المشرقین و رب المغربین" کو اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور یہ بھی قابلِ توجّہ ہے ۔

لیکن جہاں یہ مفرد کی صورت میں ہے تو وہاں جنس کا معنی رکھتا ہے، کہ توجّہ صرف اہل مشرق ومغرب پر رہے، قطع نظر اس سے کہ افراد پر نظر کی جائے، اس طرح سے اوپر والی مختلف تعبیروں میں ہر کوئی ایک نکتہ رکھتی ہے اور انسان کو سورج کے طلوع وغروب کے مختلف تغیرات، اور سورج کے مداروں کے منظم تغیرات کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔

۴۲۔ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝

۴۳۔ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلٰى نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۝

۴۴۔ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل میں غوطہ زن رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں۔

۴۳۔ وہی دن جب وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ نکلیں گے، گویا وہ اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

۴۴۔ درآنحالیکہ ان کی آنکھیں شدت وحشت سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت وخواری کے پردہ نے انھیں ڈھانپ رکھا ہوگا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہی دن ہے جس کا تھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔

تفسیر

گویا اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں

ان آیات میں جو سورۂ معارج کی آخری آیات ہیں۔ ہٹ دھرم، ٹھٹھہ کرنے والے اور سخت کافروں کو انذار وتہدید کے عنوان سے فرماتا ہے: "انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل مطالب میں ڈوبے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں" (فذرهم يخوضوا ويلعبوا حتّٰى يلاقوا يومهم الذي يوعدون)[1]۔

---

[1] "یخوضوا" "خوض" (بروزن حوض) کے مادہ سے اصل میں پانی میں چلنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد کنایہ کے طور پر ان موارد میں جہاں انسان باطل مطالب میں غوطہ زن ہو، استعمال ہوا ہے۔

اس سے زیادہ استدلال اور موعظہ کی ضرورت نہیں ہے، وہ نہ تو اہلِ منطق ہیں اور نہ ہی بیدار ہونے کے لیے آمادگی رکھتے ہیں۔ وہ اپنی باطل اور بے ہودہ باتوں میں غوطہ زن ہیں اور بچّوں کی طرح کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ ان کا موعود دن، قیامت کا دن اور وہ ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔

یہ آیت اسی تعبیر کے ساتھ اور کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر سورۂ زخرف کی آیہ ۸۲ میں بھی آئی ہے۔

اس کے بعد اس موعود دن کا تعارف کراتے ہوئے اس وحشت ناک اور ہولناک دن کی نشانیاں بیان کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "وہ دن جس میں وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ خارج ہوں گے اور اس طرح تیزی سے چل رہے ہوں گے، گویا کہ وہ اپنے بتوں کی طرف جا رہے ہیں" (یوم یخرجون من الاجداث سراعًا کانھم الٰی نصب یوفضون)۔

کیسی عجیب تعبیر ہے؟ قیامت میں ان کی حالت کی کیفیت کی، جبکہ وہ تیزی کے ساتھ دادگاہ عدلِ الٰہی کی طرف چل رہے ہیں، ان کے کسی جشن یا عزا کے دن بتوں کی طرف، ہجوم کرنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، لیکن وہ کہاں اور یہ کہاں؟ اور حقیقت میں ان کے بے ہودہ عقائد کے بارے میں، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، ایک تمسخر اور استہزاء ہے۔

"اجداث" "جدث" (بروزن عبث) کی جمع ہے جو "قبر" کے معنی میں ہے۔

"سراع" "سریع" کی جمع ہے (جیسے ظراف و ظریف) اس شخص یا چیز کے معنی میں ہے، جو جلدی سے چلے۔

"نصب" "نصیب" کی جمع ہے اور وہ بھی بعض کے قول کے مطابق "نصب" (بروزن سقف) کی جمع ہے، یہ اصل میں اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی جگہ نصب ہوئی ہو اور ان بتوں کو بھی کہتے ہیں، جنھیں ایک پتھر کے ٹکڑے کی صورت میں کسی جگہ نصب کرکے اس کی پرستش کرتے تھے، اور اس کے اوپر قربانی کرکے اس کا خون اس پر ڈال دیتے تھے اور اس میں اور "صنم" میں یہ فرق تھا کہ "صنم" وہ بُت تھا، جس کی کوئی خاص شکل و صورت ہوتی تھی، لیکن "نصب" پتھر کے ایسے ٹکڑے ہوتے تھے جن کی کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی تھی، جن کی وہ کسی سبب سے پرستش کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۳ میں آیا ہے کہ وہ حرام گوشتوں میں سے اس جانور کے گوشت کو بھی شمار کرتے تھے جو ان بتوں پر ذبح ہوتے تھے (وما ذبح علی النصب)

"یوفضون" "افاضہ" کے مادہ سے، تیز چلنے کے معنی میں ہے، پانی کے چشمہ سے چلنے کی تیزی سے مشابہ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں نصب سے مراد وہ پرچم ہیں جنھیں لشکروں یا قافلوں کے درمیان کسی ایک جگہ نصب کر دیتے ہیں اور ہر شخص تیزی سے اپنے آپ کو ان تک پہنچاتا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد دوسری نشانیاں پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ اس حالت میں ہوگا کہ ان کی آنکھیں ہول اور وحشت کی وجہ سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ خضوع کے ساتھ دیکھ رہے ہوں گے" (خاشعۃ ابصارھم)۔

"اور ذلّت و خواری کے پردہ نے انھیں ڈھانپ رکھا ہوگا" (ترھقھم ذلّۃ)[1]

---

[1] "ترھقھم" "رھق" (بروزن شفق) کے مادہ سے، جبری طور پر ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "یہ وہی دن ہے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا تھا"۔ (ذالك اليوم الذى كانوا يوعدون)۔

ہاں! یہ وہی موعود دن ہے، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور بعض اوقات یہ کہا کرتے تھے: فرض کریں کوئی ایسا دن ہو بھی تو پھر بھی ہماری حالت مومنین سے بہتر ہوگی، لیکن اس دن ان میں شدت خوف، وحشت و شرمساری کی وجہ سے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی، ذلت کا گرد و غبار ان کے سر اور چہرہ پر پڑا ہوا ہوگا، اور وہ غم و اندوہ کے ہالے میں گھرے ہوئے ہوں گے، یقیناً اس دن وہ نادم و پشیماں ہوں گے' لیکن کیا فائدہ؟

خداوندا! اس ہولناک دن ہمیں اپنی رحمت کے پردے میں ڈھانپ لینا۔

پروردگارا! شیطان کے جال سخت، ہوائے نفس غالب اور لمبی چوڑی آرزوئیں فریب دینے والی ہیں، تو خود ہی بیداری و آگاہی اور راہِ ہدایت سے عدم انحراف کی ہمیں توفیق مرحمت فرما۔

بارِ الٰہا! ہمیں ان مومنین میں سے قرار دے، جنھوں نے اپنے عہد کو وفا کرنے، اور تیری اطاعت کے لیے کمر ہمت باندھی ہوئی ہے

آمین یا رب العالمین

اختتام سورۂ معارج ۔ ۲۱ ذی الحجۃ الحرام

۱۴۰۶ ھ

اختتام ترجمہ ۱۵ محرم ۱۴۰۸ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۸۷ء بروز بدھ

بوقت تقریباً ساڑھے سات بجے صبح ۔ ۱۸/ای ماڈل ٹاؤن

لاہور

صفدر حسین نجفی

سورۂ نوح

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۲۸ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ ، ذی الحجۃ الحرام ۱۴۰۶ھ

سورۂ نوح کے مطالب و مضامین

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، نوح پیغمبر کی سرگزشت بیان کرتی ہے، قرآن مجید کی کئی سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہوا ہے، ان میں سے سورۂ شعراء، مومنون، اعراف اور انبیاء ہیں، اور سب سے زیادہ تفصیل سورۂ ہود میں آئی ہے، جس میں تقریباً ۲۵ آیات اس "اولوالعزم" پیغمبر کے بارے میں ہیں (آیہ ۲۵ تا ۴۹)۔

لیکن سورۂ نوح میں جو کچھ آیا ہے، وہ ان کی زندگی کا ایک خاص حصّہ ہے، جو دوسری جگہ پر اس طرح سے نہیں آیا، اور یہ حصّہ ان کی توحید کی طرف دعوت دینے، اس کی کیفیت، اس دعوت کے عناصر، اور ان جزئیات کے بارے میں ہیں جو اس اہم مسئلہ میں بروئے کار آئے ہیں ——— اور وہ بھی اس ہٹ دھرم، خود غرض اور متکبر قوم کے مقابلہ میں جو حق کے سامنے سر جھکانے کے لیے بالکل تیار نہ تھی ——— پے در پے اور مسلسل دعوتِ حق دینے کے ساتھ مربوط ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ اور اس زمانہ کے تھوڑے سے مسلمان، نوح اور ان کے اصحاب کے زمانہ کے حالات سے مشابہ حالات رکھتے تھے، انھیں بہت سے مسائل کی تعلیم دیتا ہے اور اس واقعہ کے بیان کرنے کے اہداف و مقاصد میں سے ایک یہی ہے، منجملہ ان کے:

۱۔ انھیں یہ بتانا ہے کہ منطقی استدلال کے طریق سے، جو دشمنوں کے ساتھ محبت اور مکمل دلسوزی سے توأم ہو، کس طرح تبلیغ کریں اور اس راہ میں ہر مفید اور موثر ذریعہ سے کیسے فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ انھیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا کی طرف دعوت دینے کی راہ میں ہرگز نہ تھکیں، چاہے سالہا سال گزر جائیں اور دشمن کتنا بھی مزاحم کیوں نہ ہو۔

۳۔ انھیں یہ سبق دیتا ہے کہ ایک طرف تو شوق دلانے کے وسائل ہوں اور دوسری طرف ڈرانے کے عوامل، اور دعوت کرنے کے لیے دونوں طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۴۔ اس سورہ کی آخری آیات، ہٹ دھرم مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ اگر وہ حق کے سامنے نہ جھکے اور خدا کے حکم کے سامنے انھوں نے گردن خم نہ کی، تو ان کا انجام بہت دردناک ہوگا۔

۵۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ سورۂ پیغمبر اور پہلے مومنین اور ان سے مشابہ افراد کے لیے دل کی تسلّی کا سبب ہے کہ وہ خدا کے لطف و کرم سے اپنے پروگراموں میں سرگرم اور مشکلات اور سختیوں میں صابر و شکیبار ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ سورہ، حق و باطل کے طرف داروں میں دائمی مبارزہ کے بیان اور ان پروگراموں کی، جن پر حق کے طرف داروں کو اپنی راہ میں کاربند ہونا چاہیے، تصویر کشی کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے آیا ہے:

"من قرأسورة نوح كان من المؤمنين الذين تدركهم دعوة نوح"

"جو شخص سورۂ نوح کو پڑھے گا، وہ ان مومنین میں سے ہو جائے گا جنھیں نوح کی دعوت کی شعاع ڈھانپ لیتی ہے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من كان يؤمن بالله واليوم الأخر ويقرأ كتابه فلا يدع ان يقرأ سورة "انا ارسلنا نوحًا" فاى عبد قرأها محتسبا صابرًا فى فريضة او نافلة اسكنه الله مساكن الابرار واعطاه ثلاث جنان مع جنته كرامة من الله"

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی کتاب کو پڑھتا ہے، وہ سورۂ نوح کی تلاوت کو ترک نہ کرے، جو شخص اس سورہ کو، صبر و استقامت کے ساتھ، خدا کے لیے، واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا تو خدا اسے نیک افراد کی منازل میں جگہ دے گا اور جنت کے باغوں میں سے تین باغ، اس کے اپنے باغ کے علاوہ، اس کے احترام میں اسے مرحمت فرمائے گا۔[2]

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اس کی تلاوت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کے طور طریقوں، اور حق کی طرف دعوت کی راہ میں، ان کے یار و انصار کے صبر و استقامت سے ہدایت حاصل کرے اور اس کی دعوت کی شعاع سے روشنی حاصل کرے، نہ کہ ایسا پڑھنا کہ جس میں غور و فکر نہ ہو، اور نہ ہی ایسا غور و فکر کہ جس میں عمل نہ ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۳۵۹

[2] ایضاً

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
۱۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ
یَّاۡتِیَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ
۲۔ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَكُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ
۳۔ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ وَاَطِیۡعُوۡنِ
۴۔ یَغۡفِرۡ لَكُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ وَیُؤَخِّرۡكُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ
اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ

ترجمہ

رحمان و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے ان سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے، اپنی قوم کو ڈراؤ۔

۲۔ انھوں نے کہا: اے قوم! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۳۔ کہ تم خدا کی عبادت کرو اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور میری اطاعت کرو۔

۴۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور ایک معین وقت تک کیلیے تمھیں زندہ رکھے گا، لیکن جب خدائی اجل آگئی تو پھر تاخیر نہیں ہوگی، اگر تم سمجھو!

تفسیر

نوح کا پہلا پیغام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۂ نوح کے حالات کے اس حصّہ کو بیان کرتا ہے، جو ان کی دعوت سے مربوط ہے، اور وہ راہِ حق کے تمام راہ رووں کو، خصوصاً ہٹ دھرم قوموں کے مقابلہ میں، حق کی طرف دعوت کے سلسلہ میں، بہت سے عمدہ نکات سکھاتی ہے۔

سب سے پہلے ان کی بعثت کے مسئلہ کو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے اس سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے تم اپنی قوم کو ڈراؤ"۔ (انّا ارسلنا نوحًا الٰی قومہ ان انذر قومك من قبل ان یأتیھم عذاب الیم)۔

یہ دردناک عذاب، ممکن ہے دنیا کا عذاب ہو، یا آخرت کا عذاب ہو، اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں مراد ہوں، اگرچہ اس سورہ کی آخری آیات کے قرینہ سے زیادہ تر مراد دنیا کا عذاب ہے۔

"انذار" (اور ڈرانے) پر تکیہ، باوجودیکہ انبیاء ڈرانے والے بھی تھے، اور بشارت دینے والے بھی، اس بناء پر ہے کہ انذار اور ڈرانا، غالباً زیادہ قوی تاثیر رکھتا ہے، جیسا کہ تمام دنیا میں قوانین کے اجراء کی ضمانت کے لیے انذار اور سزا پر تکیہ ہوتا ہے۔

نوح ایک "اولوالعزم" پیغمبر، جو پہلی شریعت اور دینِ الٰہی کے حامل تھے، عالمی دعوت رکھتے تھے، یہ فرمان حاصل کرنے کے بعد اپنی قوم کی طرف آئے اور ان سے کہا: "اے میری قوم! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں"۔ (قال یا قوم انی لکم نذیر مبین)۔

ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم خدائے یکتا و یگانہ کی پرستش کرو، اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اسے دور پھینک دو، تقوٰی اختیار کرو اور میرے احکام کی جو خدا کے احکام ہیں اطاعت کرو (ان اعبدوا اللّٰہ واتقوہ واطیعون)۔

حقیقت میں نوح نے اپنی دعوت کے مضمون کا تین جملوں میں خلاصہ بیان کیا: خدائے یکتا کی پرستش، تقوٰی کی رعایت اور ان قوانینِ احکام کی، جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے اور جو عقائد و اخلاق و احکام کا مجموعہ تھے، اطاعت۔

اس کے بعد انھیں شوق دلاتے ہوئے، اور اس دعوت کو قبول کرنے کے اہم نتائج کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم میری دعوت کو قبول کر لو تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا (یغفرلکم من ذنوبکم)[1]

---

[1] "من" اس جملہ میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہے، کیونکہ خدا پر ایمان تمام گزشتہ گناہوں کے بخشے جانے کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حقیقت میں مشہور قاعدہ کلیہ" الاسلام یجب ما قبلہ" (اسلام اپنے سے پہلے کی چیزوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انھیں ختم کر دیتا ہے) ایک ایسا قانون ہے جو تمام توحیدی اور الٰہی دینوں میں ہے اور اسلام پر ہی منحصر نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اور تمھیں ایک معین زمانہ تک تاخیر میں ڈالتا ہے اور تمھاری عمر کو طولانی کر کے تم سے عذاب کو دور رکھتا ہے (و یؤخرکم الی اجل مسمّٰی)۔

- "کیونکہ جب خدا کی طرف سے اصلی اور آخری اجل آجاتی ہے، تو اس میں تاخیر نہیں ہوتی، اگر تم جانتے ہو" (انّ اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر لو کنتم تعلمون)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ" اجل " اور انسانی عمر کی مدت دو قسم کی ہے،" اجل مسمّٰی " اور" اجل نہائی یا اخری" یا دوسرے لفظوں میں" اجل ادنٰی " (نزدیک کی مدت والی) اور" اجل اقصٰی " (دور کی مدت والی) یا" اجل معلق " (مشروط) اور" اجل حتمی" (مطلق)

پہلی قسم کی عمر کی مدت تو وہ ہے جو قابلِ تغیر ہے اور وہ انسان کے غلط اعمال کے نتیجے میں ممکن ہے کہ بہت جلدی آجائے جن میں سے ایک خدائی عذاب بھی ہے اور اس کے برعکس تقویٰ نیکوکاری اور تدبیر کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ بہت پیچھے اور تاخیر میں پڑ جائے۔

لیکن عمر کی اصلی اور آخری مدت کسی طرح بھی قابلِ تغیر نہیں ہے، اس موضوع کو ایک مثال کے ذریعے مشخص کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان عمر جاودانی اور ہمیشہ کی زندگی کی استعداد نہیں رکھتا، اگر انسانی بدن کے تمام کل پرزے اور مشینری اچھی طرح سے کام کرتے رہیں تو آخر کار ایک ایسا وقت آجائے گا، جب کہ فرسودہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے اس کا دل خود بخود کام کرنے سے رُک جائے گا، لیکن حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت، اور بیماریوں کو وقت پر روکنے سے، انسان کی عمر کو طولانی کر سکتے ہیں، جبکہ ان امور کی رعایت نہ کرنے سے ممکن ہے کہ اس کی عمر بہت کم ہوجائے اور بہت جلدی اس کو ختم کر دے[1]

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا:

باعث ہے، مگر وہ کہ جو حق الناس سے مربوط ہے، لیکن گناہ کے لحاظ سے اور حرمت کے حکم کی وجہ سے بخشا جانا اس کو بھی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے (مثلاً فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں) احتمال دیا ہے کہ من تبعیضیہ ہے۔ یہ گزشتہ گناہوں کے بارے میں ہے، نہ کہ آئندہ والے گناہوں کے بارے میں، یہ بعید نظر آتا ہے، کیونکہ آیت میں آیندہ کے گناہوں کے بارے میں تو بات ہی نہیں ہو رہی۔

[1] حاشیہ صفحہ ھٰذا:۔" اجل نہائی" اور" اجل معلق" کے بارے میں ہم نے سورۂ انعام کی آیہ ۲ (جلد ۵ ص ۱۴۸) کے ذیل میں ایک اور بحث کی ہے۔

ایک نکتہ

عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب

ایک دوسرا نکتہ جو اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، وہ عمر کے کم ہونے میں گناہوں کی تاثیر ہے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو، تو خدا تمھاری عمر کو طولانی کر دے گا اور تمھاری موت کو تاخیر میں ڈال دے گا۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گناہ ہمیشہ انسان کے جسم اور روح پر ہولناک ضربیں وارد کرتے ہیں، اس مطلب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

روایات اسلامی میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے، ان میں سے ایک پر معنی حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال، ومن یعیش بالاحسان اکثر ممن یعیش بالاعمار:

"وہ لوگ جو گناہ کے اثر سے مرتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں، جو خدائی موت سے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، اور وہ لوگ جو نیکو کاری کی بناء پر طولانی عمر پاتے ہیں، ان سے بہت زیادہ ہیں، جن کی عمر طبیعی عوامل کی بناء پر زیادہ ہوتی ہے۔"

۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَهَارًا ۙ
۶۔ فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ۝
۷۔ وَ اِنِّیۡ كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا ۚ
۸۔ ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارًا ۙ
۹۔ ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَهُمۡ وَ اَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا ۙ

ترجمہ

۵۔ "نوح" نے کہا، پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو رات دن (تیری طرف) دعوت دی۔
۶۔ لیکن میری دعوت نے حق سے فرار کے علاوہ ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔
۷۔ اور میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں تاکہ تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور اپنے لباس سے چہروں کو ڈھانپ لیا، اور مخالفت پر اصرار کیا، اور شدت کے ساتھ استکبار کیا۔
۸۔ اس کے بعد میں نے انھیں ظاہر بظاہر (توحید اور تیری بندگی کی طرف) دعوت دی۔
۹۔ پھر میں نے علی الاعلان بھی اور پوشیدہ طور پر بھی انھیں تیری طرف بلایا۔

تفسیر

ان کی ہدایت کیلئے ہر طرح سے کوشش کی، مگر......

ان آیات میں، اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے، نوح کی رسالت اور ماموریت کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے، خود انھیں کی زبان سے

کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں، جو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں شکایت کے طور پر کہی تھیں، جو بہت ہی سبق آموز ہیں۔

نوح ؑ کی باتیں ایسی باتوں کے سلسلہ میں ہیں، جو تمام دینی مبلغین کے لیے رہنما بن سکتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے: "نوح ؑ نے کہا: پرو... میں نے اپنی قوم کو رات دن تیری طرف دعوت دی ہے" (قال رب انی دعوت قومی لیلاً و نہارًا)۔

اور ان کی ہدایت و تبلیغ میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوتاہی نہیں کی۔

لیکن میری اس دعوت وارشاد نے، حق سے فرار کرنے کے سوا، ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا" (فلم یزدھم... الا فرارًا)۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ کسی چیز کی دعوت، اسی سے بھاگنے کا سبب بن جائے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرنے سے کہ د... کی تاثیر، ایک قسم کی آمادگی اور کشش متقابل کی محتاج ہے، تعجب کی کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ غیر آمادہ دلوں میں معکوس اور منفی اثر... دوسرے لفظوں میں ہٹ دھرم اور حق کے دشمن افراد، جب مردان حق کی دعوت کو سنتے ہیں تو وہ اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہو... ہیں، اور ان کا یہی مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جانا، انھیں راہِ حق سے زیادہ دور کر دیتا ہے، اور ان کے کفر و نفاق کو اور بھی زیادہ راسخ بنا دیتا ہے۔

یہ بات ٹھیک اسی چیز کے مانند ہے جو سورۂ اسراء کی آیہ ۸۲ میں آئی ہے: "و ننزل من القراٰن ماھو شفاء ورحمة للمؤمنین ولا یزید الظالمین الا خسارًا) ہم نے قرآن میں ایسی آیات نازل کی ہیں جو مومنین کیلیے شفاء اور رحمت کا سبب ہیں، لیکن ظالموں میں سوائے خسارے اور نقصان کے کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتیں"۔

اور قرآنی آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہ آسمانی کتاب پرہیزگاروں کے لیے باعث ہدایت ہے "ھدًی للمتقین" (البقرہ ــــ ۲) اسی وجہ سے ہے کہ انسان میں کچھ نہ کچھ تقویٰ کا وجود ہونا چاہیے تا کہ وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، یہ مرحلہ وہی "حقیقت جوئی کی روح" اور حق کی گفتگو کو قبول کرنے کی آمادگی ہے۔

اس کے بعد نوح ؑ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتے ہیں "خداوندا! میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں اور تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنے لباسوں کو اپنے اوپر لپیٹ لیا اور مخالفت کرنے اور ایمان نہ لانے پر اصرار کیا اور شدت کے ساتھ استکبار کیا" (و انی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا)۔

کانوں میں انگلیاں ڈالنا اس لیے تھا کہ حق کی آواز کو نہ سنیں، اور ان کا اپنے اوپر لباس لپیٹ لینا، یا تو اس معنی میں تھا کہ وہ لباس کو سر پر ڈال لیتے تھے تا کہ وہ کانوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ڈھانپ لیں اور آواز کی معمولی سے معمولی لہر بھی کانوں کے پردے سے نہ ٹکرائے، اور وہاں سے کوئی پیغام دماغ کی طرف منتقل نہ ہو، یا وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیں، تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نگاہیں اس بزرگ پیغمبر نوح ؑ کے ملکوتی چہرے پر جا پڑیں۔ حقیقت میں انھیں یہ اصرار تھا، کہ نہ تو وہ اپنے کانوں سے ان کی کوئی بات سنیں، اور نہ ہی اپنی آنکھوں سے

نہیں دیکھیں۔

واقعًا یہ ایک حیرت انگیز چیز ہے کہ انسان حق کی عداوت اور دشمنی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ خود کو دیکھنے، سننے اور سوچنے تک کی بھی اجازت نہ دے۔

بعض اسلامی تفاسیر میں آیا ہے کہ اس منحرف قوم میں سے بعض لوگ اپنے بیٹوں کے ہاتھ پکڑ کر نوحؑ کے پاس لے جایا کرتے تھے اور ان سے یہ کہتے تھے: اس شخص سے ڈرتے رہنا کہیں یہ تمہیں گمراہ نہ کردے، یہ وہ وصیت ہے جو میرے باپ نے مجھے کی تھی اور میں اب وہی وصیت تمہیں کر رہا ہوں (تاکہ میں وصیت اور خیر خواہی کا حق ادا کردوں)[1]

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح اپنی طولانی عمر میں، کئی نسلوں کے درمیان اسی طرح دعوتِ الٰہی کی تبلیغ کرتے رہے تھے اور بالکل نہیں تھکے تھے۔

اور ضمنی طور پر اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ ان کی بدبختی کا ایک اہم عامل استکبار اور غرور تھا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ اپنے جیسے انسان کے سامنے سر تسلیم خم کریں، چاہے وہ خدا کا نمائندہ ہو اور اس کا دل علم و دانش اور تقویٰ و پرہیزگاری کا مرکز ہو۔ یہ کبر و غرور ہمیشہ ہی حق کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ رہا ہے اور ہم نے بشر کی تمام تاریخ میں اس کا شوم و منحوس نتیجہ، بے ایمان افراد کی زندگی میں مشاہدہ کیا ہے۔

نوحؑ اپنی باتوں کو پروردگار کی بارگاہ میں جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"خداوندا! میں نے انھیں آشکار اور ظاہر طور پر تیری توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی۔ (ثم انی دعوتھم جھارًا)۔

میں نے انھیں عمومی جلسوں میں اور بلند آواز کے ساتھ ایمان کی طرف بلایا۔

اس پر ہی قناعت نہیں کی۔ "آشکار و پنہاں، توحید و ایمان کی حقیقت ان سے بیان کی ہے" (ثم انی اعلنت لھم واسررت لھم اسرارًا)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق، نوحؑ نے اس ہٹ دھرم اور خود غرض جمعیت میں اپنی دعوت کے نفوذ کے لیے تین مختلف طریقے اختیار کیے۔ کبھی تو صرف مخفی طور پر دعوت کرتے تھے؛ تو چار قسم کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ (کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، اپنے اوپر کپڑے لپیٹ لیے، کفر پر اصرار کیا اور استکبار و غرور سے کام لیا) کبھی علی الاعلان اور آشکارا دعوت دیتے اور کبھی آشکارا اور پنہاں دونوں طریقوں کی دعوت سے فائدہ اٹھاتے، لیکن ان میں سے کوئی بھی مؤثر ثابت نہیں ہوئی[2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۱

[2] تفسیر "فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۱۳۶

اصولی طور پر انسان کی ساخت اور بناوٹ کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر وہ باطل کی راہ میں اس قدر آگے بڑھ جائے، کہ فساد کی جڑیں وجود میں مستحکم ہو جائیں، اور اس کے وجود کی گہرائیوں میں نفوذ کرتے ہوئے، طبیعت ثانوی کی شکل اختیار کر لیں، تو پھر نہ تو مردانِ حق کی دعوت اثر کرتی ہے اور نہ ہی خدا کے پیغامہائے رسا ان کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ تبلیغ کے طریقے:

اوپر والی آیات میں، نوح کی دعوت کے سلسلہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ پیغمبر اور مکہ میں رہنے والے ان تھوڑے سے مو... کے لیے، جو آپ کے ساتھ مل گئے تھے، دلی تسلی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ راہِ خدا کے تمام مبلغین کے لیے ایک عمومی پروگرام پیش کیا گیا ہے۔

نوحؑ کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے شہر کے ایک عمومی مرکز میں جمع ہو جائیں گے، اور اطمینانِ قلب کے ساتھ، اس حالت میں کہ وہ سب کے سب آپ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اور کان آپ کی باتوں پر لگائے ہوں گے اور پھر وہ خدا کا پیغام انھیں پہنچائیں گے، بلکہ آیات کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے (اور بعض روایات میں آیا بھی ہے) کہ آپ اوقات لوگوں کے گھروں میں ان کے پاس جاتے، یا کوچہ و بازار میں خصوصی طور پر انھیں آواز دیتے اور حوصلہ کے ساتھ اور محبت آمیز لب و لہجہ انھیں تبلیغ کرتے اور کبھی آپ ان عمومی مجالس میں، جو دوسرے مقاصد مثلاً جشن یا تعزیت کے لیے قائم ہوئی تھیں چلے جاتے اور بلند آواز آشکارا خدا کا فرمان ان کے سامنے پڑھتے، لیکن ہمیشہ نامطلوب ردعمل، توہین و استہزاء اور بعض اوقات مارنے اور زخمی کرنے کا سامنا ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ ہرگز اپنے کام سے دستبردار نہیں ہوئے۔

یہ عجیب و غریب حوصلہ اور اتنی عجیب دلسوزی اور بے نظیر استقامت اور کام کی لگن، دینِ حق کی راہ میں دعوت کے لیے ان کا سرمایہ تھی۔

اور سب سے بڑھ کر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ سے نوسو سال کی طویل مدت میں، تقریباً (۸۰) اسی افراد آپ پر ایمان لائے، اگر ہم ان دونوں اعداد کو ایک دوسرے پر تقسیم کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کی ہدایت کے لیے اوسطاً تقریباً ۱۲ سال تبلیغ کی۔

اگر مبلغین اسلام اس قسم کی استقامت اور کام کی لگن رکھتے ہوں، تو کیا اسلام ایسے مالا مال اور عمدہ مطالب و مضامین کے ہوتے ہوئے، عالمگیر نہیں ہو جائے گا؟!

۲۔ حقیقت سے فرار کیوں؟

بعض اوقات انسان اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس آسمان کے نیچے ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں، جو حق کی بات

سننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور اس سے دور بھاگیں ؟ بات قبول کرنے کی نہیں ہے، بات صرف سننے کی ہے۔

لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ اس قسم کے افراد بہت زیادہ تھے۔

صرف قوم نوح ہی ایسی نہیں تھی کہ جب آپ انھیں توحید کی دعوت دیتے تھے، تو وہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے، اور سر اور چہرے کپڑے سے ڈھانپ لیتے تھے، تاکہ نہ توحق کی بات کو سنیں اور نہ ہی آپ کو دیکھیں، بلکہ قرآن کی صراحت کے مطابق، پیغمبر اسلام کے زمانہ میں بھی ایسا گروہ موجود تھا، جب پیغمبرؐ دل انگیز بلند آواز کے ساتھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے، تو وہ شور و غوغا کرکے اور سیٹیاں بجا کر اس قدر ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی آواز کو نہ سُن پائے، وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھٰذا القراٰن و الغوا فیہ لعلکم تغلبون "کافروں نے کہا: اس قرآن پر کان نہ دھرو اور اس کی تلاوت کے وقت شور و غوغا بلند کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (حٰم السجدۃ ـــــ ۲۶)

کربلا کی خونی تاریخ میں بھی یہ آیا ہے کہ جب امام حسینؑ سالار شہیدان نے منحرف اور کج فہم دشمنوں کو، ہدایت وارشاد، اور بیدار کرنا چاہا، تو باطلوں نے اس طرح شور و غوغا کیا، کہ امام کی آواز ان میں گم ہو کر رہ گئی [۱]

آج بھی یہ پروگرام اسی طرح جاری و ساری ہے، البتہ دوسری شکلوں اور صورتوں میں، باطل کے طرفداروں نے، قسم قسم کی غلط سرگرمیوں، فاسد اور خراب کرنے والی موسیقیوں، خراب مواد اور منشیات کے ذریعہ، اس قسم کی فضا فراہم کر رکھی ہے، کہ لوگ خصوصاً نوجوان، مردانِ حق کی دلنواز آواز سُن ہی نہ سکیں۔

---

[۱] "بحار الانوار" جلد ۴۵ ص ۸۔

۱۰۔ فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝

۱۱۔ يُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا ۝

۱۲۔ وَّيُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ وَّيَجۡـ
لَّكُمۡ اَنۡهٰرًا ۝

۱۳۔ مَا لَكُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝

۱۴۔ وَقَدۡ خَلَقَكُمۡ اَطۡوَارًا ۝

ترجمہ

۱۰۔ میں نے ان سے کہا: اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔

۱۱۔ تاکہ وہ آسمان کی پُربرکت بارشیں پے در پے تم پر بھیجے۔

۱۲۔ اور تمھاری فراواں مال و دولت سے مدد کرے، اور تمھارے لیے سرسبز باغات اور نہریں جاری کر

۱۳۔ تم خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے؟

۱۴۔ حالانکہ اس نے تمھیں مختلف مرحلوں میں پیدا کیا ہے۔

تفسیر

ایمان کی دنیاوی جزا

نوحؑ اس ہٹ دھرم اور سرکش قوم کی ہدایت کے لیے، اپنے مؤثر بیانات کو جاری رکھتے ہوئے، اس مرتبہ بشارت و تشویق پر تکیہ کرتے ہیں اور انھیں تاکید کے ساتھ یہ وعید دیتے ہیں کہ اگر وہ شرک و گناہ سے توبہ کرلیں، تو خدا ان پر اپنی رحمت کے دروازے ہر طرف سے کھول دے گا ارشاد ہوتا ہے: "خداوندا! میں نے ان سے کہا ہے کہ تم اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو وہ بہت ہی بخشنے والا ہے (فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارًا)۔

نہ صرف یہ کہ وہ تمھیں گناہوں سے پاک کردے گا، بلکہ "اگر تم ایسا کرو تو وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں پے در پے نازل

ـے گا" (یرسل السمآء علیکم مدرارًا)۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اس کی معنوی رحمت کی بارش بھی ، اور مادی برکت پر برکت بارش بھی تم پر نازل ہوگی ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کہتا ہے : "آسمان کو تم پر بھیجے گا" یعنی اس قدر بارش ہوگی کہ گویا آسمان برس رہا ہے ! لیکن چونکہ وہ رحمت کی بارش ہوگی ، لہٰذا نہ تو اس سے کوئی ویرانی اور تباہی ہوگی ، اور نہ ہی کوئی تکلیف پہنچے گی ، بلکہ وہ ہر جگہ خوشی و خرمی اور سرسبزی و شادابی کا باعث ہوگی ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "اور تمھارے مال و اولاد میں زیادتی کرے گا" (ویمددکم باموال و بنین)۔

" اور تمھارے لیے سرسبز و شاداب باغ ، اور رواں پانی کی نہریں قرار دے گا " (و یجعل لکم جنات و یجعل لکم انہارًا)۔

اس طرح سے انھیں ایک عظیم معنوی نعمت ، اور پانچ عظیم مادی نعمتوں کی وعید دی ہے ۔ معنوی عظیم نعمت تو گناہوں کی بخشش اور کفر و عصیان کی آلودگی سے پاک ہونا ہے ۔ باقی رہی مادی نعمتیں تو وہ مفید ، برموقع اور پُر برکت بارشوں کا نازل ہونا ، مال کی زیادتی ، اولاد کی فراوانی ، (انسانی سرمایہ) پربرکت باغات اور جاری پانی کی نہریں ۔

ہاں قرآن مجید کی گواہی کے مطابق ، ایمان و تقویٰ ، دنیا کی آبادی کا سبب بھی ہے اور آخرت کی آبادی کا موجب بھی ۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب اس ہٹ دھرم قوم نے نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا ، تو خشک سالی اور قحط نے انھیں گھیر لیا ، اور ان کے بہت سے اموال و اولاد تباہ و ہلاک ہو گئے ، عورتیں بانجھ ہو گئیں اور ان کے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو نوح نے ان سے کہا : اگر تم ایمان لے آؤ تو یہ تمام مصیبتیں اور بلائیں تم سے دور ہو جائیں گی ، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اسی طرح سے سختی پر قائم رہے ، یہاں تک کہ آخری عذاب آپہنچا جس نے سب کا خاتمہ کر دیا ۔

اس کے بعد پھر دوبارہ ڈرانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں : " تم خدا سے ڈرتے کیوں نہیں اور خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے" ؟! (ما لکم لا ترجون للّٰہ وقارًا)۔[2]

" حالانکہ خدا نے تمھیں گوناگوں طریقے کی خلقتیں دی ہیں" (وقد خلقکم اطوارًا)۔

---

[1] " مدرار" " در" (بروزن حر) کے مادہ سے اصل میں پستان مادر سے " دودھ " کے گرنے کے معنی میں ہے اور پھر بارش برسنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ۔ " مدرار" مبالغہ کا صیغہ ہے ۔

[2] " وقار" وزن اور عظمت کے معنی میں ہے اور " ترجون" " رجاء" کے مادہ سے ، امید کے معنی میں ہے جو بعض اوقات خوف سے توأم ہوتا ہے ۔ اور سارے جملہ کا معنی یہ ہے کہ تم عظمتِ خدا کے مقابلہ میں خضوع کیوں نہیں کرتے ۔

پہلے تم ایک بے قدر وقیمت "نطفہ" تھے، زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ تمھیں "علقہ" بنادیا اور اس کے بعد "مضغہ" کی شکل میں لے آیا، اس کے بعد اس نے تمھیں انسانی شکل وصورت اور جسم عطا کیا، پھر تمھارے جسم کو لباس حیات پہنایا اور تمھیں روح اور حس وحرکت دی، اسی طرح سے تم نے یکے بعد دیگرے مختلف جنینی مراحل طے کیے، یہاں تک کہ تم ایک مکمل انسان کی شکل وصورت میں، ماں سے پیدا ہوئے، اس کے بعد زندگی کے مختلف اطوار اور زندگی کی مختلف شکلیں شروع ہوگئیں ۔ تم ہمیشہ اس کی ربوبیّت کے ماتحت رہے ہو اور ہمیشہ نئی حالت اختیار کرتے ہو اور ایک جدید خلقت حاصل کرتے ہو، تو پھر تم اپنے خالق کے باعظمت آستانے پر سر تعظیم کیوں نہیں جھکاتے؟

نہ صرف جسمانی لحاظ سے تم مختلف شکلیں بدلتے ہو بلکہ تمھاری روح اور جان بھی ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، تم میں سے ہر ایک، ایک نئی ادراک رکھتا ہے، اور ہر سر میں ایک نیا ذوق اور ہر دل میں ایک نیا شوق ہے اور تم سب کے سب ہمیشہ بدلتے رہتے ہو۔ بچپنے کے احساسات اپنی جگہ جوانی کو دے دیتے ہیں اور جوانی اپنے احساسات ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کے احساسات کے حوالے کر دیتی ہے ۔

اس طرح وہ ہر جگہ تمھارے ساتھ ہے اور ہر قدم پر تمھاری رہبری اور ہدایت کرتا ہے اور اس کے اس سارے لطف وعنایت کے باوجود یہ کفران اور بے حرمتی کس بناء پر ہے ۔؟

ایک نکتہ

"تقویٰ" اور "عمران وآبادی" میں ربط :

قرآن کی مختلف آیات سے، منجملہ ان کے اوپر والی آیات سے یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے، کہ ایمان وعدالت، معاشروں کی آبادی کا باعث ہیں اور کفر، ظلم اور گناہ ویرانی وتباہی کا سبب ہیں ۔

سورۂ اعراف کی آیہ ۹۶ میں آیا ہے، ولوان اھل القرٰی اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض "اگر شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے ۔

اور سورۂ روم کی آیہ ۴۱ میں آیا ہے: ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس ۔ خشکی اور سمندر میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد برپا ہوگیا ہے ۔

اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ میں آیا ہے: وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ۔ "جو مصیبت بھی تمھیں پہنچتی ہے، وہ تمھارے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے"۔

اور سورۂ مائدہ کی آیہ ۶۶ میں آیا ہے ولوانھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم "اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اسے قائم رکھتے، تو وہ آسمان وزمین سے روزی کھاتے"۔ (اور آسمان اور زمین کی برکتیں انھیں گھیر لیتیں)، اور اسی قسم کی دوسری آیات مزید ہیں ۔

یہ "رابطہ" صرف ایک باطنی و معنوی رابطہ ہی نہیں ہے، بلکہ معنوی رابطہ کے علاوہ ـــــــ جس کے آثار ہمیں اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں ـــــــ ایک واضح مادی رابطہ بھی ہے۔

کفر و بے ایمانی، مسئولیت کے عدم احساس، قانون شکنی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کرنے کا سرچشمہ بھی ہے اور یہ امور معاشروں کی وحدت کے ختم ہونے، اعتماد و اطمینان کے پایوں کے متزلزل ہونے، اقتصاد و انسانی قوتوں کے ضائع ہونے، اور اجتماعی اعتدال کے درہم برہم ہونے کا سبب بھی ہیں۔

واضح رہے کہ وہ معاشرہ جس پر ان امور کی حکمرانی ہو وہ بہت جلد پیچھے چلا جاتا ہے، اور سقوط و نابودی کی راہ پر چل پڑتا ہے اور اگر ہم کچھ معاشروں کو دیکھتے ہیں، کہ وہ ایمان و تقویٰ کے نہ ہونے کے باوجود، مادی حالت کے سلسلہ میں، پیش رفت کر رہے ہیں تو اسے بھی بعض اخلاقی اصولوں کی رعایت کا مرہونِ منت سمجھنا چاہیے، جو گزشتہ انبیاء کی میراث اور خدائی رہبروں، علماء اور دانش مندوں کی صدیوں کی طویل زحمتوں کا نتیجہ ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ اسلامی روایات میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تکیہ ہوا ہے کہ استغفار اور ترکِ گناہ، روزی کی کثرت اور زندگی کی بہبود کا سبب ہیں، منجملہ ان کے:

ایک حدیث میں علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

اکثر الاستغفار تجلب الرزق

زیادہ استغفار کر، تاکہ تو روزی کو جلب کرے [1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

من انعم اللہ علیہ نعمۃ فلیحمد اللہ تعالیٰ، ومن استبطأ الرزق فلیستغفر اللہ، ومن حزنہ امر فلیقل، لاحول ولا قوۃ الا باللہ

"جسے خدا نے کوئی نعمت بخشی ہے، وہ خدا کا شکر بجا لائے، اور جس کی روزی میں کچھ تاخیر ہو تو وہ استغفار اور طلب بخشش کرے، اور جو کسی حادثہ کی وجہ سے غمگین ہو تو وہ "لاحول ولاقوۃ اِلا باللہ" کہے [2]

نہج البلاغہ میں بھی یہ آیا ہے کہ:

وقد جعل اللہ سبحانہ الاستغفار سبباً لدرور الرزق ورحمۃ الخلق، فقال سبحانہ استغفروا ربکم انہ کان غفاراً یرسل السماء علیکم مدراراً ......"

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۴

[2] ایضاً

”خداوند سجان نے استغفار کو روزی کی زیادتی، اور مخلوق کے لیے رحمت قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، کہ وہ بہت بخشنے والا ہے، اور وہ آسمانوں کی برکتوں والی بارش تم پر برساتا ہے“۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کی سزا، اسی جہان کی محرومیاں ہیں اور جب انسان اس سے توبہ کرکے پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرلیتا ہے تو خدا اس عذاب اور سزا کو اس سے برطرف کردیتا ہے۔[2]

---

[1] ”نہج البلاغہ“ خطبہ ۱۴۲

[2] ہم نے اس سلسلہ میں ”گناہ اور معاشروں کی تباہی“ کے عنوان کے تحت، سورۂ ہود کی آیہ ۲ ۵ کے ذیل میں، ایک دوسری تشریح بھی کی ہے
تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۱۲۱

۱۵۔ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝
۱۶۔ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝
۱۷۔ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝
۱۸۔ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝
۱۹۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝
۲۰۔ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝

ترجمہ

۱۵۔ کیا تم دیکھتے نہیں، کہ خدا نے سات آسمانوں کو، ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے خلق کیا ہے ؟

۱۶۔ اور چاند کو آسمانوں کے درمیان روشنی کا باعث اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا۔

۱۷۔ اور خدا نے تمھیں نباتات کی طرح سے زمین سے اگایا ہے۔

۱۸۔ پھر تمھیں اسی زمین کی طرف لوٹائے گا اور پھر تمھیں دوبارہ نکال کھڑا کرے گا۔

۱۹۔ اور خدا نے زمین کو تمھارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا ہے۔

۲۰۔ تاکہ تم اس کے وسیع راستوں اور دروں سے گزرو (اور جہاں جانا چاہو..... چلے جاؤ)۔

تفسیر

باغبانِ ہستی نے تمھیں ایک پھول کی طرح پالا ہے

حضرت "نوح" "ہٹ دھرم مشرکین کے مقابلہ میں، اپنے گہرے اور استدلالی بیانات کے ذریعہ، پہلے تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے وجود کی گہرائیوں میں لے گئے، تاکہ وہ آیات انفسی کا مشاہدہ کریں (جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد، جیسا کہ زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے، انھیں خلقت و آفرینش کے عالم بزرگ میں خدا کی نشانیوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اور انھیں آفاق کی سیر کی طرف لے جاتے ہیں۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

پہلے آسمان سے شروع کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے پیدا کیا ہے" (الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقاً)۔[1]

"طباق" "باب" "مفاعلہ" کا مصدر ہے جو "مطابقہ" کے معنی میں ہے جو بعض اوقات ایک چیز کے دوسری چیز پر قرار پانے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی دو چیزوں کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مطابقت کے معنی میں ہوتا ہے، اور یہاں دونوں معنی صادق آتے ہیں۔

پہلے معنی کے مطابق ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں، اور ساتوں آسمانوں کی تفسیر میں جس طرح پر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک قابلِ توجہ تفسیر یہ ہے کہ وہ تمام ثوابت و سیار ستارے، جنھیں ہم خوردبینوں کے ذریعے یا بغیر خوردبینوں کے آنکھ سے دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب پہلے آسمان کا حصہ ہیں اور دوسرے چھ عالم اس کے بعد ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں، جو موجودہ زمانہ کے انسان کی پہنچ سے باہر ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں انسان یہ لیاقت و استعداد پیدا کرے کہ وہ ان عجیب اور وسیع عوالم کو بھی ایک دوسرے کے بعد معلوم کرے۔[2]

اور دوسرے احتمال کی بناء پر، قرآن سات آسمانوں کی، نظم و ضبط اور عظمت و زیبائی میں، ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مطابقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: خدا نے چاند کو سات آسمانوں کے درمیان، تمھارے لیے نور اور روشنی کا سبب اور سورج کو چراغِ فروزاں قرار دیا ہے" (وجعل القمر فیھن نوراً وجعل الشمس سراجاً)۔

یہ ٹھیک ہے کہ سات آسمانوں میں لاکھوں اور اربوں چمکنے والے ستارے ہیں، جو ہمارے سورج اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہیں، لیکن جو ہمارے لیے اہم ہے اور ہماری زندگی میں اثرانداز ہے وہ نظامِ شمسی کا یہی سورج اور چاند ہے۔ جن میں سے ایک تو ہماری فضائے زندگی کو دنوں میں اور دوسرا راتوں میں روشن کرتا ہے۔[3]

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) [1] اس بارے میں کہ یہ باتیں نوح کے کلام کا تتمہ اور آخری حصہ ہے یا ایسے مستقل جملے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کے خطاب کے لیے بطور جملہ معترضہ کے صادر ہوتے ہیں۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن ان میں سے بعض نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ نوح کے کلام کا تتمہ ہے اور آیات کا ظاہر بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اگر ان آیات کے بعد "و قال نوح" کا جملہ آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوح لوگوں سے اپنی بات ختم کرنے کے بعد بارگاہِ خدا کی طرف رخ کرکے ان کی شکایت کرتے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ھٰذا: [1] "طباقاً"، ممکن ہے مفعول مطلق ہو، یا حال ہو۔

[2] سات آسمانوں کی گوناگوں تفاسیر کے بارے میں ہم سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۹ کے ذیل میں (جلد اول تفسیر نمونہ میں) تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

[3] یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ "فیھن" کی ضمیر جو ظاہراً "سبع سماوات" کی طرف لوٹتی ہے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی، کیونکہ گفتگو ہمارے لیے نور اور روشنی کی ہے۔ اس لیے ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم "فی" کو "مع" کے معنی میں یا "ھن" کی ضمیر کو "پہلے آسمان" کے معنی میں لیں۔

"سراج" (چراغ) کی سورج کے لیے تعبیر اور "نور" کی "چاند" کے لیے تعبیر اس بناء پر ہے کہ "سورج" کی روشنی تو خود چراغ کی طرح اسی کے اندر سے پھوٹتی ہے، لیکن چاند کا نور خود اسی میں سے نہیں ہے، بلکہ وہ اس عکس کے مشابہ ہے جو آئینہ سے منعکس ہوتا ہے اسی لیے لفظ "نور" جو ایک عام مفہوم رکھتا ہے اس کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔

تعبیر کا یہ فرق قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتا ہے۔

ہم اس سلسلے میں سُورۂ یونس کی آیہ ۵ کے ذیل میں (جلد ۸ ص ۲۰۶) بہت زیادہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ انسان کی خلقت کی طرف لوٹتا ہے اور مزید کہتا ہے: "خدا نے تمھیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے" (واللہ انبتکم من الارض نباتاً)۔[1]

انسان کے بارے میں "انبات" کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ اوّلاً انسان کی پہلی خلقت مٹی سے ہے اور ثانیاً وہ تمام غذائیں جو انسان کھاتا ہے اور جن کی وجہ سے نشو و نما پاتا ہے، وہ سب زمین سے ہیں۔ یا تو وہ براہ راست زمین سے ہوتی ہیں جیسے سبزیاں، غلے اور پھل یا غیر مستقیم طور پر مثلاً جانوروں کے گوشت اور ثالثاً انسان اور نباتات کے درمیان بہت زیادہ مشابہت ہے اور بہت سے ایسے قوانین جو نباتات کی غذا، تولید نسل اور نشو و نما میں کار فرما ہیں وہ انسان پر بھی لاگو ہیں۔

یہ تعبیر انسان کے بارے میں بہت پُر معنی ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مسئلہ ہدایت میں خدا کا کام صرف ایک معلّم و استاد کا کام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا کام ایک باغبان کی طرح ہے جو نباتات کے بیج کو ایک مساعد ماحول میں قرار دیتا ہے تاکہ ان میں چھپی ہوئی استعداد ظہور میں آئے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۳۷ میں حضرت مریم کے بارے میں بھی یہ آیا ہے: وانبتھا نباتاً حسناً: "خدا نے بہت ہی اچھے طریقے سے مریم کے وجود کو پیدا کیا اور اس کی پرورش کی"، یہ سب اسی لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد مسئلہ معاد کی طرف، جو مشرکین کے لیے پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے، متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے: "اس کے بعد وہ تمھیں اسی زمین کی طرف، جس سے اس نے تمھیں اگایا تھا، دوبارہ پلٹا دے گا اور پھر دوبارہ تمھیں اس سے نکال کھڑا کرے گا (ثم یعیدکم فیھا و یخرجکم اخراجاً)۔

ابتداء میں بھی تم مٹی ہی تھے، پھر دوبارہ مٹی کی طرف لوٹ جاؤ گے اور وہی ذات جس میں یہ قدرت تھی کہ تمھیں ابتداء میں مٹی سے پیدا کرے، یہ قدرت رکھتی ہے کہ دوبارہ مٹی ہو جانے کے بعد، تمھارے جسم پر دوبارہ لباسِ حیات پہنا دے۔

مسئلہ "توحید" سے "معاد" کی طرف یہ انتقال، جو اوپر والی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقہ پر منعکس ہوا ہے، ان دونوں مسئلوں کے نزدیکی ربط کو بیان کرتا ہے اور اس طرح نوحؑ، مخالفین کے مقابلہ میں، نظامِ آفرینش کے طریق سے، توحید پر بھی استدلال کرتے ہیں،

---

[1] اس آیت میں ایک قاعدے کے لحاظ سے تو "انباتاً" کہا جانا چاہیے تھا، لیکن آیت میں کچھ مقدر ہے اور وہ اس طرح ہے "انبتکم من الارض فنبتم نباتاً" (تفسیر فخر رازی و ابوالفتوح رازی)

اور اسی طریقہ سے معاد پر بھی استدلال کرتے ہیں ۔

اس کے بعد پھر نئے سرے سے آیاتِ آفاقی اور عالمِ کبیر میں توحید کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور زمین کے وجود کی نعمت کے متعلق گفتگو کرتا ہے، فرماتا ہے: "خدا نے زمین کو تمھارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا، (و الله جعل لکم الارض بساطًا)۔[1]

یہ نہ تو ایسی سخت ہے کہ اس پر آرام اور آمد و رفت ہی نہ کر سکو اور نہ ایسی نرم کہ تم اس میں دھنس جاؤ اور اس پر چل پھر ہی نہ سکو۔ اور نہ یہ ایسی گرم اور جلانے والی ہے کہ اس پر گرمی کی وجہ سے تکلیف اٹھاؤ اور نہ ایسی سرد اور بے حرارت ہے کہ اس پر زندگی بسر کرنا تمھارے لیے مشکل ہو جائے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسا وسیع آمادہ و تیار فرش ہے۔ جس میں تمھاری زندگی کی تمام ضروریات موجود ہیں ۔

نہ صرف ہموار زمینیں ہی فرش کی طرح بچھی ہوئی ہیں بلکہ پہاڑ بھی، ان درّوں اور شگافوں کی وجہ سے، جو ان کے درمیان موجود ہیں اور عبور کرنے کے قابل ہیں، بچھے ہوئے فرش ہی ہیں۔ "ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم ان وسیع راستوں اور درّوں سے، جو اس زمین میں موجود ہیں، گزر سکو اور جس علاقہ میں جانا چاہو جا سکو" (لتسلکوا منها سبلًا فجاجا)۔

"فجاج" (بروزن مزاج) جمع ہے "فج" (بروزن حج) کی، اس درّہ کے معنی میں ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان ہوتا ہے ۔ اور وسیع و کشادہ راستہ کو بھی کہا جاتا ہے۔[2]

اس طرح "نوح" اپنی گفتگو کے اس حصہ میں، کبھی تو آسمانوں اور آسمان کے ستاروں میں خدا کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کبھی کرۂ زمین میں اس کی گوناگوں نعمتوں کی طرف، اور کبھی انسان کی ساخت اور اس کی حیات کے مسئلہ کی طرف جو خدا کی شناخت کی بھی ایک دلیل ہے اور مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے بھی۔

لیکن نہ تو پہلے انذاروں، بشارتوں اور تشویقوں نے اس ہٹ دھرم قوم کے سیاہ دل میں کوئی اثر کیا اور نہ ہی کسی منطقی استدلال نے، وہ اسی طرح سے مخالفت اور کفر پر تلے رہے اور حق کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے رہے، جیسا کہ بعد والی آیات میں ان کی خیرہ سری کا انجام بیان ہوا ہے ۔

---

[1] "بساط"، "بسط" کے مادہ سے کسی چیز کو پھیلانے کے معنی میں ہے، اس لیے لفظ "بساط" ہر پھیلی ہوئی وسیع چیز کو کہا جاتا ہے جس کا ایک مصداق فرش ہے ۔

[2] مفردات "راغب" مادہ "فج"

۲۱- قَالَ نُوحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ
وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۚ
۲۲- وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ
۲۳- وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا
يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ
۲۴- وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا
۲۵- مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا

ترجمہ

۲۱۔ نوحؑ نے (ان کی ہدایت سے مایوس ہونے کے بعد) عرض کیا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اوران لوگوں کی پیروی کی، جن کے مال اور اولاد نے خسارے کے سوا ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۲۲۔ اور (ان گمراہ راہبروں نے) ایک عظیم مکر کیا۔

۲۳۔ اور انھوں نے یہ کہا کہ: اپنے خداؤں اور بتوں سے دستبردار نہ ہونا خصوصاً "ود" و "سواع" و "یغوث" و "یعوق" و "نسر" کو نہ چھوڑنا۔

۲۴۔ اور انھوں نے بہت سے گروہوں کو گمراہ کر دیا۔ خداوندا! ظالموں میں ضلالت اور گمراہی کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہ کرنا۔

۲۵۔ (ہاں! آخرکار) وہ سب کے سب اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہوگئے اور جہنم کی آگ میں داخل ہوئے اور انھیں اپنے لیے خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا۔

تفسیر

خدا کا لطف تجھ سے مدارات کرتا ہے

جب نوح نے سینکڑوں سال تک اپنی پوری پوری کوشش کر کے دیکھ لی اور وہ قوم ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا، اسی طرح بت پرستی، گمراہی اور فساد پر ڈٹی رہی، تو وہ ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے اور بارگاہ خدا کی طرف رخ کیا، اور ایک استدلالی مناجات ضمن میں خدا سے ان کے لیے عذاب کا تقاضا کیا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا۔

نوح نے کہا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال واولاد نے خسارے کے سوا اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا (قال نوح رب انهم عصوني واتبعوا من لم يزده ماله وولده الا خسارًا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قوم کے رہبر ایسے لوگ ہیں، جن کا امتیاز مال واولاد کی زیادتی ہے اور وہ مال واولاد بھی جو فساد و خرابی کے سوا کسی کام نہیں آتے، نہ تو وہ مخلوق ہی کی خدمت کرتے ہیں اور نہ ہی خالق کے سامنے خضوع وخشوع کرتے ہیں اور یہ وسائل وامکانات ان کے غرور وطغیان اور سرکشی کا سبب بن گئے ہیں۔

اگر ہم نوع بشر کی تاریخ کی طرف نگاہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف قوموں کے بہت سے رہبر اسی قماش کے تھے، وہ ایسے لوگ تھے جن کا تنہا امتیاز، مال حرام جمع کرنا اور غیر صالح اولاد کو وجود میں لانا اور اس کے بعد سرکشی اور طغیان اور آخر میں اپنے افکار ونظریات، مستضعف اور کمزور لوگوں پر لادنا اور انھیں زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ان گمراہ راہبروں نے مکرِ عظیم کیا" (ومكروا مكرًا كبارًا)۔

"کبار" "کبیر" سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہاں نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے اور نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے روکنے کے لیے بہت عظیم اور وسیع شیطانی منصوبے بنا رکھے تھے۔ لیکن وہ منصوبے کیا تھے، ٹھیک طور پر مشخص نہیں ہیں۔

احتمال یہ ہے کہ وہی بت پرستی کا مسئلہ ہو گا، کیونکہ بعض روایات کے مطابق، بت پرستی نوح سے پہلے موجود نہیں تھی۔ بلکہ نوح کی قوم نے ہی اسے ایجاد کیا تھا۔ اس مسئلہ کا سرچشمہ یہ تھا کہ آدم اور نوح کے درمیانی زمانہ میں کچھ ایسے نیک اور صالح افراد ہو گزرے تھے۔ جن سے لوگ اظہار محبت کیا کرتے تھے۔ شیطان (اور شیطان صفت انسانوں) نے لوگوں کے اس لگاؤ اور محبت سے سوء استفادہ کیا اور انھیں ان بزرگوں کے مجسمے بنانے، اور ان مجسموں کی عزت واحترام کرنے کا شوق دلایا۔

لیکن کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ بعد میں آنے والی نسلیں اس موضوع کے رابطہ تاریخی کو بھول گئیں اور انھوں نے خیال کیا کہ یہ مجسمے ایسے محترم موجودات ہیں، جن کی پرستش اور عبادت کرنا چاہیے اور اس طرح سے وہ بتوں کی پرستش میں سرگرم ہو گئے اور ظالم مستکبرین نے انھیں غفلت میں رکھ کر اس طریقے سے انھیں اپنی قید وبند میں لے لیا اور ایک عظیم مکر وفریب واقع ہوا۔

ہو سکتا ہے کہ بعد والی آیت اس مطلب کی گواہ ہو، کیونکہ اس عظیم مکر کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مزید کہتا ہے، "ان کے رہنما نے کہا، اپنے خداؤں اور بتوں سے دستبردار نہ ہو" (و قالوا لا تذرن الھتکم)۔

اور خدائے یگانہ کے بارے میں نوح کی دعوت ہرگز قبول نہ کرنا، وہ خدا جو نہ تو دکھائی ہی دیتا ہے اور نہ ہی ہاتھ کے ساتھ چھونے کے قابل ہے۔

انھوں نے خصوصیت کے ساتھ انھیں پانچ بتوں کے بارے میں تاکید کی اور کہا: "ود"، "سواع"، "یغوث"، "یعوق" اور "نسر" کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ان کے دامن کو چھوڑنا" (ولا تذرن ودًا ولا سواعًا ولا یغوث ویعوق ونسرًا)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچوں بت کچھ خاص امتیازات رکھتے تھے اور وہ گمراہ قوم ان کی طرف خاص طور پر متوجہ تھی اور اسی بناء پر ان کے فرصت طلب رہبر بھی ان کی عبادت پر تکیہ کرتے تھے۔

یہ بات کہ یہ پانچ بت کہاں سے آئے؟ اس سلسلہ میں گوناگوں روایات ہیں۔

۱۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ پانچ نیک اور صالح افراد کے نام ہیں، جو نوح سے پہلے دنیا میں ہو گزرے ہیں۔ جب وہ دنیا سے چل بسے تو ابلیس کی تحریک پر لوگوں نے یادگار کے طور پر ان کے مجسّمے بنا لیے اور ان کا احترام و عزت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ بت پرستی کی صورت اختیار کر لی۔

۲۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آدم کے پانچ بیٹوں کے نام ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی دنیا سے جاتا تو اس کا مجسمہ یادگار کے طور پر بنا لیتے، لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یہ تعلقات فراموش ہو گئے اور نوح کے زمانہ میں ان کی پرستش کی لہر دوڑ گئی۔

۳۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ یہ ان بتوں ہی کے نام ہیں جو خود نوح کے ہی زمانہ میں بنائے گئے تھے، اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ نوح لوگوں کو آدم کی قبر کے گرد طواف کرنے سے روکتے تھے تو ایک گروہ نے ابلیس کی تحریک پر اس کے کچھ مجسّمے بنا لیے اور ان کی پرستش میں مشغول ہو گئے [۱]۔

اتفاقاً یہ پانچوں بت زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرف منتقل ہو گئے، پھر ہر قبیلہ نے ان بتوں میں سے ایک کو اپنے لیے انتخاب کر لیا، البتہ یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ خود وہ بت منتقل ہوئے ہوں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے نام منتقل ہوئے، اور انھوں نے ان ناموں کے بُت بنا لیے، لیکن بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں بُت طوفانِ نوح میں دفن ہو گئے تھے اور عربوں کے زمانہ جاہلیت میں شیطان نے انھیں باہر نکالا اور لوگوں کو ان کی پرستش کی دعوت دی [۲]۔

پھر اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے عرب قبائل میں یہ بت کس طرح تقسیم ہوئے، اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "ود" "بت تو" "بنی کلب" کے قبیلہ سے متعلق تھا جو سرزمین "دومۃ الجندل" میں رہتا تھا (وہ شہر جو تبوک کے نزدیک ہے اور جسے موجودہ زمانہ میں "جوف" کہتے ہیں) اور "سواع" "قبیلہ "ہذیل" سے جو سرزمین "رہاط" میں تھا، متعلق تھا، اور

---

[۱] مجمع البیان، تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر ابوالفتوح رازی اور دوسری تفاسیر (زیر بحث آیات کے ذیل میں)

[۲] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۸۷

" یغوث " بت " بنی قطیف " کے قبیلے سے یا " بنی مذحج " کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور " یعوق " قبیلہ ہمدان سے، اور " نسر " ذی الکلاع
قبیلے سے جو حمیر کے قبائل میں سے تھا۔[1]
مجموعی طور پر ان پانچ بتوں میں سے تین بت (یغوث، یعوق اور نسر) سرزمین یمن میں تھے، جو " ذونواس " کے یمن پر تسلط
ختم ہوگئے اور اس علاقہ کے لوگ دینِ یہود سے وابستہ ہوگئے۔[2]
" واقدی "، مشہور مؤرخ کہتا ہے کہ " ود " بت مرد کی شکل میں تھا اور " سواع " عورت کی شکل میں " یغوث " شیر کی صورت میں
اور " یعوق " گھوڑے کی شکل اور " نسر " " باز " کی صورت میں (جو ایک معروف پرندہ ہے)۔[3]
البتہ زمانہ جاہلیت کے عربوں ——— خصوصاً اہل مکہ ——— کے پاس اور بت بھی تھے۔ جن میں سے ایک بت " ہبل " تھا، جو
ان کے بتوں میں سے سب سے بڑا تھا اور وہ خانہ کعبہ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس کا طول ۱۸ ہاتھ تھا۔ بت " اساف " حجراسود کے مقابل تھا
اور بُت " نائلہ " (خانہ کعبہ کے جنوبی کونہ میں) رکن یمانی کے سامنے تھا اور اسی طرح " لات " و " عزیٰ " بُت تھے۔

اس کے بعد نوح مزید کہتے ہیں: " خداوندا! ان گمراہ اور خود غرض رہبروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا "۔ (وقد اضلّوا کثیرًا)۔[4]
" خداوندا! ظالموں میں ضلالت وگمراہی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر " (و لا تزد الظالمین الّا ضلالًا)۔
ظالموں اور ستم گروں میں ضلالت وگمراہی کو زیادہ کرنے سے مراد وہی ان سے توفیقِ الٰہی کا سلب ہونا ہے جو ان کی بدبختی کا سبب بن جاتا ہے
جسے وہ اپنے ظلم کی وجہ سے پاتے ہیں، کیونکہ خدا نورِ ایمان کو ان سے چھین لیتا ہے اور کفر کی تاریکی کو اس کا جانشین بنا دیتا ہے۔
یہ ان کے اعمال کی خاصیت ہے، جس کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے، کیونکہ ہر موجود جو تاثیر بھی رکھتا ہے، وہ اسی کے حکم سے ہے
(غور کیجیے)۔
جو کچھ بھی ہو، کفر و ایمان اور ہدایت وضلالت کے سلسلہ میں وہ خداوند تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ کسی قسم کی منافات نہیں رکھتا اور اختیار
کے سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا۔

آخر کار آخری زیرِ بحث آیت میں، اس سلسلہ میں آخری بات خدا یہ فرماتا ہے: " وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہوگئے اور انھیں آگ میں

[2،1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۴ و اعلام القرآن ص ۶۲۱
[3] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۴
[4] " اضلوا " کی ضمیر اس گروہ کے دولت مند رؤسا اور رہبروں کی طرف لوٹتی ہے اور قرینہ اس کا گزشتہ آیت ہے جو یہ کہتی ہے: و قالوا لا
تذرنّ آلهتکم " انھوں نے کہا کہ اپنے بتوں کو نہ چھوڑو " لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ ضمیر بتوں کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ وہی گمراہی کا
سبب تھے (اور اسی کے مشابہ سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۶ میں بھی آیا ہے، لیکن جمع مذکر کی صورت میں نہیں بلکہ جمع مونث کی ضمیر کی صورت میں) لیکن یہ احتمال زیرِ بحث
آیت میں بہت بعید نظر آتا ہے۔

...ن کردیا گیا اور انھیں خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا جو اس کے خشم و غضب سے ان کا دفاع کرے"۔ (مما خطیئاتھم ...رقوا فادخلوا نارًا فلم یجدوا لھم من دون اللہ انصارًا)[1]

آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ غرق ہونے کے بعد بلا فاصلہ آگ میں داخل کردیئے گئے اور یہ عجیب بات ہے کہ ...انی میں سے فوراً آگ میں داخل ہوں، اور یہ آگ وہی برزخ والی آگ ہے، چونکہ قرآن مجید کی آیات کی گواہی کے مطابق ایک گروہ کو موت کے بعد عالم برزخ میں سزا ملے گی اور بعض روایات کے مطابق "قبر" یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کی آگ ہے لیکن چونکہ قیامت کا وقوع قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے، لہٰذا فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوا ہے[2]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی آگ ہے، کہتے ہیں کہ خدا کے حکم سے، طوفان کی انھیں موجوں کے درمیان ایک آگ ظاہر ہوئی اور انھیں نگل گئی[3]

---

[1] "مما خطیئاتھم" میں "من" باء سببیت یا لام تعلیل کے معنی میں ہے اور "ما" یہاں زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

[2] "فخر رازی" نے اپنی تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے نقل کیا ہے جلد ۳۰ ص ۱۴۵

[3] تفسیر "ابوالفتوح رازی" جلد ۱۱ ص ۲۸۰

۲۶۔ وَ قَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ
دَيَّارًا ○

۲۷۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَا
كَفَّارًا ○

۲۸۔ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِ
وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِل
تَبَارًا ○

ترجمہ

۲۶۔ نوح نے کہا: پروردگارا! روئے زمین پر کفّار میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ رہنے دے۔

۲۷۔ کیونکہ اگر تو انھیں رہنے دے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ایک فاجر و کافر نسل کے سوا کچھ وجود میں نہیں لائیں گے۔

۲۸۔ پروردگارا! مجھے بخش دے، اور اسی طرح میرے ماں باپ کو اور ان تمام لوگوں کو، جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ وارد ہوئے، اور تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں میں ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ فرما۔

تفسیر

اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے!

یہ آیات اسی طرح سے، نوح کی گفتگو اور خدا کی بارگاہ میں قوم کی شکایت اور ان کے بارے میں بددعا اور نفرین کو جاری رکھے ہوئے ہیں، فرماتا ہے: ”پروردگارا! کفار میں سے کسی کو روئے زمین پر زندہ نہ رہنے دے“ (وقال نوح رب لا تذر علی

رض من الکافرین دیارًا)۔

یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب وہ مکمل طور پر ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے تھے اور اپنی آخری کوشش ان کے ایمان لانے کے سلسلہ میں کر چکے تھے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے۔

"علی الارض" (صفحۂ زمین پر) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح کی دعوت بھی عالمی اور جہانی تھی اور وہ طوفان اور عذاب بھی جو بعد میں آیا عالمی تھا۔

"دیار" (بروزن سیّار) "دار" کے مادہ سے، اس شخص کے معنی میں ہے جو گھر میں رہائش رکھتا ہو، یہ لفظ عام طور پر نفی عموم کے موارد میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے (ما فی الدار دیار) (گھر میں کوئی نہیں رہتا) [1]

اس کے بعد نوحؑ اپنی نفرین اور بد دعا کرنے کے بارے میں استدلال کرتے ہیں اور مزید کہتے ہیں: "کیونکہ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور فاجر و کافر نسل کے سوا اور کچھ وجود میں نہیں لائیں گے"۔ (انك ان تذرھم یضلوا عبادك ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا)۔

یہ گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی نفرین و بد دعا، جن میں نوح بھی ہیں، غیظ و غضب، انتقام جوئی اور کینہ پروری کی بناء پر نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ ایک منطقی حساب کی صورت میں ہوتی تھی اور نوح کم حوصلہ افراد کی طرح نہیں تھے کہ تھوڑی سی بات کے لیے آپے سے باہر ہو جائیں اور نفرین و بد دعا کرنے لگ جائیں، بلکہ آپ نے نوسو پچاس (۹۵۰) سال کی دعوت، صبر و شکیبائی اور خونِ دل پینے اور مکمل مایوسی کے بعد نفرین کے لیے زبان کھولی تھی۔

اس بارے میں کہ نوحؑ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اس کے ساتھ وہ ان بندگانِ خدا کو جو اس ماحول میں رہتے تھے گمراہ کریں گے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی آنے والی نسل بھی فاسد و مفسد ہو گی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اس غیب پر اطلاع و آگاہی کی بناء پر تھا جو خدا نے انھیں دیا تھا۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ نوحؑ نے اس مطلب کا وحی الٰہی سے استفادہ کیا تھا، جہاں فرماتا ہے: واوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومك الا من قد اٰمن۔ نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی بھی شخص سوائے ان کے جو ایمان لا چکے ہیں، ایمان نہیں لائیں گے۔" (سورہ ہود آیہ ۳۶) [2]

لیکن یہ احتمال بھی قابلِ قبول ہے کہ نوحؑ نے، فطری عادت اور عمومی حساب سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا، کیونکہ وہ قوم جسے ساڑھے نوسو سال تک موثر ترین بیانات کے ساتھ تبلیغ کی گئی ہو، اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے ہوں، اس کی ہدایت کی امید نہ تھی اور حقیقت یہ کافر رہ

---

[1] بعض کا کہنا ہے کہ اصل میں "دیوار" (بروزن حیوان) تھا، اس کے بعد "واؤ" "یاء" میں بدل گئی، اور یاء کا یاء میں ادغام ہو گیا (دیکھئے مفردات راغب الفاظ) جلد ۶ ص ۱۴۵ و تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] اس معنی کی طرف بہت سی روایات میں اشارہ ہوا ہے (نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۸)

معاشرے میں قطعی اکثریت رکھتا تھا اور تمام وسائل وامکانات ان کے اختیار میں تھے، لہٰذا طبعاً وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر
اور اس قسم کی قوم کی آئندہ نسل قطعی طور پہ فاسد اور خراب ہوتی، ان تینوں احتمالات کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"فاجر" اس شخص کے معنی میں ہے جو بُرے اور قبیح گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور "کفار" "کفر" میں مبالغہ ہے، اس بناء پر ان دو الفاظ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک عملی کاموں سے مربوط ہے اور دوسرا اعتقادی پہلوؤں سے۔

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ خدا کے عذاب "حکمت" کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ وہ جمعیت جو فاسد و مفسد ہو اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی فساد و گمراہی کے خطرے سے دوچار ہوں، وہ خدا کی حکمت میں زندگی اور حیات کا حق نہیں رکھتیں، طوفان یا (بجلی) یا زلزلہ یا کوئی اور دوسری بلا نازل ہوگی اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے گی، جیسا کہ طوفانِ نوحؑ نے زمین کو اس بری قوم کے وجود کی گندگی سے پاک کر دیا۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ قانونِ الٰہی کسی خاص زمانہ اور مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ اگر اس وقت بھی کوئی فاسد و مفسد قوم اور اس کی اولاد "فاجر" "کفار" ہو تو انھیں بھی عذابِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے، کیونکہ ان امور میں کوئی تبعیض نہیں ہے اور یہ ایک سنت الٰہی ہے۔

"یضلوا عبادك" (تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس چھوٹے سے مومنین کے گروہ کی طرف اشارہ ہو، جو اس طویل مدت میں نوحؑ پر ایمان لایا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ عامۃ الناس میں سے مستضعف لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو گمراہ رہبروں کے دباؤ اور فشار سے ان کے دین و مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔

آخر میں نوحؑ اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے تھے اس طرح دعا کرتے ہیں: پروردگارا! مجھے بخش دے اور اسی طرح میرے ماں باپ اور ان تمام لوگوں کو جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوئے تھے اور تمام مومنین و مومنات کو بھی بخش دے اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر" (رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنًا وللمؤمنین والمؤمنات ولا تزد الظالمین الا تبارًا)۔[1]

یہ طلب مغفرت اس لیے ہے کہ نوحؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے صدہا سال مسلسل تبلیغ کی ہے، اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت جھیلی ہے، لیکن چونکہ ممکن ہے کہ اس مدت میں مجھ سے کوئی ترکِ اولیٰ سرزد ہوگیا ہو، تو میں اس کے بارے میں بھی عفو و بخشش کا تقاضا کرتا ہوں، اور تیری بارگاہ مقدس میں ہرگز خود کو بری قرار نہیں دیتا۔

اور "اولیاء اللہ" کی حالت اسی طرح ہے کہ وہ راہ خدا میں ہر قسم کی زحمت و تکلیف اور سعی و کوشش کے بعد بھی اپنے آپ کو مقصر سمجھتے ہیں اور ہرگز غرور و تکبر اور خود کو بڑا سمجھنے میں گرفتار نہیں ہوتے۔

نوحؑ حقیقت میں چند افراد کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔

---

[1] "تبار" ہلاکت کے معنی میں ہے اور "زیان اور خسارے" کے معنی میں بھی اس کی تفسیر ہوئی ہے۔

اول: اپنے لیے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قصور یا ترکِ اولیٰ ان سے سرزد ہو گیا ہو۔

دوم: اپنے ماں باپ کے لیے، ان کی زحمتوں کی قدردانی کے باعث اور حق شناسی کے پیشِ نظر۔

سوم: تمام ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے، اگرچہ وہ بہت تھوڑے تھے اور پھر وہ آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے کہ وہ کشتی بھی نوح کا گھر تھی۔

چہارم: تمام جہان اور طول تاریخ میں ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کے لیے، اور یہاں سے اپنا رابطہ سارے عالم کے مومنین سے برقرار کر رہے ہیں۔

لیکن آخر میں پھر ظالموں کی نابودی کی تاکید کرتے ہیں، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے ظلم کی بناء پر اسی قسم کے عذاب کے مستحق ہیں۔

چند نکات

نوحؑ پہلے اولوالعزم پیغمبر

قرآن مجید بہت سی آیات میں نوح کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور مجموعی طور پر قرآن کی انتیس سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، اور ان کا نام ۴۳ مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی زندگی کے مختلف حصوں کی باریک بینی کے ساتھ تفصیل بیان کی ہے ایسے حصے جو زیادہ تر تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت حاصل کرنے کے پہلوؤں سے مربوط ہیں۔

مورخین و مفسرین نے لکھا ہے کہ نوح کا نام "عبدالغفار" یا "عبدالملک" یا "عبدالاعلیٰ" تھا اور "نوح" کا لقب انھیں اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ وہ سالہا سال اپنے اوپر یا اپنی قوم پر نوحہ گری کرتے رہے۔ آپ کے والد کا نام "لمک" یا "لامک" تھا۔ اور آپ کی عمر کی مدت میں اختلاف ہے، بعض روایات میں ۱۴۹۰ اور بعض میں ۲۵۰۰ سال بیان کی گئی ہے، اور ان کی قوم کے بارے میں بھی طولانی عمریں تقریباً ۳۰۰ سال تک لکھی ہیں، جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے بہت طولانی عمر پائی ہے، اور قرآن کی صراحت کے مطابق آپ ۹۵۰ سال اپنی قوم کے درمیان رہے (اور تبلیغ میں مشغول رہے)۔

نوح کے تین بیٹے تھے "حام" "سام" "یافث" اور مورخین کا نظریہ یہ ہے کہ کرۂ زمین کی اس وقت کی تمام نسلِ انسانی کی بازگشت انھیں تینوں فرزندوں کی طرف ہے۔ ایک گروہ "حامی" نسل ہے، جو افریقہ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ "سامی" نسل ہے جو شرق اوسط اور مشرقِ قریب کے علاقوں میں رہتے ہیں اور "یافث" کی نسل کو چین کے ساکنین سمجھتے ہیں۔

اس بارے میں بھی، کہ نوحؑ طوفان کے بعد کتنے سال زندہ رہے، اختلاف ہے، بعض نے ۵۰ سال لکھے ہیں اور بعض نے ۶۰ سال۔

یہود کے منابع (موجودہ تورات میں بھی نوح کی زندگی کے بارے میں تفصیلی بحث آئی ہے، جو کئی لحاظ سے قرآن سے مختلف ہے، اور تورات کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے۔

یہ مباحث تورات کے سفر "تکوین" میں فصل ۶، ۷، ۸، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں۔

نوحؑ کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کا نام "کنعان" تھا۔ جس نے باپ سے اختلاف کیا، یہاں تک کہ کشتیٔ نجات میں ان کے بیٹھنے کے لیے بھی تیار نہ ہوا، اس نے بُرے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھی اور خاندانِ نبوت کی قدر وقیمت کو ضائع کردیا اور قرآن کی صراحت مطابق آخر کار وہ بھی باقی کفار کے مانند طوفان میں غرق ہوگیا۔

اس بارے میں کہ اس طویل مدت میں کتنے افراد نوحؑ پر ایمان لائے، اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے، اس میں بھی اختلاف بعض نے ۸۰ اور بعض نے ۷ افراد لکھے ہیں۔

نوحؑ کی داستان عربی اور فارسی ادبیات میں بہت زیادہ بیان ہوئی ہے، اور زیادہ تر طوفان اور آپ کی کشتیٔ نجات پر ہوا ہے۔[1]

نوحؑ صبر وشکر اور استقامت کی ایک داستان تھے، اور محققین کا کہنا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے وحی منطق کے علاوہ عقل واستدلال کی منطق سے بھی مدد لی (جیسا کہ اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح ظاہر ہے) اور اسی بناء پر آپ اس جہان کے خدا پرستوں پر ایک عظیم حق رکھتے تھے۔

ہم نوحؑ کے حالات کی تشریح کو امام باقرؑ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: نوح غروبِ آفتاب اور صبح کے وقت دعا اور مناجات پڑھا کرتے تھے۔

"امسیت اشهد انه ما امسی بی من نعمة فی دین او دنیا فانها من الله وحده لا شریك له، له الحمد بها علی والشکر کثیرًا فانزل الله "انه کان عبدًا شکورًا" فهذا کان شکره:

میں نے اس حالت میں شام کی ہے کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ دین و دنیا کی جو نعمت میں رکھتا ہوں، وہ اس خدائے یگانہ کی طرف سے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور میں اس کی نعمتوں پر اس کی حمد وثناء کرتا ہوں اور اس کا بہت بہت شکر کرتا ہوں۔

اسی بناء پر خدا نے قرآن میں یہ نازل فرمایا ہے کہ وہ شکر گزار بندہ تھا اور نوح کا شکر اسی طرح کا تھا۔[2]

۲۔ "رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنًا" "پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور جو شخص میرے گھر میں مومن وارد ہو بخش دے"۔ کے جملہ میں لفظ "بیت" کے معنی میں اختلاف ہے مجموعی طور پر اس کے چار معانی بیان کیے گئے ہیں بعض نے اسے شخصی اور ذاتی گھر کے معنی میں لیا ہے

---

[1] "اعلام القرآن"، "فرہنگ قصص قرآن"، "دائرۃ المعارف دهخدا" مادہ "نوح" و "بحار الانوار جلد ۱۱"

[2] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۲۹۱ حدیث ۳

بعض مسجد کے معنی میں لیتے ہیں ۔
بعض کشتی نوح کے معنی میں لیتے ہیں اور
بعض ان کے دین وآئین وشریعت کے معنی میں جانتے ہیں ۔
ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :
"یہاں بیت سے مراد ولایت ہے، جو شخص ولایت میں داخل ہوا وہ انبیاء کے گھر میں داخل ہوا ہے"۔
"من دخل فی الولایة دخل فی بیت الانبیآء علیھم السلام"

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ولایتِ آئمہ اہلِ بیت کو قبول کرنے کے طریق سے بیتِ انبیاء میں داخل ہوں ۔
پروردگارا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ ہم نوحؑ ایسے بزرگ انبیاء کے مانند تیرے دین وآئین کی طرف دعوت کی راہ میں خستہ نہ ہوں، اور ہرگز تھک ہار کر نہ بیٹھ جائیں ۔
بارالٰہا! جس وقت تیرے خشم وغضب کا طوفان آئے تو ہمیں اپنے لطف ورحمت کی نجات کی کشتی کے ذریعہ رہائی بخش دے ۔

آمین یارب العالمین
اختتام سورۂ نوح
اوّل ماہِ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ بوقت تقریباً پونے سات بجے صبح
۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷ء
۸۱۔ ای ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور
صفدر حسین نجفی

سورۂ جن

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۲۸ آیات ہیں

شروع

۲؍ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

سورہ جن کے مضامین ومطالب

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، زیادہ تر ایک دکھائی نہ دینے والی مخلوق کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جسے "جن" کہتے ہیں۔ یہ گفتگو ان کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے، قرآن مجید کے مقابلہ میں خضوع کرنے، معاد پر ان کے ایمان و اعتقاد، ان کے درمیان مومن وکافر گروہ کے وجود اور اسی قسم کے دوسرے مسائل سے متعلق ہے۔ سورہ کا یہ حصہ اٹھائیس آیات میں سے انیس آیات میں پھیلا ہوا ہے۔ اور "جن" کے بارے میں بہت سے بے ہودہ عقائد کی اصلاح کرتا ہے، اور انھیں باطل قرار دیتا ہے۔

اس سورہ کے دوسرے حصہ میں توحید ومعاد کے مسئلہ کے بارے میں اشارہ آیا ہے۔

اور اس سورہ کے آخری حصہ میں علم غیب کے مسئلہ کے متعلق گفتگو ہے، کہ کوئی بھی شخص اس سے آگاہ نہیں ہے، سوائے اس قدر جس کا خدا نے ارادہ کر لیا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الجن اعطى بعدد كل جنى وشيطان صدق بمحمد وكذب به عتق رقبة"

"جو شخص سورہ جن کو پڑھے تو اسے ہر جن اور شیطان کی تعداد کے برابر، جس نے محمدؐ کی تصدیق یا تکذیب کی ہے، غلام آزاد کرنے کا ثواب دیا جائے گا"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من اكثر قراءة قل اوحى لم يصبه فى الحيوٰة الدنيا شىء من اعين الجن ولا نفثهم ولا سحرهم، ولا كيدهم، وكان مع محمد (ص) فيقول يارب لا اريد منه بدلا ولا ابغى عنه حولا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۵

"جو شخص سورۂ جن کو بکثرت پڑھے، تو وہ دنیا کی زندگی میں، ہرگز جنوں کی نظرِ بد، ان کے جادو ، سحر اور مکر و فریب سے نقصان نہیں اٹھائے گا، اور وہ محمدؐ کے ہمراہ ہوگا اور کہے گا: "پروردگارا! میں اس کی بجائے کسی اور کو نہیں چاہتا اور نہ ہی اس سے کسی دوسرے کی طرف مائل ہوتا ہوں"۔[1]

البتہ یہ تلاوت، اس سورہ کے مضامین و مطالب پر آگاہ ہونے، اور پھر اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۲۹۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ قُلۡ اُوۡحِىَ اِلَىَّ اَنَّهُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ

۲۔ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنۡ نُّشۡرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۙ

۳۔ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ

۴۔ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوۡلُ سَفِيۡهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۙ

۵۔ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ

۶۔ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ يَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡهُمۡ رَهَقًا ۙ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

۱۔ کہہ دیجیے کہ مجھے وحی ہوئی ہے کہ "جن" کی ایک جماعت نے کان دھر کے میری باتیں سنیں تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔

۲۔ جو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لے آئے، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک

قرار نہیں دیتے۔

۳۔ اور بے شک ہمارے باعظمت پروردگار کا مقام بلند ہے، اور اس نے ہرگز اپنے لیے بیوی اور اولاد کا انتخاب نہیں کیا ہے۔

۴۔ اور بے شک ہمارے بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا باتیں کیا کرتے تھے۔

۵۔ اور ہم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ جن اور انسان ہرگز خدا پر جھوٹ نہیں باندھتے۔

۶۔ اور بے شک انسانوں میں سے کچھ لوگ، جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، اور وہ ان کی گمراہی اور طغیان میں زیادتی کا سبب بنا کرتے تھے۔

شانِ نزول

سورۂ احقاف کی آیہ ۲۹ تا ۳۲ کی تفسیر میں کچھ شان نزول بیان ہو چکی ہیں، جو زیر بحث سورہ (سورۂ جن) کے مطالب سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، اور وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ دونوں سورتوں کی آیات ایک ہی واقعہ سے مربوط ہیں۔ وہ شانِ نزول مختصر طور پر اس طرح ہے:

۱۔ پیغمبرؐ مکہ سے طائف کے بازار "عکاظ" کی طرف آئے تاکہ اس عظیم مرکزِ اجتماع میں لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں لیکن کسی نے آپ کی دعوت کا کوئی مثبت جواب نہ دیا، واپسی پر آپ ایک ایسی جگہ پہنچے جسے "وادی جن" کہتے تھے، رات آپ وہیں رہے اور قرآن کی آیات کی تلاوت فرماتے رہے، جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو وہ ایمان لے آئے اور تبلیغ کے لیے اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے۔[1]

۲۔ "ابن عباس" کہتے ہیں "پیغمبر صبح کی نماز میں مشغول ہوئے اور اس میں قرآن کی تلاوت کر رہے تھے، جنوں کا ایک گروہ آسمانی خبروں کے ان سے منقطع ہو جانے کی علّت کی تحقیق کر رہا تھا، انھوں نے محمدؐ سے قرآن کی تلاوت کی آواز سنی تو انھوں نے کہا کہ آسمانی اخبار کے ہم سے منقطع ہو جانے کی علت یہی ہے لہٰذا وہ اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی۔[2]

۳۔ "ابو طالب" کی وفات کے بعد جب رسولِ خدا پر معاملہ سخت ہو گیا تو آپ نے "طائف" کی طرف جانے کا ارادہ کیا تاکہ کوئی مددگار پیدا کریں۔ "طائف" کے رؤسا نے شدت کے ساتھ آپ کی تکذیب کی اور انھوں نے پیغمبر کی پشت پر اس قدر پتھر مارے کہ آپ کے پائے مبارک سے خون جاری ہو گیا، تھکے ماندے زخمی حالت میں ایک باغ کے پاس آئے اور انجام کار اس باغ کے مالکوں کا غلام جس کا

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۹ (تلخیص کے ساتھ)

[2] صحیح بخاری، مسلم و مسند احمد مطابق نقل "فی ظلال" جلد ۷، ص ۴۲۹ (تلخیص کے ساتھ)

نام "عداس" تھا، آنحضرتؐ پر ایمان لے آیا، آپ وہاں سے مکہ کی طرف لوٹے، رات ہوتے ایک کھجور کے درخت کے قریب پہنچے اور نماز میں مشغول ہوگئے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے "نصیبین" یا "یمن" کے "جنوں" کا ایک گروہ گزر رہا تھا۔ انھوں نے صبح کی نماز میں آنحضرت کی تلاوت کی آواز سنی تو وہ ایمان لے آئے۔[1]

بہت سے مفسرین نے اسی قسم کے شانِ نزول سورہ جن کے آغاز میں بھی نقل کیے ہیں۔

لیکن یہاں ایک اور شانِ نزول بھی بیان کی گئی ہے، جو ان سب سے مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ لوگوں نے "عبداللہ بن مسعودؓ" سے پوچھا: کیا تم اصحاب پیغمبرؐ میں سے، کوئی شخص "جن" والی رات کے واقعہ میں، پیغمبر کی خدمت میں تھا، اس نے کہا، کہ ہم میں سے کوئی نہیں تھا، ہم نے ایک رات مکہ میں پیغمبر کو نہ پایا، اور جس قدر ہم نے جستجو اور تلاش کی، آپ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم ڈرے کہ کہیں پیغمبرؐ کو دشمنوں نے قتل نہ کر دیا ہو، ہم پیغمبرؐ کو تلاش کرتے ہوئے مکہ کے دروں کی طرف گئے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ آپ کوہ "حرا" کی طرف سے آرہے ہیں ہم نے عرض کیا، اے رسولِ خدا آپ کہاں تھے؟ ہم سخت پریشان تھے اور کل رات ہماری زندگی کی بدترین رات تھی، آپ نے فرمایا: جنوں کی طرف سے ایک دعوت کرنے والا میرے پاس آیا تھا اور میں ان کے لیے قرآن پڑھنے کے لیے گیا تھا۔[2]

تفسیر

ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے

اب جو کچھ بیان ہو چکا، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے، آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: "کہہ دیجیے کہ میری طرف وحی ہوئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے میری باتوں کو کان لگا کر سنا، تو انھوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔" (قل اوحی الیّ انّه استمع نفر من الجن فقالوا انّا سمعنا قرانًا عجبًا)[3]

"اوحی الیّ" (میری طرف وحی کی گئی ہے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبر نے بذاتِ خود اس واقعہ میں جنوں کو مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ آپ وحی کے ذریعے آگاہ ہوئے ہیں کہ انھوں نے قرآنِ مجید کو کان دھر کے سُنا ہے۔

ضمنی طور پر یہ آیت، اچھی طرح سے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ گروہ "جن" صاحبانِ عقل و شعور، فہم و ادراک والے اور تکلیف و مسئولیت کے حامل ہیں، اور زبان سے آشنائی اور اعجاز آمیز کلام میں فرق کو سمجھتے ہیں، اور اسی طرح سے خود کو تبلیغ حق کا ذمہ دار جانتے ہیں

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹ ص ۹۲ وسیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۲، ۶۳ (تلخیص کے ساتھ)

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۸

[3] ارباب لغت وتفسیر کے قول کے مطابق "نفر" ۳ سے ۹ افراد تک کو کہا جاتا ہے۔

اور قرآن کے خطاب کے مخاطب بھی ہیں۔

یہ اس زندہ نظر نہ آنے والے موجود کی خصوصیات کا ایک حصّہ ہے، جو صرف اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے، ان کی کچھ اور خصوصیات بھی ہیں، جنھیں ہم انشاء اللہ اسی بحث کے آخر میں تفصیل سے بیان کریں گے۔

انھیں اس بات کا حق تھا کہ وہ قرآن کو ایک عجیب بات شمار کریں، کیونکہ اس کا لب ولہجہ اور طرز و آہنگ بھی عجیب ہے اور اس کا نفوذ کرنا اور قوت جاذبہ بھی۔ اس کے مضمون و مطالب اور اس کی تاثیر بھی عجیب ہے اور اس کا لانے والا بھی کہ جس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور وہ امیین میں سے مبعوث ہوا تھا۔

یہ ایک ایسا کلام ہے جو ظاہر و باطن میں عجیب ہے اور ہر دوسری گفتگو سے مختلف ہے، اور اس طرح سے انھوں نے قرآن کے معجزہ ہونے کا اعتراف کر لیا ہے۔

انھوں نے اس جملہ کے بعد کچھ اور باتیں بھی اپنی قوم سے کہیں، جنھیں قرآن نے بعد والی آیات میں بارہ جملوں میں بیان کیا ہے، جن میں ہر ایک "ان" کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جو تاکید کی نشانی ہے[1]۔

پہلے فرماتا ہے: انھوں نے کہا: "یہ قرآن سب کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک قرار نہیں دیتے"۔ (یھدی الی الرشد فاٰمنا بہ ولن نشرك بربّنا احدًا)۔

"رشد" کی تعبیر بہت ہی وسیع اور ایک جامع تعبیر ہے، جو ہر قسم کا امتیاز اپنے اندر لیے ہوئے ہے، ایک ایسا صاف ستھرا راستہ ہے جس میں کوئی پیچ و خم نہیں ہے، روشن اور واضح جو طے کرنے والوں کو سعادت و کمال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان کے اظہار اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بعد، انھوں نے صفات خدا کے بارے میں اپنی گفتگو کو اس طرح جاری رکھا: "ہمارے پروردگار کا باعظمت مقام (مخلوق کے ساتھ مشابہت اور ہر قسم کے عیب و نقص سے) بلند ہے اور اس نے اپنے لیے بیوی اور اولاد کا ہرگز انتخاب نہیں کیا (و انہ تعالیٰ جدّ ربّنا ما اتخذ صاحبة ولا ولدًا)۔

"جد" کے لغت میں بہت سے معانی ہیں منجملہ ان کے "عظمت"، "شدت"، "جدیت"، "حصہ و نصیب"، "نیا ہونا" اور اس کے مانند لیکن اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں نقل کیا ہے "قطع" کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر باعظمت وجود دوسرے

---

[1] علماء نحو کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "ان" جب مقول قول میں ہو تو اسے زیر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے اور اوپر والی آیات میں پہلے مرحلہ میں تو زیر کے ساتھ ہے، لیکن بعد والی آیات میں جن کا اس پر عطف ہے زبر کے ساتھ ہے۔ اس لیے بہت سے مفسرین اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ ان آیات میں مقدرات فرض کریں یا کچھ اور توجیہیں کریں، لیکن اس بات میں کیا حرج ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ نحوی قاعدہ استثناء بھی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن موارد میں مقول قول پر عطف ہو تو جائز ہے کہ اسے زبر کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی دلیل اس سورہ کی آیات ہیں۔

موجودات سے قطع اور جدا ہو جاتا ہے، لہذا یہ لفظ عظمت کے معنی میں آیا ہے۔

اسی طرح اس کے باقی معانی کے بارے میں اسی تناسب کو نظر میں رکھا جاسکتا ہے اور اگر دادا یا نانا کو جد کہا جاتا ہے، تو وہ بھی اس کی بزرگی، مقام اور سن کے واسطہ سے ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہاں "جد" کے بہت ہی محدود معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اس کی "صفات" کے معنی میں، اور بعض نے "قدرت" کے معنی میں، بعض نے "ملک وحکومت" کے معنی میں، بعض نے "نعمت" کے معنی میں اور بعض نے "نام" کے معنی میں تفسیر کی ہے، جو سب کے سب عظمت کے معنی میں جمع ہیں۔

لیکن چونکہ یہ تعبیر "جد" کے مشہور معنی، جو وہی "دادا" اور "نانا" کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ گروہ جن نے نادانی کی بناء پر اس قسم کی غیر مناسب تعبیر کو انتخاب کیا یعنی تم لوگ خدا کے بارے میں ہرگز اس قسم کی تعبیر نہ کرو۔[1]

یہ حدیث ممکن ہے ایسے مواقع کے لیے ہو، جہاں اس قسم کا اظہار ہوتا ہو۔ ورنہ قرآن ان آیات میں، جنوں کی باتوں کو موافق لب ولہجہ میں نقل کرتا ہے اور انھیں صحیح و درست سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جیسا کہ خطبہ ۱۹۱ میں آیا ہے۔

الحمد لله الفاشی فی الخلق حمده والغالب جنده والمتعالی جده

"حمد وستائش اس خدا کے لیے مخصوص ہے، جس کی حمد وثناء نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہے اور اس کا لشکر ہر جگہ کامیاب ہے اور اس کی مجد وعظمت بلند ہے۔

بعض روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ "انس بن مالک" کہتے ہیں :۔

کان الرجل اذا قرء سورة البقرة جد فی اعیننا

جب کوئی شخص سورۂ بقرہ کو یاد کر لیتا تھا اور اس کی قراءت کیا کرتا تھا، تو وہ ہماری نظر میں بزرگ اور باعظمت دکھائی دیتا تھا۔[2]

بہر حال مجد وبزرگی وعظمت کے معنی میں اس لفظ کا استعمال ایک ایسا مطلب ہے جو متون لغت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور موارد استعمال کے ساتھ بھی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان باتوں کے کہنے والے "جن" یہاں خصوصیت کے ساتھ اس مطلب پر تکیہ کرتے ہیں کہ خدا کی بیوی اور اولاد نہیں ہے اور احتمال یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بے ہودگی کی طرف اشارہ ہو جو عربوں میں موجود تھی، جو یہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ "ایک جن" بیوی سے، جسے خدا نے انتخاب کیا ہے۔

یہی معنی ایک احتمال کے عنوان سے سورۂ صافات کی آیہ ۱۵۸ کی تفسیر میں بھی آیا ہے "وجعلوا بینه و بین الجنة نسبًا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۸ و "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۳۵ تفسیر "علی بن ابراہیم" میں اس تعبیر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[2] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۸۰۱

" وہ خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری کے قائل تھے۔"

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: "اب ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا اور حق سے دور بات کیا کرتے تھے" (وانه كان يقول سفيهنا على الله شططًا)۔

یہاں ممکن ہے " سفیہ " کی تعبیر جنسی اور جمع کے معنی میں ہو، یعنی ہمارے سفہاء اور بے وقوف لوگ خدا کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، اور انھوں نے شبیہ و شریک بنا لیا تھا اور راہِ حق سے منحرف ہو کر فضول اور بے ہودہ باتیں کہا کرتے تھے۔

بہت سے مفسّرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں " سفیہ " کا مفہوم وہی ایک فرد ہے اور ابلیس کی طرف اشارہ ہے، جس نے خدا کے فرمان کی مخالفت کرنے کے بعد، اس کی ساحت مقدس کی طرف بہت سی ناروا نسبتیں دیں، یہاں تک کہ اس نے آدم کے سجدہ کے بارے میں، پروردگار کے حکم پر علی الاعلان اعتراض کیا، اور اسے حکمت سے دُور سمجھا، اور اپنے آپ کو آدم سے افضل اور برتر خیال کیا۔

چونکہ " ابلیس " " جن " تھا۔ لہٰذا مومنین جن اس سے نفرت کا اظہار کر رہے ہیں، اور اس کی بات کو فضول اور حق سے دور کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ وہ ظاہرًا عالم و عابد تھا۔ لیکن عالم بے عمل اور عابد خود خواہ و منحرف و مغرور، " سفیہ " کے واضح مصادیق میں سے ہے۔

" شطط " (بروزن وسط) حدِ اعتدال سے خارج ہو کر دور جا پڑنے کے معنی میں ہے۔ اس لیے وہ باتیں جو حق سے دور ہوں انھیں شطط کہا جاتا ہے اور اسی لیے ان بڑے دریاؤں کے کناروں کو جن کا فاصلہ پانی سے زیادہ دور ہو اور اس کی دیواریں بلند ہوں " شط " کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: " ہم یہ گمان کیا کرتے تھے کہ انسان اور جن ہرگز خدا پر جھوٹ نہیں باندھیں گے" (وانّا ظننا ان لن تقول الانس والجن على الله كذبًا)۔

ان کی یہ بات ممکن ہے اس اندھی تقلید کی طرف اشارہ ہو جو یہ گروہ اس سے پہلے دوسروں کی کیا کرتا تھا اور اس بناء پر وہ خدا کا شریک بناتے تھے اور اس کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ان مسائل کو دوسروں سے بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیا تھا تو وہ غلط فہمی کی بناء پر تھا۔ ہمیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ انسان اور جن اتنی جرأت کریں گے کہ اتنا بڑا جھوٹ خدا پر باندھیں گے، لیکن اب جبکہ ہم نے اس بات کی تحقیق کر لی ہے اور حق کو معلوم کر لیا ہے اور اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ لہٰذا ہم اب اس ناروا تقلید کو غلط سمجھتے ہیں، اور اس طرح اپنی غلطی اور مشرکین جن کے انحراف کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا: جنوں اور انسانوں کے انحرافات میں سے ایک یہ تھا کہ " انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ کی پناہ لیا کرتے تھے، اور وہ ان کی گمراہی، گناہ اور طغیان و سرکشی کی زیادتی کا سبب بنتے تھے" (وانه كان رجال من الانس

...وذون برجال من الجن فزادوھم رھقًا)۔

"رھق" (بروزن شفق) اصل میں کسی چیز کو قہر و غلبہ کے ذریعے چھپانے کے معنی میں ہے اور چونکہ گمراہی، گناہ، طغیان اور خوف انسان ...قلب و روح پر مسلط ہوجاتے ہیں اور اس کو چھپا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کا ان معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

بہت سے مفسّرین نے اس جملہ کو ایک دوسری بیہودہ اور فضول بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں موجود تھی اور وہ یہ تھی کہ ...ب عربوں کے قافلے رات کے وقت کسی درّہ میں داخل ہوتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے۔

اعوذ بعزیز ھٰذا الوادی من شرّ سفھاء قومه!

"میں اس سرزمین کے بزرگ و رئیس کی —— اس کی قوم کے ....؟ اور بے وقوفوں کے شر
سے —— پناہ مانگتا ہوں"۔

اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس بات کے کہنے سے جنوں کا بزرگ و رئیس، ان کی نادان اور بیوقوف جنوں کے شر سے حفاظت کرے گا[۵۱]
اور چونکہ خرافات اور بیہودہ باتوں سے انحطاط فکری خوف اور گمراہی بڑھتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں "فزادوھم رھقًا" کا جملہ آیا ہے۔
ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں میں بھی مرد اور عورتیں ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں "رجال من الجن" کی تعبیر آئی ہے[۵۲]

لیکن آیت کا مفہوم بہرحال ایک وسیع مفہوم ہے، جو انسانوں کی جنوں سے ہر قسم کی پناہ لینے کو شامل ہے اور اوپر والی فضول اور بیہودہ بات اس کا ایک مصداق ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عربوں کے درمیان کاہن بہت تھے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جنوں کے ایک گروہ کے ذریعہ بہت سی مشکلات کو حل کرتے ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر دیتے ہیں۔

---

[۵۱] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۶۹ و "روح المعانی" جلد ۲۸ ص ۸۵

[۵۲] اوپر والی آیت کی تفسیر میں ایک اور بیان بھی آیا ہے جسے مفسرین کے ایک گروہ نے ایک احتمال کے عنوان سے آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت کا جنوں کی طرف پناہ حاصل کرنا، جنوں کے طغیان کا سبب بنا اور انھوں نے خود کو اہم کاموں کا مبداء و منشاء خیال کر لیا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے (پہلی تفسیر کے مطابق "زادوا" میں ضمیر "جن" کی طرف لوٹتی ہے اور "ھم" کی ضمیر انسانوں کی طرف، دوسری تفسیر کے برعکس)۔

۷۔ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝

۸۔ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝

۹۔ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝

۱۰۔ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝

ترجمہ

۷۔ اور انھوں نے بھی یہی گمان کر لیا تھا، جیسا کہ تم گمان کرتے تھے، کہ خدا ہرگز کسی کو (نبوّت پر) مبعوث نہیں کرے گا۔

۸۔ اور ہم نے آسمان میں جستجو کی، تو ہم نے سب کو قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے پُر پایا۔

۹۔ اور ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں بیٹھ جایا کرتے تھے، لیکن اب اگر کوئی چوری چھپے سننا چاہتا ہے، تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پاتا۔

۱۰۔ اور اب (ان حالات میں) ہم نہیں جانتے کہ اہلِ زمین کے بارے میں ان کے پروردگار نے کسی شر اور برائی کا ارادہ کیا ہے، یا ان کی ہدایت کا ارادہ کیا ہے۔

تفسیر

ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے، لیکن ......

یہ آیات اسی طرح سے "جن مومنین" کے بیان کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو اپنی قوم کو تبلیغ کرتے وقت بیان کر رہے تھے، اور مختلف طریقوں سے انھیں اسلام اور قرآن کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ پہلے کہتے تھے: "انسانوں کا ایک گروہ، تمھاری طرح ہی یہ گمان کرتا تھا۔ کہ خدا کسی بھی انسان کو (موسیٰ و مسیحؑ کے بعد) نبوت کے ساتھ مبعوث نہیں کرے گا" (وانهم ظنوا كما ظننتم ان لن يبعث الله احدًا)۔

لہٰذا وہ قرآن کے انکار اور پیغمبر اسلام کی نبوت کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن ہم نے جب غور سے اس کتاب آسمانی کی آیات کو سنا، تو ہم نے اس کی حقانیت کا واضح طور پر ادراک کر لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی مشرک انسانوں کی طرح کافر ہو جاؤ اور انھیں جیسی سرنوشت میں گرفتار ہو جاؤ۔

یہ تعبیر مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ جب جنوں کی منطق یہ ہے اور ان کا فیصلہ یہ ہے تو پھر وہ بیدار ہو جائیں اور قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کے دامن سے متمسک ہو جائیں۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "ان لن يبعث الله احدًا" کا جملہ معاد کے انکار کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ پیغمبر کی بعثت کے انکار کی طرف۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت کلی طور پر خدا کا کلام ہے، نہ کہ مومنین "جن" کا اور یہ جملہ ہائے معترضہ کی صورت میں ان کی باتوں کے درمیان آیا ہے اور اس میں مخاطب مشرکین عرب ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ اے مشرکین عرب جن بھی تمھاری طرح ہی اسی طرح کا گمان رکھتے تھے کہ خدا کسی بھی رسول کو مبعوث نہیں کرے گا۔ لیکن قرآن کو سننے کے بعد وہ اپنی غلطی کو سمجھ گئے۔ لہٰذا اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم بھی بیدار ہو جاؤ۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ جن مومنین کی گفتگو ہی چل رہی ہے اور اس میں "کافرین جن" مخاطب ہیں۔

اس کے بعد مومنین جن، اپنی گفتگو کی صداقت کی ایک نشانی کی طرف ـــــ جو عالم طبیعت میں تمام جنوں کے لیے قابل ادراک ہے ـــــ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم نے آسمانوں میں جستجو کی، تو ہم نے ان سب کو نگہبانوں اور قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے بھر پور پایا" (وانا لمسنا السماء فوجدناها ملئت حرسًا شديدًا و شهبًا)۔[۱،۲]

ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور وہاں سے کچھ خبریں معلوم کر لیا کرتے تھے۔

۱۔ "لمسنا" "لمس" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی مشہور ہے، لیکن یہاں طلب و جستجو سے کنایہ ہے (مفردات راغب و تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی)۔

۲۔ "حرس" (بروزن قفس) جمع ہے "حارس" کی، جو نگہبان کے معنی میں ہے اور بعض اس کو اسم جمع سمجھتے ہیں۔

اور اپنے دوستوں کو ان کی اطلاع دے دیا کرتے تھے، لیکن اب معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ اب اگر کوئی چوری چھپے کچھ سننا چاہتا ہے تو
گھات میں ایک شہاب کو پاتا ہے جو اس کو نشانہ بنا لیتا ہے"۔ (وانا کنا نقعد منھا مقاعد للسمع فمن یس
الاٰن یجد لہ شھابًا رصدًا)۔

تو کیا یہ نئی وضع و کیفیت اس حقیقت کی دلیل نہیں ہے کہ اس پیغمبر کے ظہور اور اس کی کتاب آسمانی کے نزول سے عالم میں ا
تغیر پیدا ہو گیا ہے ؟ آخر پہلے تم میں چوری چھپے سننے کی طاقت کیوں تھی اور اب تم میں سے کوئی بھی اس کام پر قدرت کیوں نہیں رکھتا
اس وضع جدید اور نئی کیفیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شیطنت، کہانت اور مکر و فریب کا دور ختم ہو گیا ہے اور جہالت کی تاریک رات ڈھل
ہے اور وحی و نبوت کا آفتابِ عالم تاب طلوع ہو گیا ہے۔

"شہاب" اصل میں اس شعلہ کے معنی میں ہے جو آگ میں سے بھڑک کر نکلتا ہے اور اس آتشین شعلہ کو بھی جو ایک لمبے خط
صورت میں آسمان سے ظاہر ہوتا ہے "شہاب" کہتے ہیں۔ موجودہ دور کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق وہ پتھروں کے چھوٹے ٹکڑے
ہیں، جو کرہ زمین سے باہر کی فضا میں حرکت کر رہے ہوتے ہیں، جب وہ زمین کے قریب آتے ہیں تو اس کی قوت کشش کے زیر اثر آجا
ہیں، اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف گرتے ہیں، جب وہ فضا یعنی زمین کے گرداگرد پھیلی ہوئی تہ بہ تہ ہوا میں داخل ہوتے ہیں، تو اس
ساتھ شدید ٹکراؤ کی وجہ سے جل کر آگ بن جاتے ہیں، اور جلانے والے شعلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور آخر کار ان کی راکھ
پر آگرتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ مسئلہ بارہا بیان ہوا ہے کہ "شہاب" وہ تیر ہیں جو ان شیاطین کی طرف، جو چوری چھپے باتیں سننے کا ارادہ کر
ہیں، پھینکے جاتے ہیں۔

اس بارے میں کہ چوری چھپے سننے سے مراد کیا ہے ؟ اور جن اور شیاطین آسمان سے کس طرح بھگائے جاتے ہیں ؟ ہم نے سورۂ
کی آیہ ۱۸ کے ذیل میں (جلد ۶ ص ۱۴۴ کے بعد)، اور سورۂ صافات کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں (جلد ۱۰ ص ۴۵۱ کے بعد) تفصیلی مباحث
پیش کیے ہیں۔

بہرحال لفظ "رصد" (بروزن حسد) کسی چیز کے انتظار میں آمادگی کے معنی میں ہے، جسے فارسی (اور اردو) میں "گھات لگا کر بیٹھے"
سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعض اوقات اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز یا وہ شخص جو گھات لگا کر بیٹھا ہو اور اوپر والی
آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا کہ ان اوضاع و حالات میں ہم نہیں جانتے، کہ کیا یہ چوری چھپے سننے کی ممنوعیت اس بات کی دلیل ہے
کہ زمین پر رہنے والے لوگوں کے لیے کسی شر اور برائی کا ارادہ ہوا ہے، یا خدا یہ چاہتا ہے کہ انھیں اس طریقہ سے ہدایت کرے"
(وانا لا ندری اشر ارید بمن فی الارض ام اراد بھم ربھم رشدًا)۔
دوسرے لفظوں میں ہم نہیں جانتے کہ کیا یہ امر خدا کی طرف سے نزولِ عذاب و بلا کا مقدمہ ہے یا ان کی ہدایت کی تمہید ہے۔
لیکن مومنین جن کو اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چوری چھپے سننے کی ممانعت، جو پیغمبرِ اسلام کے ظہور کے قریب ہوئی ہے، انسانوں کی

مقدمہ ہے اور کہانت کے اداروں اور اسی جیسی خرافات کے ختم ہونے کی تمہید ہے ۔ اور یہ چیز تاریکی کے دور کے ختم ہونے اور ایک روشن دور کے آغاز کے اعلان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی ۔

لیکن چونکہ " جن " چوری چھپے سننے کے مسئلہ سے ایک خاص دلچسپی رکھتے تھے ۔ لہٰذا وہ ابھی یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ محرومیت ایک خیر و برکت ہے ۔ ورنہ یہ بات واضح ہے کہ زمانہ جاہلیت کے کاہن اسی چوری چھپے سننے کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے ، لوگوں کے ایک بڑے حصہ کو گمراہ کیا کرتے تھے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ اس جملہ میں ہدایت کی نسبت تو خدا کی طرف دیتے ہیں ، لیکن شر کو فعلِ مجہول کی صورت میں، خدا کی طرف نسبت دیئے بغیر ذکر کرتے ہیں ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ آتا ہے وہ خیر و ہدایت ہوتی ہے ۔ لیکن شر و فساد، خود لوگوں کی طرف سے اور خدا کی نعمتوں اور مواہبِ آفرینش کے سوءِ استفادہ سے پیدا ہوتا ہے ۔

١١۔ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ
قِدَدًا ۙ﴿﴾
١٢۔ وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ
هَرَبًا ۙ﴿﴾
١٣۔ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا
یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ۙ﴿﴾
١٤۔ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ
فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿﴾
١٥۔ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ﴿﴾

ترجمہ

١١۔ اور یہ کہ ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم مختلف گروہ ہیں ۔

١٢۔ اور یہ کہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم زمین میں ہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے ، اور نہ ہی اس کے پنجۂ قدرت سے فرار کر سکتے ہیں۔

١٣۔ اور یہ کہ جب ہم نے قرآن کی ہدایت سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، اور جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے پھر وہ نہ تو نقصان سے ڈرتا ہے اور نہ ہی ظلم سے ۔

١٤۔ اور یہ کہ ہم میں سے ایک گروہ تو مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم ہے اور جو شخص اسلام کو اختیار کرے، اس نے سیدھی راہ کو انتخاب کر لیا ہے ۔

١٥۔ اور ظالم تو ہیں ہی دوزخ کا ایندھن ۔

تفسیر

ہم نے حق کو سنا اور سرِ تسلیم خم کرلیا

یہ آیات اسی طرح جن مومنین کی باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، یعنی وہ باتیں جو انھوں نے اپنی گمراہ قوم کو تبلیغ کرتے وقت کہی تھیں، پہلی آیت میں ان کی زبانی کہتا ہے: ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم میں مختلف گروہ ہیں" (و انا منا الصالحون و منا دون ذالک کنا طرائق قددًا)۔

احتمال یہ ہے کہ انھوں نے اس جملہ کو اس لیے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "ابلیس" کا قبیلہ "جن" میں سے ہونا، ان میں سے ایک گروہ کے دل میں یہ توہم پیدا نہ کردے، کہ جن کی طبیعت اور مزاج شر اور فساد، شیطنت پر ہے اور نورِ ہدایت ان کے دل میں ہرگز نہیں چمکتا۔

مومنین جن اس گفتگو سے یہ واضح کررہے ہیں کہ اصل اختیار اور آزادی ارادہ ان پر بھی حکم فرما ہے، اور صالح اور غیر صالح دونوں قسم کے افراد ان میں موجود ہیں۔ اس بناء پر ہدایت کی استعداد ان میں بھی موجود ہے اور اصولی طور پر تبلیغ کی تاثیر کے عوامل میں سے ایک طرف مقابل کی شخصیت کو جاگر کرکے، اسے ہدایت و کمال کی استعداد کے موجود ہونے کی طرف توجہ دلانا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مومنین نے، چوری چھپے سننے کے مسئلہ سے، سوء استفادہ کے موضوع سے، برائت کے لیے کہی ہو۔ یعنی اگرچہ ہم میں سے بعض، وہ اخبار جو وہ چوری چھپے سنا کرتے تھے، انھیں شریر انسانوں کے پاس پہنچا کر گمراہی کا سبب بنتے تھے۔ لیکن ہم میں سے تمام جن ایسے نہیں تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر جنوں کے بارے میں ہم انسانوں کی ذہنیتوں کی بھی اصلاح کرتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کے تصور میں لفظ "جن" شیطنت، فساد اور گمراہی کی ایک قسم کے ساتھ ہے۔ یہ آیت کہتی ہے کہ وہ بھی مختلف گروہ ہیں، صالح اور غیر صالح۔

لفظ "قدد" (بروزن پسر) "قد" (بروزن ضد) کی جمع ہے۔ جس کا معنی کٹا ہوا کے ہیں۔ اور مختلف گروہوں پر بھی۔ چونکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ٹکڑوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جن مومنین اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے دوسروں کو خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "ہمیں یقین ہے کہ ہم زمین میں، خدا کے ارادہ پر ہرگز غالب نہیں آسکتے، اور نہ ہی اس کے پنجۂ قدرت سے فرار کرسکتے ہیں"۔ (و انا ظننا ان لن نعجز اللّٰہ فی الارض و لن نعجزہ ھربًا)۔

اس بناء پر، اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ تم خدا کے عذاب سے بھاگ کر زمین کے کسی گوشہ میں یا آسمانوں کے کسی مقام میں نجات پا جاؤ گے، تو تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

اس طرح سے پہلا جملہ تو زمین میں خدا کے پنجۂ قدرت سے فرار کرنے کیلیے اور دوسرا جملہ مطلق فرار کرنے کی طرف اشارہ ہے، عام اس سے کہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم خدا پر غالب نہیں آسکتے، اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے پنجۂ عدالت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس بناء پر کہ نہ تو غلبہ کی کوئی راہ ہے اور نہ ہی بھاگنے کی، تو پھر اس کے فرمان عدل کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

جن مومنین اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم نے جب قرآن کی ہدایت کو سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے"۔ (وانّا لمّا سمعنا الھدیٰ اٰمنا بہ)۔

اور اگر ہم تمھیں قرآن کی ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تو ہم نے خود پہلے اس پروگرام پر عمل کیا ہے۔ اس بناء پر ہم دوسروں کو کسی ایسی چیز کی دعوت نہیں دے رہے ہیں، جسے ہم نے خود چھوڑ رکھا ہو۔

اس کے بعد ایمان کے نتیجہ کو ایک مختصر سے جملہ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تو اسے نہ تو نقصان کا کوئی ڈر ہے اور نہ ہی ظلم کا"۔ (فمن یؤمن بربہ فلا یخاف بخسًا ولا رھقًا)۔

"بخس" (بروزن شخص) ظلم وستم کے ذریعہ نقصان کے معنی میں ہے اور "رھق" (بروزن شفق)، جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں: "کسی چیز کے زور کے ساتھ چھپانے" کے معنی میں ہے۔

بعض نے ان دو تعبیروں کے درمیان فرق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "بخس" تو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کی "حسنات" اور نیکیوں میں سے کسی چیز میں کمی نہیں کی جائے گی اور "رھق" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے "سیئات" اور برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

بعض نے "بخس" کو "حسنات" کی کمی اور "رھق" کو "تکالیف شاقہ" کے معنی میں لیا ہے۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ مومنین جن چھوٹے اور بڑے کام کو انجام دیں گے، وہ اس کا اجر و ثواب، بے کم وکاست حاصل کریں گے۔

یہ درست ہے کہ پروردگار کی عدالت مومنین پر منحصر نہیں ہے، لیکن چونکہ غیر مومن کوئی عمل صالح رکھتے ہی نہیں، اس لیے ان کے اجر کی بات درمیان میں نہیں آئی۔

بعد والی آیت میں مومنوں اور کافروں کی سرنوشت کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کہتا ہے: "ہم قرآن کی ہدایت کے ذریعہ یہ جانتے ہیں کہ ہم میں سے ایک گروہ مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم و بیدادگر ہے۔ (وانّا منّا المسلمون و منّا القاسطون)[1]

لیکن جو اسلام کو اختیار کر لیں تو انھوں نے راہ راست کو انتخاب کیا ہے اور خدا کی ہدایت اور ثواب کی طرف قدم اٹھایا ہے

---

[1] "قاسط"، "قسط" کے مادہ سے عادلانہ تقسیم کے معنی میں ہے۔ یہ مادہ جب باب "افعال" کی صورت میں "اقساط" آئے تو اجرائے عدالت کے معنی میں ہے اور جب ثلاثی مجرد کی صورت میں استعمال ہو۔ (مثلاً اوپر والی آیت) تو پھر ظلم اور راہ حق سے انحراف کے معنی میں ہوتا ہے۔

(فمن اسلم فاولئك تحرّوا رشدا)۔[1]

"باقی رہے ظالم تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں"۔ (و اما القاسطون فکانوا لجهنم حطبًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں "مسلم" "ظالم" کے مقابلہ میں آیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو جو چیز ظلم سے باز رکھتی ہے وہ ایمان ہی ہے۔ ورنہ ایک بے ایمان فرد تو بہرحال ظلم وستم میں آلودہ ہوگا ہی، اور ضمنی طور پر بتاتا ہے کہ واقعی مومن وہ ہے جو ظلم وستم سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

المؤمن من أمنه الناس علی انفسهم واموالهم

"مومن وہ ہے کہ لوگ جس کی طرف سے اپنی جان ومال کے سلسلہ میں امان میں رہیں"۔[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده

"مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان آسودہ رہیں"۔[3]

"تحرّوا رشدا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ مومنین، توجہ، قصد وارادہ اور تحقیق کے ساتھ ہدایت حاصل کرتے ہیں، آنکھیں بند کرکے اندھی تقلید کے طور پر نہیں، اور ان کا بالاترین اجر حقیقت کو پالینا ہی ہے، جس کے زیر سایہ وہ خدا کی تمام نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں جبکہ ستم گروں کی بدترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن ہیں یعنی آگ ان کے وجود کے اندر سے شعلہ ور ہوگی۔

---

[1] "تحرّوا" "تحری" کے مادہ سے کسی چیز کا قصد کرنے کے معنی میں ہے۔

[2] تفسیر "روح البیان" جلد ۱۰ ص ۱۹۵

[3] "اصول کافی" جلد ۲۔ باب المومن وعلاماته وصفاته

۱۶۔ وَّاَنۡ لَّوِ اسۡتَقَامُوۡا عَلَی الطَّرِیۡقَۃِ لَاَسۡقَیۡنٰہُمۡ مَّآءً غَدَقًا ۙ﴿۱۶﴾

۱۷۔ لِّنَفۡتِنَہُمۡ فِیۡہِ ؕ وَ مَنۡ یُّعۡرِضۡ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّہٖ یَسۡلُکۡہُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿ۙ۱۷﴾

۱۸۔ وَّ اَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ﴿ۙ۱۸﴾

۱۹۔ وَّ اَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا ﴿ؕ٪۱۹﴾

ترجمہ

۱۶۔ اور اگر وہ (جن و انس) ایمان کے طریقہ پر استقامت اختیار کریں، تو ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں۔

۱۷۔ مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں اس فراواں نعمت کے ذریعہ آزمائیں اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا۔

۱۸۔ اور یہ کہ مساجد خدا ہی کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔

۱۹۔ اور یہ کہ جب خدا کا بندہ (محمدؐ عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور اسے پکارتا، تو کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

تفسیر

ہم تمھیں ان فراواں نعمتوں کے ذریعے آزمائیں گے

یہ آیات ظاہراً جن مومنین کی اپنی قوم سے گفتگو کو جاری رکھے ہوئے ہیں (اگرچہ کچھ مفسرین نے اسے خدا کا کلام سمجھا ہے، جو جملہ معترضہ کے طور پر جنوں کی گفتگو کے درمیان آیا ہے) ۔ لیکن چونکہ اس کا جملہ معترضہ ہونا خلاف ظاہر ہے اور آیات کی تعبیر گزشتہ آیات کے لب و لہجہ سے زیادہ

مشابہ ہے، جو جن مومنین کی گفتگو تھی، لہٰذا اس کا جنوں کا کلام نہ ہونا بعید ہے[1]

بہرحال گزشتہ آیات میں، قیامت میں مومنین کے لیے اجروثواب کے بارے میں گفتگو تھی، اور ان آیات میں ان کے دنیاوی اجروثواب کی گفتگو ہے، فرماتا ہے: "اگر وہ (جن وانس) ایمان کے طریقہ پر استقامت کریں، تو ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے"۔ (وان لواستقاموا علی الطریقة لاسقیناهم ماءً غدقًا)۔

ہم ان پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل کریں گے، اور حیات بخش پانی کے منابع اور چشمے ان کے اختیار میں دے دیں گے اور جہاں پانی کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں پر ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طرح سے ہم انھیں انواع واقسام کی نعمتوں سے نوازیں گے۔

"غدق" (بروزن شفق) فراواں پانی کے معنی میں ہے۔

قرآن مجید نے اس مطلب پر کئی بار تکیہ کیا ہے، کہ "ایمان وتقویٰ" نہ صرف معنوی برکات کا سرچشمہ ہیں، بلکہ مادی ارزاق کی زیادتی، نعمتوں کی کثرت، آبادی وعمران اور مادی برکت کی زیادتی کا موجب بھی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک تفصیلی بحث، جلد ۱۴ میں سورۂ نوح کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں "ایمان وتقویٰ کا عمران وآبادی سے رابطہ" کے عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس بیان کے مطابق، وہ چیز جو نعمت کی زیادتی کا سبب بنتی ہے، ایمان پر استقامت ہے، نہ کہ اصل ایمان کیونکہ وقتی اور جلدی گزر جانے والے ایمان سے اس قسم کی برکات ظاہر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اہم چیز ایمان، تقویٰ پر استقامت ہے، جس میں بہت سوں کے پاؤں لنگ کرنے لگتے ہیں اور لرزاں ہو جاتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اسی سلسلہ میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں وفورِ نعمت کے ذریعہ آزمائیں" (لنفتنهم فیه)۔

آیا نعمت کی زیادتی ان کے غرور وغفلت کا سبب بنتی ہے یا بیداری، شکرگزاری اور خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کا سبب ہوتی ہے۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی امتحان کے اہم اسباب میں سے ایک وفورِ نعمت ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ نعمت کے ذریعہ جو آزمائش ہوتی ہے، وہ عذاب کے ذریعہ ہونے والی آزمائش سے زیادہ سخت اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ کیونکہ نعمت کی زیادتی کا مزاج، سستی، کاہلی، غفلت اور لذائذ وشہوات میں غرق ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے، اور

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا وہ چیز جو اس بات کا سبب بنی ہے کہ مفسرین کا یہ گروہ اسے خدا کا کلام اور جملہ معترضہ سمجھیں "متکلم مع الغیر" کی ضمیریں ہیں، جو ان آیات میں استعمال ہوئی ہیں، ایک جگہ کہتا ہے کہ ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے، دوسری جگہ فرماتا ہے کہ: ہدف ومقصد یہ ہے کہ ہم انھیں آزمائیں۔ لیکن اگر ہم ان تعبیروں کو نقل بالمعنی جان لیں تو پھر کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی، یہ ٹھیک اس بات کے مشابہ ہے کہ کوئی اپنے دوست سے نقل کرے اور کہے کہ: فلاں آدمی کا عقیدہ یہ ہے کہ میں اچھا آدمی ہوں۔ البتہ اس نے لفظ "میں" استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے "وہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن کہنے والا اس قسم کی تعبیر استعمال کرتا ہے۔

میدان کو شیطان کی فعالیت کے لیے آمادہ کر دیتی ہے۔ صرف وہی لوگ وفورِ نعمت کی زیادتی کے غیر مطلوب عوارض سے امان میں رہ سکتے ہیں، جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہیں اور اس کے ذکر کو فراموش نہ کریں اور دائمی یاد کے ذریعہ خانۂ دل کو شیاطین کے نفوذ سے محفوظ رکھیں[1]

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے: "جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا" (ومن یعرض عن ذکر ربہ یسلکہ عذابًا صعدًا)۔

"صعد" (بر وزن سفر) صعود کرنے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات "گھاٹی" کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ گھاٹیوں کے اوپر جانے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ لفظ "مشقت اٹھانے والے کاموں" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا بہت سے مفسرین نے اوپر والی آیت کی اسی طرح تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد "مشقت والا عذاب" ہے۔ اس کے مشابہ جو سورۂ مدثر کی آیہ ۱۷ میں آیا ہے، جس میں بعض مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے: "سارھقہ صعودًا": "میں اسے مشقت والے عذاب میں ڈھانپ لوں گا"۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والی تعبیر، اس عذاب کے مشقت بار ہونے کے بیان کے ضمن میں، اس کے روز افزوں ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو۔

اس طرح اوپر والی آیات ایک طرف تو ایمان و تقویٰ کا، زیادتی نعمت سے تعلق بیان کرتی ہے۔ اور دوسری طرف نعمت کی زیادتی کا، خدا کی آزمائشات کے ساتھ تعلق بیان کرتی ہیں اور تیسری طرف خدا کی یاد سے روگردانی کا سخت ترین اور روز افزوں عذاب سے تعلق ظاہر کرتی ہیں، اور یہ ایسے حقائق ہیں، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۲۴ میں آیا ہے: ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکًا: "جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے گا تو اس کی زندگی تنگ اور سخت ہو جائے گی۔"

اور سورۂ نمل کی آیہ ۴۰ میں حضرت سلیمان کی زبانی بیان ہوا ہے: ھٰذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر: "یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، وہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں"۔

اور سورۂ انفال کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے: واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ "جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے آزمائش ہیں۔"

بعد والی آیت میں جن مومنین کی زبانی، دوسروں کو توحید کی طرف دعوت دینے کے موقع پر اس طرح کہتا ہے: "مساجد خدا کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو" (وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدًا)۔

اس بارے میں کہ یہاں "مساجد" سے کیا مراد ہے، گوناگوں تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

---

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ اوپر والی آیت میں "طریقہ" سے مراد وہی کفر کی راہ ہی ہے، اور اس راہ میں استقامت کے بعد نعمت میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ حقیقت میں عذاب کا ایک مقدمہ اور نعمت میں استدراج کا مصداق ہوتا ہے، لیکن یہ تفسیر زیر بحث آیت اور اس سے قبل و بعد کی آیات کے لب و لہجہ سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مکان اور جگہیں ہیں کہ جن میں خدا کے لیے سجدہ ہوتا ہے۔ جس کا مصداقِ اکمل، مسجد الحرام ہے اور اس کا دوسرا مصداق باقی مساجد ہیں اور زیادہ وسیع مصداق وہ تمام جگہیں ہیں جہاں انسان نماز پڑھتا ہے اور خدا کے لیے سجدہ کرتا ہے، اور پیغمبر کی معروف حدیث کے مطابق، جس میں آپ نے فرمایا:

جعلت لی الارض مسجدًا و طھورًا

"تمام روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور (تیمم کرنے کے لیے) طہارت کا ذریعہ قرار دی گئی ہے"[1]

اس میں ہر جگہ شامل ہے اور اس طرح سے یہ مشرکین عرب، اور ان جیسے لوگوں کے اعمال کا، جنھوں نے خانہ کعبہ کو بُت کدہ بنا رکھا تھا، ایک جواب یہ ہے، اور منحرف عیسائیوں کے اعمال کا بھی، جنھوں نے "تثلیث" کو اپنا لیا تھا اور اپنے گرجوں میں تین خداؤں کی پرستش کرتے تھے قرآن کہتا ہے: تمام عبادت گاہیں خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان عبادت گاہوں میں خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے غیر کی پرستش ممنوع ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ مساجد سے مراد، سجدہ کے سات اعضاء ہیں۔ ان اعضاء کو صرف خدا کے لیے زمین پر رکھنا چاہیے اور اس کے غیر کی لیے جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث میں نویں امام محمد بن علی الجوادؑ سے نقل ہوا ہے کہ "معتصم عباسی" نے ایک مجلس میں جس میں اہل سنت کے علماء جمع تھے، سوال کیا کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیے؟ بعض نے کہا کہ کلائی سے، اور اس نے تیمم والی آیت سے استدلال کیا، بعض دوسروں نے کہا کہ کہنی سے اور انھوں نے وضو والی آیت سے استدلال کیا، معتصم نے آپ سے اس سلسلہ میں وضاحت کی درخواست کی تو پہلے تو حضرت نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنے سوال سے صرفِ نظر کرے، جب اس نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ان حضرات نے کہا ہے وہ سب غلط ہے صرف چار انگلیاں جڑ سے کاٹی جانی چاہییں۔ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگوٹھا چھوڑ دینا چاہیے۔ جب معتصم نے اس کی دلیل طلب کی تو امام نے پیغمبرؐ کے اس ارشاد سے استدلال کیا کہ سجدہ سات اعضاء پر ہونا چاہیے۔ پیشانی، دو ہاتھ، دونوں گھٹنوں کے سرے اور پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے اور اس کے بعد مزید فرمایا کہ اگر کلائی یا کہنی سے کاٹا جائے گا تو ہاتھ اس کے لیے باقی نہیں رہے گا کہ جس پر وہ سجدہ کرے۔ جبکہ خدا نے یہ فرمایا ہے وان المساجد للّٰہ یعنی یہ سات اعضاء خدا کے لیے ہیں اور جو چیز خدا کے ساتھ مخصوص ہو اسے قطع نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات پر معتصم کو بہت تعجب ہوا اور اس نے حکم دیا کہ آنحضرتؑ کے حکم کے مطابق چور کا ہاتھ چاروں انگلیوں کی جڑ سے کاٹا جائے[2]

اس مضمون کی اور دوسری احادیث بھی نقل ہوئی ہیں[3]

لیکن جو احادیث اس سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں وہ عام طور پر سند کے بغیر ہیں، یا ان کی سند ضعیف ہے اور اس سے قطع نظر ان میں ایسا نقص پایا جاتا ہے جن کا جواب آسان نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے فقہاء کے درمیان یہ بات مسلّمہ ہے کہ اگر "چور" دوبارہ چوری کرے (جبکہ اس پر حد جاری ہو چکی ہو) تو اس کے پاؤں کے اگلے حصہ و قطع کریں گے اور پاؤں کی ایڑی کو سالم رہنے دیں گے۔ حالانکہ پاؤں کا انگوٹھا بھی سجدہ کے سات

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۲ ص ۹۷۰ حدیث ۳

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۴۹۰ (ابواب حد السرقہ باب ۴ حدیث ۵)

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۹ و ۴۴۰

مقامات میں سے ایک ہے اور اسی طرح "محارب" (ڈر کے ڈرنے والے) کے بارے میں جس کی سزاؤں میں سے ایک اس کے پاؤں کے ایک حصّہ کو قطع کرتا ہے۔

تیسرا یہ کہ" مساجد" سے مراد وہی سجود ہے یعنی سجدہ ہمیشہ خدا کے لیے ہونا چاہیے اور اس کے غیر کو سجدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ احتمال بھی آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے، اور اس پر کوئی بھی شاہد موجود نہیں ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ آیت کے ظاہر کے موافق ہے وہ پہلی تفسیر ہی ہے اور توحید اور عبادت کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کے بارے میں، قبل و بعد کی آیات سے مکمل مناسبت رکھتی ہے اور دوسری تفسیر آیت کے مفہوم میں وسعت کی قسم سے لیکن تیسری تفسیر پر کوئی شاہد نہیں ہے۔

اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے، قرآن مجید اور پیغمبرؐ کی عبادت کی، حد سے زیادہ تاثیر کو بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "جس وقت خدا کا بندہ ـــــ محمدؐ ـــــ عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور خدا کو پکارتا ہے تو جنوں کا ایک گروہ شدت سے اس کے اطراف میں جمع ہو جاتا ہے" (و انہ لمّا قام عبد اللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدًا)۔[1]

"لبد" (بروزن بدر) اس چیز کے معنی میں ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ رکھے گئے ہوں، اور یہ تعبیر اس پہلی ملاقات میں، قرآن سننے کے لیے، جن مومنین کے عجیب و غریب ہجوم کو بیان کرتی ہے، اور اسی طرح پیغمبرؐ کی نماز کے حد سے زیادہ قوت جذب کو بیان کرتی ہے۔

اس آیت کے لیے دو اور تفاسیر بھی بیان ہوئی ہیں پہلی یہ کہ مومنین جن پیغمبر کے اصحاب کی حالت کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ اتنی کم تعداد ہونے کے باوجود جو کہ میں ان کی تھی۔ پیغمبرؐ کے ارشادات کو سننے کے لیے کس طرح سر اور کندھے سے بھی اوپر چلے جاتے تھے۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ گروہ جن انھیں نمونہ بنا کر ایمان کی طرف آئیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین عرب کی حالت کا بیان ہے کہ جس وقت پیغمبر نماز اور قرآن میں مشغول ہوتے تھے تو وہ آپ کے اطراف کو سختی سے گھیر لیتے تھے اور استہزاء کرتے، مذاق اڑاتے اور آپ کو تکلیف و آزار پہنچاتے۔

لیکن آخری تفسیر جن مبلغین کے ہدف و مقصد کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ دوسروں کو ایمان کا شوق دلائیں لہٰذا مناسب گزشتہ دو معانی میں سے کوئی ایک ہی ہے۔

ایک نکتہ

آیہ "انّ المساجد للہ" کی تفسیر میں تحریف

پیغمبر اور اولیاء دین سے "توسل" کا مسئلہ یعنی ان حضرات کو بارگاہِ خدا میں وسیلہ اور شفیع قرار دینا ایک ایسا مفہوم ہے جو نہ حقیقت توحید سے

---

[1] اس تفسیر کے مطابق اور اس بناء پر کہ یہ جملہ جن مومنین کی گفتگو میں سے ہو، "متکلم" کی بجائے "غائب" کی ضمیر کا لانا باب "التفات" سے ہے۔ یا یہ اس لحاظ سے ہے کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کی حالت کو بیان کر رہا تھا۔ (غور کیجیے)

منافات رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی آیات سے، بلکہ یہ تو توحید پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ہر چیز خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید کی آیات میں بھی مسئلہ شفاعت اور اسی طرح مومنین کے لیے پیغمبر کی استغفار اور طلب بخشش کے مسئلہ کا بار بار اشارہ ہوا ہے۔[1]

اس کے باوجود بعض ایسے لوگوں کا ——— جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات سے دور ہیں ——— اصرار یہ ہے کہ ہر قسم کے توسّل اور شفاعت کا انکار کردیں اور اپنے مقصود کو ثابت کرنے کے لیے کچھ دستاویزات لائے ہیں۔ منجملہ ان کے اوپر والی آیت (و انّ المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدًا) ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے مطابق قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ کسی شخص کا نام نہ لو اور اس کے علاوہ کسی کو نہ پکارو، اور کسی سے شفاعت طلب نہ کرو۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ اس آیت کا اس مفہوم کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس کا ہدف اور مقصد شرک کی نفی ہے، یعنی کسی چیز کو خدا کے ساتھ عبادت کرنے میں یا حاجت طلب کرنے میں شریک قرار دینا۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی واقعی طور پر خدا کے کام غیر خدا سے چاہے اور اس کو صاحب اختیار اور ان کے انجام دینے میں مستقل شمار کرے تو وہ مشرک ہے۔ جیسا کہ لفظ "مع" (فلا تدعوا مع اللہ)" کے جملہ میں اس معنی کی گواہی دیتا ہے کہ کسی کو خدا کا شریک اور "مستقل تاثیر کا مبدء" نہیں جاننا چاہیے۔

لیکن اگر کوئی خدا کے انبیاء سے شفاعت چاہے یا پروردگار کی بارگاہ میں وساطت کا تقاضا کرے، تو یہ نہ صرف اس کی نفی نہیں کرتا، بلکہ قرآن بعض اوقات خود پیغمبرؐ کو اس بات کی دعوت دیتا ہے، اور کبھی دوسروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیغمبرؐ سے شفاعت طلب کریں۔

سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا وصل علیھم انّ صلاتک سکن لھم" ان کے مال سے زکوٰۃ لو تاکہ تم اس کے ذریعہ انھیں پاک کردو اور (زکات وصول کرتے وقت) ان کیلیے دعا کرو، کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے۔

اور سورۂ یوسف کی آیہ ۹۷ میں ان کے بھائیوں کی زبانی باپ کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیا ہے: یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا انّا کنّا خاطئین۔ اے اباجان! ہمارے لیے استغفار کیجیے کیونکہ ہم خطا کار تھے۔

یعقوب نے بھی، اس تقاضے کا نہ صرف انکار نہیں کیا بلکہ ان کی درخواست کی موافقت میں یہ وعدہ دیا اور کہا: سوف استغفر لکم ربّی" "میں بہت جلد تمھارے لیے بارگاہِ خدا سے بخشش کا تقاضا کروں گا۔"

اس بناء پر توسّل اور شفاعت طلب کرنے کا مسئلہ اس مفہوم کے ساتھ، جو بیان کیا گیا ہے، قرآن کے صریح احکام میں سے ہے۔

---

[1] ہم نے "قرآن وحدیث کی نظر میں "شفاعت" کے مسئلہ کے بارے میں، پہلی جلد سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں اور "توسل" کی حقیقت کے بارے میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۳۵ جلد ۳ میں، تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

۲۰۔ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝

۲۱۔ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝

۲۲۔ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْ
مُلْتَحَدًا ۝

۲۳۔ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَ
لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۝

۲۴۔ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَا
وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝

ترجمہ

۲۰۔ کہہ دیجیے: میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا۔

۲۱۔ کہہ دیجیے! میں تمھارے لیے کسی نقصان یا ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔

۲۲۔ کہہ دیجیے! (اگر میں بھی اس کے حکم کے خلاف کروں گا) تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے
اور اس کے علاوہ مجھے اور کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

۲۳۔ میری ذمہ داری تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ رسالت اور اس کے پیغاموں کو پہنچانا ہے، اور جو
خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنّم کی آگ ہے۔ وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ
رہے گا۔

۲۴۔ (کفار کی یہ کارشکنی اسی طرح جاری رہے گی) جب تک کہ وہ اسے دیکھ نہ لیں، جس کا انھیں وعدہ دیا گیا
اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار زیادہ ضعیف ہیں اور کس کی جمعیت بہت ہی کم ہے۔

تفسیر

کہہ دیجیے: میں کسی کے سود وزیاں کا مالک نہیں ہوں

ان آیات میں توحید کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے لیے ـــــ جس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا تھا ـــــ پہلے پیغمبر کو حکم دیا جاتا ہے: "کہہ دیجیے میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں، اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا" (قل انما ادعوا ربی ولا اشرك به احدًا)۔

اس کے بعد حکم ہے: "کہہ دیجیے میں تمھارے لیے سود وزیاں کا مالک نہیں ہوں اور ہدایت دوسرے کے ہاتھ میں ہے"۔ (قل انی لا املك لكم ضرًّا ولا رشدًا)۔

پھر مزید کہتا ہے: "کہہ دیجیے: اگر میں بھی خدا کے حکم کے خلاف کام کروں گا تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا، اور میں اس کے علاوہ کوئی اور ملجاء اور پناہ گاہ نہیں پاؤں گا" (قل انی لن یجیرنی من الله احد ولن اجد من دونه ملتحدًا)۔[1]

اس طرح سے نہ تو کوئی مجھے پناہ دے سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی چیز میری پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ یہ باتیں ایک طرف تو خدا کی بارگاہ میں مکمل عبودیت کا اعتراف ہے، اور دوسری طرف سے پیغمبرؐ کے بارے میں ہر قسم کے غلو کی نفی کرتی ہیں اور تیسری طرف سے یہ بتاتی ہیں کہ نہ صرف بتوں سے ہی کوئی کام نہیں ہوپاتا بلکہ خود پیغمبرؐ بھی اس عظمت کے باوجود عذابِ خدا کے مقابلہ میں ملجاء اور مستقل پناہ نہیں ہو سکتے۔ اور چوتھی طرف سے ان بہانہ جوئیوں اور بے محل توقعات کو ـــــ جو ہٹ دھرم لوگ پیغمبرؐ سے رکھتے تھے، اور ان سے خدائی کاموں کے تقاضے کرتے تھے ـــــ ختم کرتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ توسل اور شفاعت بھی اذنِ خدا سے ہی ہے۔

"ملتحدًا"، مطمئن پناہ گاہ کے معنی میں ہے اور اصل میں "لحد" (بروزنِ مہد) کے مادہ سے اس گڑھے کے معنی میں ہے جو ایک کنارے پر بنایا گیا ہو، جیسا کہ مردوں کے لیے قبر کی گہرائی میں کھودا جاتا ہے، جو قبر کی گہرائی میں ایک طرف کو زیادہ مقدار میں کھودتے ہیں اور مُردے کے جسم کو اس میں رکھتے ہیں تاکہ اس پر مٹی نہ گرے اور جانوروں کے آسیب سے بھی زیادہ محفوظ رہے، اس کے بعد ہر دوسری مطمئن جگہ اور پناہ گاہ پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ان تعبیرات کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ خدا کے مقابلہ میں اور مستقل طور پر کوئی نقش واثر

---

[1] بعض نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش نے پیغمبرؐ سے کہا کہ تم اپنے دین سے پھر جاؤ تاکہ ہم تمھیں پناہ دیں تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا (تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۲۹۳

نہیں رکھتے، اس کے باوجود وہ خدا سے لوگوں کے لیے مشکلات کے حل کا تقاضا کر سکتے ہیں، یا شائستہ اور لائق افراد کے لیے ہدایت کی ... کر سکتے ہیں اور یہ عین توحید ہے نہ کہ شرک۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں "ضر" (نقصان) کے مقابلہ میں "رشد" (ہدایت) کو قرار دیا گیا ہے، جو اس ... اشارہ ہے کہ حقیقی سود اور نفع ہدایت میں ہے۔ جیسا کہ جنات کی باتوں میں بھی گزشتہ آیات میں "شر" اور "رشد" کے مقابلہ میں قرار ... اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "میرا وظیفہ تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ اور اس کے پیغامات کو پہنچانا ہے" (الا بلا... من اللہ و رسالاتہ)[۱]

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جس کی طرف آیاتِ قرآنی میں بار بار اشارہ ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۹۲ میں آیا ہے: (انما ... رسولنا البلاغ المبین) "پیغمبر کے ذمہ تو صرف واضح طور پر ابلاغ کرنا (اور پہنچا دینا ہے)۔"

اور سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ میں آیا ہے:

قل لا املك لنفسي نفعًا ولا ضرًّا الّا ما شاء الله ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسّني السوء ان انا الّا نذير و بشير لقوم يؤمنون

"کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے لیے بھی سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں، اور اگر میں غیب کی خبر رکھتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سا نفع جمع کر لیتا اور کوئی بھی خرابی مجھے نہ پہنچتی۔ میں تو صرف اس گروہ کے لیے جو ایمان لے آتے ہیں، ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں"۔

اس جملہ کے لیے بہت سے مفسرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنی نجات کے لیے دعوتِ حق کے ابلا... اور اس کی رسالت کے ادا کرنے کے سوا، کسی قسم کی کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتا[۲]

یہ بات کہ "بلاغ" اور "رسالات" میں کیا فرق ہے۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "بلاغ" تو اصولِ دین کے ابلاغ کی طرف اشارہ ہے اور "رسالات" فروعِ دین کے بیان کی طرف۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ "بلاغ" احکامِ الٰہی کے معنی میں ہے اور "رسالات" ان کے اجراء کے معنی میں۔

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کی تاکید ہوں، اور قرآن کی بہت سی آیات اس طرح ہیں، جو ان دونوں کو ایک ہی معنی کی صورت میں بیان کرتی ہیں، مثلاً سورۂ اعراف کی آیہ ۶۲، جو یہ کہتی ہے "ابلغكم رسالات ربي"

۱۔ چونکہ "بلاغ" صرف "عن" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اس لیے بعض نے "من" کو "عن" کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے "کائنا" کا لفظ مقدر سمجھا ہے (الّا بلاغًا کائنًا من اللہ)

۲۔ اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ گزشتہ جملے ولن اجد من دونہ ملتحدًا سے استثناء ہے اور پہلی تفسیر کے مطابق یہ گزشتہ آیات سے استثناء ہے۔

پنے پروردگار کی رسالتیں تمھیں پہنچاتا ہوں" (اور دوسری متعدد آیات)

بہر حال آیت کے آخر میں خبردار کرتا ہے کہ "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی معصیت اور نافرمانی کرے گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا" (ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خالدین فیھا ابدًا)۔

یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد ہر گنہگار نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد مشرکین اور کافرین ہیں، کیونکہ ہر گنہگار ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہنے ..ی نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: کفار و مشرکین کی یہ وضع و کیفیت، کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کا استہزاء کرتے اور انھیں ضعیف اور کمزور شمار کرتے ہیں ..وقت تک یونہی جاری رہے گی، جب تک کہ وہ اس چیز کو نہ دیکھ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ جانیں گے کہ کس کے ..ر زیادہ ہیں، اور کس کی جمعیت کم ہے" (حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون فسیعلمون من اضعف ناصرًا و اقل ..ددًا)۔[1]

اس بارے میں کہ "ما یوعدون" کے جملہ سے دنیا کا عذاب مراد ہے یا آخرت کا یا دونوں؟ بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ..یں لیکن مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی عام اور وسیع ہو۔ خاص طور پر جبکہ تعداد کی زیادتی اور کمی، اور ناصر و مددگار کا ضعف و قدرت زیادہ تر دنیا ..ے ساتھ مربوط ہے۔ لہٰذا بہت سے مفسرین نے اس کی جنگِ بدر کے مسئلہ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی قدرت و قوت آشکار ..ہوئی تھی اور بہت سی روایات میں مہدی (ارواحنا فداہ) کے ظہور کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ اس بناء پر اگر ہم آیت کی اس کے ..سیع معنی کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ سب باتیں شامل ہوں گی۔

علاوہ ازیں سورۂ مریم کی آیہ ۷۵، میں بھی آیا ہے: حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون اما العذاب و اما الساعۃ فسیعلمون ..ن ھو شر مکانًا و اضعف جندًا - یہ کیفیت اسی طرح برقرار رہے گی جب تک کہ وہ خدا کے ..ے کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے یا اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب، اس دن وہ جان لیں گے کہ کس شخص کی حیثیت بدتر اور کس کا ..لشکر زیادہ کمزور و ناتوان ہے"۔

بہر حال آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ دشمنانِ اسلام اپنے افراد کی قدرت اور کثرت پر ناز کیا کرتے تھے اور انھیں ضعیف و ناتواں ..شمار کرتے تھے، قرآن اس ذریعہ سے مومنین کو تسلی دیتے ہوئے اور ان کی دلداری کرتے ہوئے انھیں خوشخبری دیتا ہے کہ آخر کار ان کی کامیابی اور ..دشمنوں کی شکست و ناتوانی کا دن آپہنچے گا۔

---

[1] "حتّٰی" عام طور پر کسی چیز کی غایت اور نیابت کے لیے آتا ہے اور یہاں اس کے لیے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں پہلا یہ کہ یہ ایک محذوف جملہ کی نیابت ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے "ولا یزالون یستھزءون و یستضعفون المؤمنین حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون"، اور دوسری یہ کہ "یکونون علیہ لبدًا" کی غایت ہو، جو پہلے کی چند آیات میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

چند نکات

۱۔ خدائی رہبروں کی صداقت

خدائی رہبروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ "شیطانی رہبروں" کے برخلاف ہرگز لمبے چوڑے وعدے نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے اور متکبر و مغرور نہیں ہوتے۔

جبکہ فرعون انا ربکم الاعلٰی "میں تمھارا اعلیٰ اور بلند تر خدا ہوں" وھٰذہ الانھار تجری من تحتی: "اور دریا کی بڑی بڑی شاخیں سب میری نظروں کے سامنے جاری ہیں"۔ کی احمقانہ فریاد بلند کرتا تھا، اور رہبران الٰہی، تواضع اور فروتنی سے، اپنے آپ کو خدا کے بندوں میں سے ایک چھوٹا سا بندہ بتلاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ وہ اس کے ارادہ کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

سورۂ کہف کی آیہ ۱۱۰ میں آیا ہے: قل انما انا بشر مثلکم یوحٰی الیّ: کہہ دیجیے میں تو تم جیسا ہی ایک بشر ہوں، سوائے اس کے کہ میری طرف وحی ہوتی ہے۔

اور دوسری جگہ آیا ہے: وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الّا ما یوحٰی الیّ وما انا الّا نذیر مبین: "میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے اور میں ایک واضح ڈرانے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں"۔ (احقاف ——— ۹)

ایک اور دوسری آیت میں یہ آیا ہے: قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک: "کہہ دیجیے میں یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں میں تو غیب کا علم بھی نہیں رکھتا (سوائے اس کے جس کی خدا تعلیم دیتا ہے) اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں"۔ (انعام ——— ۵۰)

اگر وہ مادی قدرت کی انتہائی بلندی پر بھی پہنچ جاتے تو بھی ہرگز آپے سے باہر نہ ہوتے اور سلیمان کی طرح کہتے: ھٰذا من فضل ربّی: "یہ قدرت و شوکت میرے پروردگار کا فضل ہے"۔ (نمل ——— ۴۰)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد آیات میں سخت قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں، جن میں پیغمبر کی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں عتاب کرتا ہے، اور اس بات کی تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کا خیال رکھیں۔

یہ آیت اور گزشتہ آیات کا مجموعہ جن کی تعداد قرآن میں کم نہیں ہے، اس پیغمبر کی حقانیت پر ایک زندہ سند ہے۔ ورنہ اس میں کونسی رکاوٹ تھی کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جو آپ کے لیے ہر قسم کے مقام اور منزلت کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، اپنے لیے بڑے سے بڑے مقام کا دعویٰ کرتے، جو فکر بشر کی دسترس سے بھی بالاتر ہوتا اور ہر قسم کے چون وچرا سے دور بھی۔ جیسا کہ تاریخ نے شیطانی رہبروں کے بارے میں اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔

ہاں! زیر بحث آیات اور ان ہی جیسی آیات کی تعبیریں رسول اللہ کی دعوت کی حقانیت کے زندہ شواہد ہیں۔

۲۔ جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں، جمعیت کا ایمان اہم ہے۔

قرآنی آیات میں یہ مطلب بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ ہر زمانے کے طاغوت اپنی جمعیت اور افرادی قوت کی دوسروں پر زیادتی پر فخر کرتے تھے اور انبیاء کے مقابلے میں اتراتے تھے۔

فرعون موسیٰؑ کے طرف داروں کی تحقیر کے لیے کہتا تھا: "ان هؤلاء لشرذمة قليلون"، "یہ بہت ہی تھوڑے سے آدمی ہیں"۔ (شعراء — ۵۴)

اور مشرکینِ عرب یہ کہا کرتے تھے، "نحن اكثر اموالاً و اولاداً و ما نحن بمعذبين": "ہم بہت مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا" (سبا — ۲۵)

اور کبھی ایک بے ایمان آدمی ایک مومن آدمی کے مقابلہ میں اپنی ثروت اور افرادی قوت پر فخر کرتے ہوئے کہتا: انا اكثر منك مالاً و اعز نفراً: "میرے پاس تجھ سے زیادہ دولت و ثروت اور زیادہ قوی افراد ہیں" (کہف — ۲۴) لیکن اس کے مقابلہ میں، افراد مومن، انبیاء اور خدائی رہبروں کی پیروی میں، جمعیت کی زیادتی اور افرادی قوت پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی منطق یہ تھی: كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله: "کتنے ہی چھوٹے گروہ ایسے ہوئے ہیں جو خدا کے حکم سے بڑے بڑے گروہوں پر کامیاب ہوئے ہیں" (بقرہ — ۲۴۹)

امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں:

ایها الناس لا تستوحشوا فی طریق الهدی لقلة اهله

اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے ہرگز وحشت نہ کرو[1]

تاریخ انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلام کی تاریخ زندگی، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور بکثرت جمعیتیں، ہر قسم کی قدرت رکھنے کے باوجود، مومنین کے تھوڑے سے یاور و انصار کے مقابلہ میں کس طرح سے شکست اور درماندگی کا شکار ہوئے۔ قرآن مجید میں "بنی اسرائیل" و "فرعون" اور "طالوت" و "جالوت" کی داستان میں اور "جنگ بدر" و "احزاب" سے مربوط آیات میں بھی یہ معنی اچھی طرح منعکس ہوئے ہیں۔

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۰۱

۲۵۔ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۝

۲۶۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝

۲۷۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝

۲۸۔ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝

ترجمہ

۲۵۔ کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے، یا میرا پروردگار اس کے لیے کوئی وقت قرار دے گا۔

۲۶۔ عالم الغیب وہی ہے اور وہ کسی شخص کو بھی اپنے غیب کے اسرار پر آگاہ نہیں کرتا۔

۲۷۔ مگر ان رسولوں کو، جنھیں اس نے منتخب کر لیا ہے، اور وہ ان کے لیے، ان کے آگے بھی اور پیچھے بھی نگران مقرر کر دیتا ہے۔

۲۸۔ تاکہ وہ جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر احاطہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کا حساب کر رکھا ہے۔

تفسیر

عالم الغیب خدا ہے

چونکہ گزشتہ آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ اس گروہ کا استہزاء اور سرکشی اسی طرح سے جاری رہے گی، جب تک کہ

عذاب کا خدائی وعدہ نہیں آپہنچتا اور اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا ؟ جیسا کہ مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں بیان کیا ہے ، کہ بعض مشرکین نے " نضر بن حارث " کے مانند ، گزشتہ آیات کے نزول کے بعد اسی سوال کو پیش کیا تھا ، قرآنِ مجید اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے ۔

" کہہ دیجیے ! میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (دنیا کا عذاب اور قیام قیامت) قریب ہے یا میرا پروردگار اس کے لیے کوئی زمانہ قرار دے گا " (قل ان ادری اقریب ما توعدون ام یجعل له ربی امدا) ۔

یہ علم خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے ، اور اس نے یہ چاہا ہے کہ یہ اس کے بندوں سے پوشیدہ رہے ، تاکہ مخلوق کے امتحان اور آزمائش کا موضوع مکمل ہو ، کیونکہ اگر وہ یہ جان لیں کہ وہ دور ہے یا نزدیک ہے تو دونوں صورتوں میں امتحان کا اثر کم ہو جائے گا ۔

" امد " (بروزن صمد) زمانہ کے معنی میں ہے ، اس فرق کے ساتھ کہ " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق کہ " زمان " تو ابتداء اور انتہاء دونوں کو شامل ہوتا ہے ، لیکن " امد " صرف کسی چیز کی انتہاء کے زمانہ کو کہتے ہیں ۔

اہلِ لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ " امد " اور " ابد " معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں ۔ اس فرق کے ساتھ کہ " ابد " تو غیر محدود مدت کو بھی شامل ہوتا ہے جبکہ " امد " صرف محدود مدت چاہے وہ جتنی بھی طولانی ہو ۔

بہر حال ، قرآن مجید کی آیات میں بارہا یہ مطلب ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب بھی قیامت کے زمانہ کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو پیغمبر اکرمؐ اس سے بے اطلاع ہونے کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ " اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے "۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن " جبرئیل " ایک بدو عرب کی صورت میں پیغمبرؐ کے سامنے ظاہر ہوئے ، اور ان سوالات میں سے جو انھوں نے آنحضرتؐ سے کیے ، ایک یہ تھا کہ :

اخبرنی عن الساعة

" بتلائیے قیامت کب برپا ہوگی " ؟

پیغمبرؐ نے فرمایا :

ما المسئول عنها باعلم من السائل

" جس سے سوال کر رہے ہو وہ (اس مسئلہ میں) سوال کرنے والے سے زیادہ آگاہ نہیں ہے "۔

اس مردِ عرب نے دوبارہ بلند آواز میں کہا :

یا محمدؐ متی الساعة ؟

" اے محمدؐ ! قیامت کب آئے گی " ؟

پیغمبرؐ نے فرمایا :

ویحك انها کائنة فما اعددت لها ؟

" وائے ہو تجھ پر قیامت تو آکر رہے گی ، یہ تو بتا کہ تو نے اس کے لیے کون سی چیز تیار کر رکھی ہے "۔

اعرابی نے کہا :

" میں نے نماز روزہ تو کوئی زیادہ فراہم نہیں کیا لیکن خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں "۔

پیغمبرؐ نے فرمایا :

فانت مع من احببت

"پس تو اس کے ساتھ رہے گا جسے تو دوست رکھتا ہے"۔

اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک صحابی " انس " کہتے ہیں :

فما فرح المسلمون بشیء فرحھم بھذا الحدیث

"مسلمان کسی حدیث پر اتنا خوش نہیں ہوئے ، جتنا کہ اس حدیث پر خوش ہوئے"[1]

اس کے بعد بحث کو جاری رکھتے ہوئے ، علم غیب کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے : " عالم الغیب [illegible] ہے وہ کسی کو بھی اپنے غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں کرتا " (عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدًا)[2]

اس کے بعد اس کلی مسئلہ سے استثناء کے عنوان سے مزید کہتا ہے : " مگر وہ رسول کہ جسے اس نے برگزیدہ کیا ہے اور اس سے وہ راضی ہے "۔ (الّا من ارتضٰی من رسول)۔

وہ اسے جتنا چاہتا ہے علم غیب کی تعلیم دیتا ہے اور وحی کے ذریعہ اس تک پہنچاتا ہے ۔

" پھر اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے نگہبان بھیجتا ہے "۔ (فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصدًا)۔

" رصد ، اصل میں " مصدری " معنی رکھتا ہے اور کسی چیز کی نگرانی اور نگہبانی کے لیے آمادگی کے معنی میں ہے اور " اسم فاعل " اور " مفعول " پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ مفرد وجمع دونوں استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی ایک نگرانی کرنے والا اور نگہبان فرد ، یا نگرانی کرنے والے اور نگہبانوں کی ایک جماعت ، دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنھیں خدا نزول وحی کے بعد حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے پیغمبر کا ہر طرف سے احاطہ کیے رہیں ۔ اور شیاطین ، جن وانس اور ان کے وسوسوں سے ، اور ان چیزوں سے ، جو وحی کی اصالت کو خدشہ دار کرتی ہیں ، محافظت اور پاسداری کریں ، تاکہ اللہ کا پیغام کمی وزیادتی اور کسی معمولی سے معمولی خدشہ کے بغیر بندوں تک پہنچ جائے ۔ اور یہ بات خود پیغمبر کے معصوم ہونے کی ایک دلیل ہے کہ وہ غیبی قوتوں اور خدائی امدادوں اور اس کے فرشتوں کی نگرانی کے ذریعہ لغزشوں اور خطاؤں سے

---

[1] تفسیر " مراغی " جلد ۲۹ ص ۱۰۵

[2] " عالم الغیب " ایک مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر " ھو العالم الغیب " ہے اور بعض نے اسے " ربّی " کی صفت یا بدل قرار دیا ہے ، جو گزشتہ آیت میں ہے ۔

مامون و محفوظ ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں جو اس سورہ کی آخری آیت ہے، ان نگرانی کرنے والے نگہبانوں کے وجود کی دلیل کو اس طرح بیان کرتا ہے
"مقصد یہ ہے کہ خدا جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات بے کم و کاست پہنچا دیئے ہیں، اور جو کچھ ان کے پاس ہے، خدا اس پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس نے ہر ایک چیز کا باریکی کے ساتھ شمار کیا ہے" (لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بمالدیھم واحصٰی کل شیء عددًا)۔[1]

یہاں "علم" سے مراد علم فعلی ہے اور دوسرے لفظوں میں آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے بارے میں کسی چیز کو نہیں جانتا تھا اور بعد میں اس نے جانا ہے۔ کیونکہ خدا کا علم ازلی و ابدی اور بے پایاں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ علم الٰہی خارج میں تحقق پائے اور عینی صورت اختیار کرے۔ یعنی پیغمبر اس کی رسالت کی عملی طور پر تبلیغ کریں اور اتمام حجت کریں۔

چند نکات

علم غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق

قرآن کی مختلف آیات میں غور کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ علم غیب کے سلسلہ میں دو قسم کی آیات موجود ہیں، پہلی قسم کی آیات تو وہ ہیں جو علم غیب کو خدا کے ساتھ مخصوص بتاتی ہیں، اور اس کے غیر سے اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۵۹، وعندہ مفاتح الغیب لایعلمھا الّا ھو، غیب کی چابیاں خدا ہی کے پاس ہیں، اس کے سوا کوئی شخص انھیں نہیں جانتا اور سورۂ نمل کی آیہ ۶۵ قل لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الّا اللہ، کہہ دیجیے کہ آسمانوں اور زمین میں سے کوئی شخص بھی غیب کو نہیں جانتا، سوائے خدا کے۔

اور پیغمبرؐ کے بارے میں سورۂ انعام کی آیہ ۵۰ میں جو کچھ آیا ہے، مثلاً قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب؛ کہہ دیجیے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں، اور میں غیب کو نہیں جانتا۔

اور سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ میں آیا ہے: ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر: "اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو میں بہت سی خیر فراہم کر لیتا۔" اور آخر میں سورۂ یونس کی آیہ ۲۰ میں یہ آیا ہے: فقل انما الغیب للہ

---

[1] بہت سے مفسرین نے "لیعلم" کی ضمیر کو پیغمبر اسلامؐ کی طرف لوٹایا ہے اور انھوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا اسرار وحی و رسالت کے لیے محافظ اور نگہبان قرار دیتا ہے، تاکہ پیغمبرؐ جان لے کہ انھوں نے دقت کے ساتھ، وحی الٰہی کو اس کے پاس پہنچا دیا ہے اور کسی قسم کا شک اور تردد وحی الٰہی کی اصالت میں نہ کرے لیکن یہ تفسیر۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ رسالت تو پیغمبر کا کام ہے، نہ کہ فرشتوں کا، اور "رسول" کی تعبیر گزشتہ آیت میں اور "رسالات" کی تعبیر چند گزشتہ آیات میں، خود پیغمبرؐ کی ذات کے بارے میں آئی ہے۔ بعید نظر آتی ہے، اور حق وہی پہلی تفسیر ہے۔

"کہہ دیجیے کہ غیب تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے"۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات ۔

دوسرا حصہ ان آیات کا ہے جو وضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اولیاءِ خدا "اجمالی طور پر" علم غیب سے آگاہی رکھتے تھے، جیسا کہ آلِ عمران کی آیہ ۱۷۹ میں آیا ہے: وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء خدا تم کو تو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرے گا لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کے لیے) منتخب کرلیتا ہے (اور اسرارِ غیب کا) ایک حصہ انھیں عطا کردیتا ہے)۔

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معجزات میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا: وانبئکم بما تأکلون وما تدخرون فی بیوتکم؛ "میں تمھیں اس کی جو تم کھاتے ہو یا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، خبر دیتا ہوں"۔
(آلِ عمران ـــــ ۴۹)

زیرِ بحث آیت بھی، اس استثناء کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو اس میں آیا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا علم غیب کا ایک حصہ اپنے برگزیدہ رسولوں کو عطا فرماتا ہے (کیونکہ نفی سے استثناء ہمیشہ اثبات ہوتا ہے)۔

دوسری طرف قرآن کی وہ آیات جو غیب کی خبروں پر مشتمل ہیں، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ روم کی دوسری آیت سے لے کر چوتھی تک غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین: "رومی مغلوب ہوگئے ہیں، اور یہ شکست نزدیک کی سرزمین میں واقع ہوئی ہے، لیکن وہ اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب ہوں گے، چند ہی سالوں کے اندر اندر"۔ اور سورۂ قصص کی آیت ۸۵ جو کہتی ہے: ان الذی فرض علیک القراٰن لرادک الی معاد؛ "وہ ہستی جس نے قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے، وہ تجھے تیری جگہ (مکہ) کی طرف دوبارہ پلٹائے گا"۔

اور سورۂ فتح کی آیہ ۲۷ جو کہتی ہے: لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ اٰمنین؛ "انشاء اللہ تم مسجد الحرام میں انتہائی امن وامان کے ساتھ، داخل ہوگے"۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات ۔

اصولی طور پر آسمانی وحی جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے، ایک قسم کا غیب ہی ہے جو انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیب سے آگاہی نہیں رکھتے جبکہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے۔

ان سب باتوں سے قطعِ نظر ہمارے پاس بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر غیب کا علم رکھتے تھے اور بعض اوقات اس کی خبر دیا کرتے تھے۔ مثلاً فتح مکہ کی داستان اور "حاطب بن ابی بلتعہ" کے واقعہ میں جس میں مکہ کے لوگوں کو خط لکھا تھا اور وہ خط مشرکینِ مکہ کے پاس پہنچانے کے لیے "سارہ" نامی عورت کے حوالے کیا گیا تھا، تاکہ وہ انھیں لشکرِ اسلام کے قریب الوقوع حملہ سے آگاہ کردے۔ اور وہ عورت اس خط کو اپنے گیسوؤں کے درمیان چھپا کر مکہ کی طرف چل پڑی تھی۔ پیغمبرؐ نے علیؑ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو اس کے پیچھے بھیجا، اور فرمایا: تمھیں ایک منزل گاہ پر جس کا نام روضۂ "خاخ" ہے ایک عورت ملے گی اس کے پاس "حاطب" کا خط ہے، جو مشرکین مکہ کے نام ہے، تم اس سے وہ خط لے لو، جب وہ سب کے سب وہاں پہنچے تو انھیں وہ

...رت مل گئی، شروع میں اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا، لیکن آخرکار اس نے اعتراف کر لیا اور انھوں نے وہ خط اس سے لے لیا[1]

اس کے علاوہ جنگِ "موتہ" کا واقعہ اور جعفر اور لشکرِ اسلام کے بعض دوسرے کمانداروں کی شہادت کی خبر دینا۔ جبکہ پیغمبرؐ نے، مدینہ میں مسلمانوں ... اسی لمحہ میں، جبکہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا، خبر دی تھی[2] اور اس قسم کے اخبارِ غیب کی مثالیں پیغمبرؐ کی زندگی میں کم نہیں ہیں۔

نہج البلاغہ میں بھی آئندہ کے واقعات کی بہت سی پیشین گوئیاں نظر آتی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ علیؑ ان اسرارِ غیب کو جانتے تھے۔ مثلاً وہ باتیں جو خطبہ ۱۲ میں اہلِ بصرہ کی مذمت میں بیان ہوئی ہیں۔ جس میں آپ فرماتے ہیں:

كانى بمسجدكم كجؤجؤ سفينة قد بعث الله عليها العذاب من فوقها ومن تحتها وغرق من فى ضمنها

"گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان وزمین سے خدا کا عذاب تم پر نازل ہو رہا ہے اور تم سب کے سب اس میں غرق ہو گئے ہو، صرف تمھاری مسجد کی چوٹی کشتی کے سینہ کی طرح پانی کے اوپر نمایاں ہے۔"

اور دوسری روایات میں بھی جو علمائے اہل سنت اور شیعہ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، آیندہ کے واقعات کے بارے میں آنحضرتؐ سے بہت سی پیشین گوئیاں آئی ہیں، جیساکہ "حجر بن قیس" کے بارے میں ہے کہ آپ نے فرمایا: تجھے میرے بعد لعنت کرنے پر مجبور کریں گے[2]

اور جو کچھ آپ نے "مروان" کے بارے میں فرمایا کہ وہ بڑھاپے کے بعد ضلالت وگمراہی کا پرچم کندھے پر اٹھائے گا[3]

اور جو کچھ "کمیل بن زیاد" نے حجاج سے کہا تھا کہ امیر المومنین علیؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ تو میرا قاتل ہے[4]

اور جو کچھ آپ نے خوارج نہروان کے بارے میں فرمایا تھا، کہ ان سے جنگ میں ہمارے گروہ کے دس آدمی بھی نہیں مارے جائیں گے، اور ان میں سے دس آدمی بھی نجات نہیں پائیں گے اور حقیقتاً اسی طرح واقع ہوا[5]

اور جو کچھ امام حسینؑ کی قبر کی جگہ کے بارے میں سرزمینِ کربلا کے قریب سے عبور کے وقت "اصبغ بن نباتہ" سے فرمایا[6]

کتاب فضائل الخمسہ میں، اہل سنت کی کتابوں سے، علیؑ کے علم کی حد سے زیادہ وسعت کے بارے میں، بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، ان سب کا یہاں بیان طول کا باعث ہوگا[8]

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل حوالہ کے ساتھ اسی جلد میں سورۂ ممتحنہ کی تفسیر میں ہے۔

[2] "کامل ابن اثیر" جلد ۲ ص ۲۳۷ (واقعہ غزوۂ موتہ)

[3] مستدرک الصحیحین جلد ۲ ص ۳۵۸

[4] طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۳۰

[5] الاصابہ ابن حجر، جلد ۵ قسم ۳ ص ۲۲۵

[6] "ہیثمی" نے "مجمع" جلد ۶ ص ۲۴۱ پر

[7] "الریاض النظرۃ" جلد ۲ ص ۲۲۲

[8] "فضائل الخمسہ" جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۵۳

اہلِ بیت کی روایات میں بھی متعدد حدیثوں میں آئمہ معصومین کے لیے علمِ غیب کا اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے کتاب کافی جلد اوّل کے متعدد ابواب میں اس بارے میں تصریح یا اشارے نظر آتے ہیں۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۲۶ میں، اس سلسلہ میں بہت سی احادیث جو ۲۲ حدیثوں تک پہنچتی ہیں نقل کی ہیں۔

مجموعی طور پر پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین کے لیے اسرارِ غیب سے آگاہی کے سلسلہ میں روایات حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ ان روایات و آیات کے درمیان، جن میں سے بعض غیر خدا سے علمِ غیب کی نفی کرتی ہیں اور بعض اثبات کرتی ہیں کس طرح جمع کی جائے؟

یہاں جمع کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں۔

جمع کے طریقوں میں سے مشہور ترین طریقہ یہ ہے کہ علمِ غیب کے خدا کے ساتھ اختصاص سے مراد علمِ ذاتی و استقلالی ہے۔ اس بناء پر اس کا غیر مستقل طور پر ہرگز علمِ غیب سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا، اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کے الطاف و عنایات سے ہے اور تبعی جنبہ رکھتا ہے۔

اس جمع کا شاہد یہی زیرِ بحث آیت ہے، جو کہتی ہے: خدا کسی کو بھی اپنے اسرارِ غیب سے آگاہ نہیں کرتا، مگر وہ رسول جس سے وہ راضی ہے۔

"نہج البلاغہ" میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جب علیؑ آیندہ کے واقعات کی خبر دے رہے تھے (اور اسلامی ممالک پر مغلوں کے حملہ کی پیشین گوئی کر رہے تھے) اور آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: اے امیر المومنین کیا آپ علمِ غیب جانتے ہیں؟ حضرت ہنسے اور فرمایا:

لیس ھو بعلم غیب، و انما ھو تعلم من ذی علم

"یہ علمِ غیب نہیں ہے، یہ ایک ایسا علم ہے جو صاحبِ علم (پیغمبرؐ) سے میں نے حاصل کیا ہے"[1]

اس جمع کو بہت سے علماء و محققین نے قبول کیا ہے۔

۲۔ اسرارِ غیب دو قسم کے ہیں، ایک قسم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً قیامِ قیامت اور اسی قسم کے دوسرے امور، اور ایک قسم وہ ہے کہ جس کی وہ انبیاء و اولیاء کو تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ نہج البلاغہ میں اسی خطبہ کے ذیل میں جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے، آیا ہے کہ:

وانما علم الغیب علم الساعۃ و ما عددہ اللہ سبحانہ بقولہ: ان اللہ عندہ علم الساعۃ، و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام، و ما تدری نفس ماذا تکسب غدا و ما تدری نفس بای ارض تموت

"علمِ غیب تو صرف قیامت کا علم ہے اور وہ ہے جسے خدا نے اس آیت میں شمار کیا ہے، جیسا کہ فرماتا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

ہے؛ قیامت کے وقت سے آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہی بارش کو نازل کرتا ہے، اور جو کچھ ماؤں کے رحم میں ہے، اسے جانتا ہے اور کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا، اور کس سرزمین میں مرے گا۔"

اس کے بعد امام نے اس معنی کی تشریح میں مزید فرمایا:

"خداوند اس سے جو رحموں میں برقرار ہے، آگاہ ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی، بدصورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل، سعادت مند ہے یا شقی و بدبخت، اہلِ دوزخ ہے یا اہلِ جنت؟ .... یہ سب علوم غیب ہیں، جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور ان کے علاوہ وہ علوم ہیں جن کی خدا نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دی ہے اور انھوں نے ان کی مجھے تعلیم دی ہے"[1]

۲۔ ان دونوں قسم کی آیات وروایات کے درمیان جمع کرنے کا ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ اسرارِ غیب دو جگہ ثبت ہیں "لوحِ محفوظ" (علمِ خدا کے مخصوص خزانہ) میں، جس میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر رونما نہیں ہوتا، اور اس سے کوئی بھی شخص آگاہ نہیں ہے اور (لوحِ محو و اثبات) جو مقتضیات کا علم ہے نہ کہ علّت تامہ کا، اور اسی بنا پر وہ تغیر اور تبدیلی کے قابل ہے اور جسے دوسرے نہیں جانتے وہ اسی حصّہ سے مربوط ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان اللہ علمًا لم یعلمہ الا ھو، وعلمًا اعلمہ ملائکتہ ورسلہ فما اعلمہ ملائکتہ وانبیاءہ ورسلہ فنحن نعلمہ

"خدا کا ایک علم تو ایسا ہے جسے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور ایک علم ایسا ہے، جس سے اس نے فرشتوں اور انبیاء کو آگاہ کیا ہے، جو کچھ اس نے فرشتوں، انبیاء اور رسولوں کو دیا ہے، اسے ہم بھی جانتے ہیں"[2]

امام علیؑ بن الحسینؑ سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لولا اٰیۃ فی کتاب اللہ لحدثتکم بما کان وما یکون الیٰ یوم القیامۃ! فقلت لہ ایۃ اٰیۃ؟ فقال قول اللہ: یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب

"اگر قرآنِ مجید میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تمھیں اس سے بھی جو کہ پہلے گزر چکا ہے، اور ان واقعات کی بھی جو قیامت تک ہونے والے ہیں خبر دے دیتا، راوی کہتا ہے، میں نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

[2] بحار الانوار جلد ۲۶ ص ۱۶۰ (حدیث ۵) اس سلسلہ میں دوسری متعدد روایات بھی اس ماخذ میں نقل ہوئی ہیں۔

فرمایا: خدا فرماتا ہے: یمحوا اللہ ما یشاء (خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے)، ام الکتاب (اور لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے"۔ [1]

اس جمع کے مطابق علوم کی تقسیم ان کے حتمی و یقینی ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر ہے، اور گزشتہ جمع میں معلومات کی مقدار پر ہے۔ (غور کیجیے)

۴۔ ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ خدا تو تمام اسرار غیب سے بالفعل آگاہ ہے، لیکن انبیاء و اولیاء ممکن ہے بہت سے اسرار کو بالفعل نہ جانتے ہوں، لیکن جب وہ ارادہ کرتے ہیں تو خدا انھیں ان کی تعلیم دے دیتا ہے، اور یقیناً یہ ارادہ بھی خدا کے اذن و رضا ہی انجام پاتا ہے۔

اس بناء پر ان آیات و روایات میں جمع، جو یہ بتلاتی ہیں کہ وہ نہیں جانتے، تو وہ بالفعل نہ جاننے کی طرف اشارہ ہے، اور جو یہ کہتی ہیں کہ وہ جانتے ہیں وہ ان کے جاننے کے امکان کی طرف اشارہ ہے

اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک خط کسی آدمی کو دے کہ وہ اسے دوسرے تک پہنچا دے، تو یہاں یہ کہا جاسکتا ہے اسے خط کے مضمون کا کوئی علم نہیں ہے۔ حالانکہ وہ خط کو کھول کر پڑھ سکتا ہے۔ کبھی تو صاحب خط نے اسے مطالعہ کی اجازت دی ہوئی ہوتی ہے۔ اس صورت میں اسے ایک لحاظ سے خط کے مضمون کا عالم سمجھا جا سکتا ہے اور کبھی اسے اجازت دی ہوئی نہیں ہوتی۔

اس جمع کی شاہد وہ روایات ہیں جو کتاب کافی کے ایک باب میں ان الائمة اذا شاءوا ان یعلموا علموا:
"آئمہ جب کسی چیز کو جاننا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا علم دے دیا جاتا ہے" کے عنوان کے تحت وارد ہوئی ہیں۔ [2]

منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

اذا اراد الامام ان یعلم شیئا اعلمه الله بذالك

"جب امام کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اسے اس کی تعلیم دے دیتا ہے"۔

جمع کی یہ وجہ، پیغمبرؐ اور امام کے علم کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کو حل کر دیتی ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ اس پانی اور کھانے کو جس میں زہر ملا ہوا ہوتا ہے، کس طرح کھا لیتے ہیں، حالانکہ یہ بات جائز نہیں ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لیے خطرے کا موجب ہو، ایسے مواقع کے لیے یہ کہنا پڑے گا کہ پیغمبر یا امام کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کا ارادہ کریں کہ اسرار غیب ان پر آشکار ہوں

اسی طرح بعض اوقات مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر یا امام کسی مطلب پر آگاہ نہ ہوں، یا کوئی امتحان اور آزمائش ایسی صورت پذیر ہو جو ان کے تکامل و ارتقاء کا موجب بنے، جیسا کہ "لیلة المبیت" کی داستان میں آیا ہے کہ علیؑ پیغمبرؐ کے بستر پر سوئے، حالانکہ خود آنجناب سے نقل ہوا ہے کہ آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ صبح کے وقت جب مشرکین قریش اس بستر پر حملہ کریں گے تو شہید ہو جائیں گے یا جان سلامت رہے گی۔ یہاں مصلحت یہ ہے کہ امام اس کام کے انجام سے آگاہ نہ ہو، تاکہ خدائی آزمائش اور امتحان پورا ہو جائے اور اگر امام جانتے کہ وہ پیغمبر کے

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۱۲ (حدیث ۱۶۰)

[2] "کتاب کافی" باب ان الائمة اذا شاءوا ان یعلموا علموا (حدیث ۲) اسی مضمون کی دوسری روایات بھی اسی باب میں نقل ہوئی ہیں۔

بستر پر سوئیں گے اور صبح کو صحیح و سالم اٹھیں گے، تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں تھی اور آیاتِ قرآنی اور دیگر روایات میں اس ایثار و قربانی کی اہمیت کے سلسلہ میں جو کچھ وارد ہوا ہے کچھ زیادہ قابلِ توجہ نظر نہیں آتا۔

ہاں علم ارادی کا مسئلہ، اس قسم کے تمام اشکالات و اعتراضات کا جواب ہے۔

۵۔ علم غیب کے سلسلہ میں مختلف روایات کے لیے جمع کی ایک اور صورت بھی موجود ہے (اگرچہ یہ راہ ان روایات کے ایک حصہ پر بھی صادق آتی ہے) اور وہ یہ ہے کہ ان روایات میں مخاطب مختلف تھے، وہ لوگ جو آئمہ کے بارے میں علم غیب کے مسئلہ کی قبولیت کی استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں، انھیں تو حق مطلب بیان کر دیا جاتا تھا لیکن مخالف یا ضعیف و کم استعداد افراد کے لیے، سننے والے کی سمجھ کے مطابق بات کی جاتی ہے۔

مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ ابو بصیر اور امام صادقؑ کے بزرگ اصحاب میں سے کچھ اور افراد ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امام غصہ میں بھرے ہوئے مجلس میں وارد ہوئے، جب آپ بیٹھ گئے تو حاضرینِ مجلس سے فرمایا:

> یا عجبا لاقوام یزعمون انا نعلم الغیب! ما یعلم الغیب الا اللہ عزوجل، لقد هممت بضرب جاریتی فلانۃ، فھربت منی فما علمت فی ای بیوت الدار ھی
>
> "تعجب ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم علمِ غیب جانتے ہیں (حالانکہ) خدا کے سوا کوئی بھی علم غیب نہیں جانتا۔ میں اپنی ایک کنیز کو تادیب کرنا چاہتا تھا، وہ میرے آگے سے بھاگ گئی اور مجھے یہ علم نہ ہوا کہ وہ گھر کے کس کمرے میں ہے۔"[۱]

حدیث کا راوی کہتا ہے کہ جس وقت امام اس مجلس سے اٹھے، تو میں اور کچھ دوسرے اصحاب آپ کی منزل میں داخل ہوئے اور ہم نے کہا: ہم آپ پر قربان ہوں، آپ نے اپنی کنیز کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت سے علوم ہیں، اور ہم علمِ غیب کا تو کوئی نام نہیں لیتے؟

امام نے اس کے بعد اس سلسلہ میں تشریح کی جس کا مفہوم اسرارِ غیب پر آپ کی آگاہی تھا۔

واضح رہے کہ اس مجلس میں کچھ ایسے افراد تھے، جو ان معانی کے ادراک اور مقامِ امام کی معرفت کے لیے ضروری استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ان پانچوں طریقوں میں آپس میں کوئی منافات نہیں ہے اور سب ہی صادق ہو سکتے ہیں۔ (غور کیجیے)

۲۔ ائمہ کے علمِ غیب کو ثابت کرنے کی ایک اور راہ

یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ پیغمبرؐ اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر اسرارِ غیب سے آگاہ تھے دوؑ اور راستے بھی موجود ہیں:

---

[۱] اصول کافی جلد ۱ باب نادر فیہ ذکر الغیب حدیث ۲

بہرحال یہ کہ ان کی ماموریت کسی خاص مکان و زمان میں محدود نہیں تھی، بلکہ پیغمبر کی رسالت اور آئمہ کی امامت جہانی اور جاودانی ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی وسیع ماموریت اور ذمہ داری رکھتا ہو، اور وہ اپنے محدود زمانہ اور ماحول کے سوا کسی قسم کی آگاہی نہ رکھتا ہو؟ کیا وہ شخص، جو مثلاً کسی ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کی امارت اور گورنری پر مامور ہو، اس علاقہ سے بے خبر ہو سکتا ہے اور پھر یوں اپنی ماموریت کو اچھی طرح انجام دے سکتا ہے؟

دوسرے الفاظ میں: پیغمبرؐ اور امامؑ کو اپنی مدتِ حیات میں، احکامِ الٰہی کو اس طرح بیان و اجراء کرنا چاہیے کہ وہ ہر زمانہ اور مکان کے تمام انسانوں کی ضروریات کے لیے جواب دہ ہوں اور یہ ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسرارِ غیب کے ایک حصّہ کو جانتے ہوں۔

دوسرا یہ کہ: قرآن مجید میں تین آیات ایسی ہیں کہ اگر ہم انھیں ایک دوسری کے ساتھ رکھ دیں تو اس سے پیغمبرؐ اور آئمہ کے علم کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔ پہلی یہ کہ قرآن اس شخص کے بارے میں جو "ملکہ سبا" کا تخت آنکھ جھپکنے میں سلیمان کے پاس لے آیا (یعنی آصف بن برخیا) کہتا ہے:

قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اٰتیك بہ قبل ان یرتد الیك طرفك فلما راٰہ مستقرًا عندہ قال ھٰذا من فضل ربی

"اُس شخص نے، جو کتاب میں سے کچھ علم رکھتا تھا، کہا: میں اس کو آنکھ جھپکنے سے پہلے تیرے پاس لے آؤں گا، جب سلیمان نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے" (نمل ــــــ ۴۰)

دوسری آیت میں یہ آیا ہے:

قل کفٰی باللّٰہ شھیدًا بینی و بینکم ومن عندہ علم الکتاب

"کہہ دیجیے میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے خدا اور وہ شخص جس کے پاس علمِ کتاب ہے کافی ہے" (رعد ــــــ ۴۳)

دوسری طرف بہت سی احادیث میں، جو اہل سنت اور شیعہ کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، اس طرح آیا ہے کہ ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا سے "الذی عندہ علم من الکتاب" کے معنی پوچھے، تو آپ نے فرمایا: وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی تھا تو میں نے کہا "ومن عندہ علم الکتاب" کون ہے، تو آپ نے فرمایا:

ذاك اخی علی بن ابی طالب

"وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں"[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "علم من الکتاب" جو "آصف" کے بارے میں آیا ہے، علمِ جزئی کو بیان کرتا ہے، اور "علم الکتاب" جو علی کے بارے میں آیا ہے، وہ علمِ کلی کو بیان کرتا ہے، اس سے "آصف" اور علیؑ کے مقامِ علمی کے درمیان فرق واضح ہوجاتا ہے۔

---

[1] "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۲۸۰ - ۲۸۱، اور "نور الثقلین" جلد ۲ ص ۵۲۲ کی طرف رجوع کریں۔

تیسری طرف سورۂ نحل کی آیہ ۸۹ میں آیا ہے: ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شیء "ہم نے قرآن کو تجھ پر نازل
کیا ہے، جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے"۔
واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی کتاب کے اسرار کا عالم ہو اسے غیب کے اسرار کو جاننا چاہیے اور یہ اس چیز پر ایک واضح اور آشکار دلیل ہے
اولیاء خدا میں سے کوئی انسان حکم خدا سے اسرارِ غیب پر آگاہ ہو سکتا ہے۔
علم غیب کے سلسلہ میں ہم نے سورہ انعام کی آیہ ۵۰، ۵۹ جلد ۳ اور آیہ ۱۸۸ سورۂ اعراف جلد ۴
کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

۳۔ "جن" کی خلقت کے بارے میں تحقیق

"جن" جیسا کہ اس لفظ کے لغوی مفہوم سے معلوم ہوتا ہے ایک ایسا نظر نہ آنے والا موجود ہے جس کے بہت سے مشخصات قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ ایک ایسا وجود ہے جو آگ کے شعلہ سے پیدا ہوا ہے، انسان کے برخلاف جو مٹی سے پیدا ہوا ہے (وخلق الجانّ من مارج من نار) (الرحمٰن ــــ ۱۵)

۲۔ وہ علم و ادراک اور حق و باطل کی پہچان، اور منطق و استدلال کا حامل ہے (سورۂ جن کی مختلف آیات)

۳۔ وہ تکلیف و مسئولیت (فرائض و وظائف) رکھتا ہے، (سورۂ جن اور سورۂ رحمٰن کی آیات)

۴۔ ان میں سے ایک گروہ مومن و صالح اور ایک گروہ کافر ہے۔ (و انّا منا الصالحون و منا دون ذالك) (جن ــــ ۱۱)

۵۔ وہ حشر و نشر اور معاد و قیامت رکھتے ہیں (واما القاسطون فکانوا لجهنم حطبًا) (جن ــــ ۱۵)

۶۔ وہ آسمانوں میں نفوذ کرنے، اور وہاں سے خبریں لینے اور چوری چھپے سننے کی قدرت رکھتے تھے، لیکن پھر انھیں روک دیا گیا۔ (و انا کنّا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد له شهابًا رصدًا) (جن ــــ ۹)

۷۔ وہ بعض انسانوں کے ساتھ رابطہ پیدا کر لیا کرتے تھے، اور اس محدود آگاہی کے ذریعہ جو وہ بعض پوشیدہ اسرار کے بارے میں رکھتے تھے، انسانوں کو گمراہ کرتے تھے۔ (و انه کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقًا) (جن ــــ ۶)

۸۔ ان میں کچھ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں، جو بہت زیادہ طاقت رکھتے ہیں، جیسا کہ انسانوں میں بھی ایسے افراد ہیں (قال عفریت من الجن انا اٰتیك به قبل ان تقوم من مقامك) ایک سرکش جن نے سلیمان سے کہا: "میں ملکہ سباء کا تخت، اس سے پہلے کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے (دربار برخواست کرکے) اس کی سرزمین سے یہاں لے آؤں گا" (نمل ــــ ۲۹)

۹۔ وہ انسانوں کے بعض ضروری کاموں کے انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں (ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ ..... یعملون لہ مایشاء من محاریب و تماثیل و جفان کالجواب) "جنات کا گروہ خدا کے حکم سے سلیمان کے سامنے کام کیا کرتا تھا اور اس کے لیے ...... عبادت خانے، تصویریں اور بڑے بڑے برتن تیار کرتا تھا" (سبا ـــــ ۱۲، ۱۳)

۱۰۔ ان کی خلقت روئے زمین پر انسانوں کی خلقت سے پہلے تھی (والجان خلقناہ من قبل) (حجر ـــــ ۲۷) اور کچھ دوسری خصوصیات۔

اس کے علاوہ قرآنی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ عام لوگوں میں مشہور ہے اور وہ انھیں "ہم سے بہتر" سمجھتے ہیں اس کے برخلاف انسان ایک ایسی نوع ہے جو ان سے بہتر اور برتر ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام خدائی پیغمبر انسانوں میں سے انتخاب ہوئے، اور وہ پیغمبر اسلام پر جو نوع بشر میں سے تھے، ایمان لائے اور آپ کی تبعیت اور پیروی کی، اور اصولی طور پر شیطان پر آدم کے سامنے سجدہ کا واجب ہونا جو قرآن کی تصریح کے مطابق اس وقت گروہ جن (کے بزرگوں) میں سے تھا۔ (کہف ـــــ ۵۰) انسان کی جن پر فضیلت پر دلیل ہے۔

یہاں تک تو ان مطالب سے گفتگو تھی، جو قرآن مجید سے، اس نظر نہ آنے والے موجود کے بارے میں معلوم ہوتے ہیں، جو ہر قسم کے بے ہودگی اور غیر علمی مسائل سے خالی ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ عامۃ الناس نے بہت سی خرافات اس موجود کے بارے میں گھڑی ہوئی ہیں جو عقل و منطق کے ساتھ سازگار نہیں ہیں اور اسی بناء پر ایک خرافاتی اور غیر منطقی چہرہ اس موجود کو دیا گیا ہے کہ جونہی لفظ "جن" بولا جاتا ہے تو چند ایک خرافات بھی اس کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ انھیں عجیب و غریب اور وحشت ناک شکلوں اور دم دار، سم دار، و پر آزار، کینہ پرور و بدرفتار سمجھتے ہیں جو گرم پانی کے ایک برتن کو کسی خالی جگہ میں انڈیلنے سے گھروں کو آگ لگا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح کے دوسرے موہومات۔

حالانکہ اگر وجود جن کو ان خرافات سے الگ کیا جائے تو اصل مطلب مکمل طور پر قابلِ قبول ہے، کیونکہ زندہ موجودات کے صرف ان ہی چیزوں میں منحصر ہونے پر، جنھیں ہم دیکھتے ہیں، کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ علماء اور علوم طبیعی کے ماہرین کہتے ہیں کہ موجودات، جنھیں انسان اپنے حواس کے ساتھ درک کر سکتا ہے، ان موجودات کے مقابلہ میں، جو حواس کے ساتھ قابلِ ادراک نہیں ہیں کچھ بھی نہیں ہیں۔

ان آخری ایام تک جب تک کہ خوردبین سے زندہ موجودات کا انکشاف نہیں ہوا تھا، کوئی شخص یہ یقین نہیں کرتا تھا کہ پانی کے ایک قطرہ میں، یا خون کے ایک قطرہ میں ہزار ہا زندہ جاندار موجود ہیں۔ جن کو دیکھنے کی انسان میں قدرت نہیں ہے۔

نیز ماہرین کہتے ہیں: ہماری آنکھ نہ صرف محدود رنگوں کو ہی دیکھتی ہے، اور ہمارا کان محدود صوتی امواج کو ہی سنتا ہے، وہ رنگ اور آوازیں جو ہماری آنکھ اور کان سے قابلِ ادراک نہیں ہیں، ان سے بہت ہی زیادہ ہیں جو قابلِ ادراک ہیں۔

جب عالم کی وضع و کیفیت اس طرح کی ہو، تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے، کہ انواع و اقسام کے زندہ موجودات اس عالم میں موجود ہوں، جنھیں ہم اپنے حواس کے ساتھ درک نہ کر سکتے ہوں، اور جب پیغمبر اسلام جیسا مخبر صادق ان کے متعلق خبر دے، تو

اسے قبول کیوں نہ کریں ؟

بہر حال ایک طرف تو قرآن نے ، جو کلام ناطقِ صادق ہے ، جنات کے وجود کی ان خصوصیات کے ساتھ ، جو اوپر ذکر ہوئی ہیں ، خبر دی ہے ۔ اور دوسری طرف کوئی عقلی دلیل اس کی نفی پر موجود نہیں ہے ۔ لہٰذا اس کو قبول کر لینا چاہیے اور غلط و ناروا توجیہات سے بچنا چاہیے ، اور اسی طرح سے عوام کے خرافات سے اس سلسلہ میں اجتناب کرنا چاہیے ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ " جن " کبھی ایک زیادہ وسیع مفہوم پر بولا جاتا ہے ، جو نظر نہ آنے والے کئی موجودات کے انواع کو شامل ہے ۔ عام اس سے کہ وہ عقل وادراک کے حامل ہوں یا عقل وادراک نہ رکھتے ہوں ۔ یہاں تک کہ حیوانات کا وہ گروہ بھی ، جو آنکھ سے نظر آتا ہے اور عام طور پر گھونسلوں میں چھپا رہتا ہے ، اس وسیع معنی میں داخل ہے ۔

اس بات کی شاہد وہ روایت ہے جو پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے ، آپ نے فرمایا :

خلق الله الجن خمسة اصناف ، صنف كالريح فى الهواء ، و صنف حيات و صنف عقارب ، و صنف حشرات الارض ، و صنف كبنى أدم عليهم الحساب والعقاب

" خدا نے جنوں کو پانچ اقسام میں پیدا کیا ہے : ایک صنف تو ہوا کی طرح فضا میں ہے (جو نظر نہیں آتی) ، ایک صنف سانپوں کی صورت میں ہے ، ایک صنف بچھوؤں کی صورت میں ہے ، ایک صنف حشراتِ زمین ہیں اور ایک صنف ان میں سے انسان کی مانند ہے ، جس پر حساب و عتاب ہے [۱]

اس روایت اور اس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سی مشکلات ، جو روایات و حکایات میں ، جنات کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں ، حل ہو جائیں گی ۔

مثلاً بعض روایات میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

لا تشرب الماء من ثلمة الاناء ولا من عروته فان الشيطان يقعد على العروة والثلمة

برتن کے ٹوٹے ہوئے حصّہ اور اس کے دستے والی طرف سے پانی نہ پیو ، کیونکہ شیطان اس کے دستہ اور ٹوٹے ہوئے حصّہ پہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے [۲]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " شیطان " " جنوں " میں سے ہے ، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ ، اور اسی طرح اس کا دستہ انواع و اقسام کے جراثیم کے اجتماع کی جگہ ہوتا ہے ۔ یہ بعید نظر نہیں آتا کہ " جن و شیطان " " عام مفہوم " کے لحاظ سے اس قسم کے موجودات کو بھی شامل ہوں ۔ اگرچہ اس کا ایک خاص معنی بھی ہے ، جو ایک ایسا موجود ہے جو فہم و شعور اور مسئولیت و

---

[۱] " سفینۃ البحار " جلد اول ص ۱۸۶ (مادہ جن)

[۲] " کتاب کافی " جلد ۶ ص ۳۸۵ کتاب الاشربہ باب الاوانی حدیث ۵

تکلیف (فرائض ووظائف) رکھتا ہے، اور اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں [1]

پروردگارا! اس دن جس میں جن وانس تیری دادگاہ عدل میں حاضر ہوں گے، اور سب بدکار اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، تو ہمیں سایہ لطف میں قرار دے۔

خداوندا! تیرے ملک کا دامن وسیع اور کشادہ ہے اور ہماری معلومات اور ہماری معرفت محدود ہے، ہمیں لغزشوں، خطاؤں اور فیصلے کرنے سے مصئون ومحفوظ رکھ۔

بارِالٰہا! تیرے پیغمبر کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی دعوت کو انسانوں کے علاوہ جن وپری نے بھی قبول کیا ہے، ہمیں اس پر ایمان لانے والوں میں سے قرار دے۔

آمین یارب العالمین

اختتام سُورۂ جن

روز جمعہ ۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

۱۳۶۵/۷/۴

اختتام ترجمہ

بروز جمعہ یکم صفر ۱۴۰۸ ھ

مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء

بوقت تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح

۱۸ رای ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور

---

[1] کتاب "اولین دانش گاہ وآخرین پیغمبر" کی پہلی جلد میں اس سلسلہ میں تقریباً تیس روایات جمع کی گئی ہیں۔

سورۂ مزمل

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی بیس ۲۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ
۱۳۶۵/۷/۵

سورۂ مزمل کے مضامین و مطالب

سورہ کی آیات کا لب و لہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ "مکی" سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح اس کے "مدنیہ" میں نزول کا احتمال جیسا کہ بعض نے کہا ہے، بعید نظر آتا ہے۔ لیکن آغاز و انجام کی آیات کے لب و لہجہ کا فرق یہ بتاتا ہے کہ ان آیات کے درمیان قابلِ ملاحظہ زمانہ کا فاصلہ تھا۔ جسے بعض مفسرین نے "آٹھ ماہ" بعض نے "ایک سال" اور بعض نے "دس سال" تک لکھا ہے[1]

اس سورہ کی بہت سی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر اپنی اعلانیہ دعوت کا آغاز کر چکے تھے اور مخالفین آپ کے مقابلہ میں مخالفت اور تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا پیغمبر کو یہ حکم ملتا ہے کہ اس مرحلہ میں نرمی اور مدارات سے کام لیں۔

اس لیے یہ احتمال کہ تمام سورۂ پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں نازل ہوا ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس کی ابتدائی آیات اس طرح کی ہوں، لیکن مسلّمہ طور پر اس کی تمام آیات اس طرح کی نہیں ہیں، کیونکہ اس کی تعبیریں، اسلام کے پھیلنے اور کم از کم مکّہ کی حد تک مخالفین کی مخالفت اور مبارزہ کے لیے قیام کی نشاندہی کرتی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آغازِ دعوت کے تین سالوں میں، اسی قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

وہ شانِ نزول، جو اس سورہ یا اس کی آیات کے ایک حصّہ کے لیے، روایات میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مختلف ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب پیغمبر پر سب سے پہلی وحی ہوئی اور پیغامِ الٰہی پہنچا، آپ وحشت زدہ ہو کر خدیجہ کے پاس آئے (چونکہ جسمانی ناراحتی محسوس کر رہے تھے لہٰذا کچھ آرام کرنا چاہا) اور فرمایا: "مجھے کوئی کپڑا اوڑھا دو" اس موقع پر جبرئیل نازل ہوئے اور "یا ایھا المزّمّل" کا پیغام پیغمبر کے لیے لائے[2]

جبکہ دوسری آیات میں یہ آیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ پیغمبر اپنی دعوت کو آشکار اور ظاہر کر چکے تھے، اور "قریش" "دار الندوہ" میں جمع ہوئے تاکہ وہ پیغمبر کے معاملہ میں غور و فکر کریں اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی نام اور شعار (نعرہ) کا انتخاب کریں، بعض نے کہا کہ وہ "کاہن" ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اس پیش نہاد کی مخالفت کی، بعض دوسروں نے کہا وہ "مجنون" ہے۔ لیکن پھر ایک گروہ نے مخالفت کی بعض نے "ساحر" کے عنوان کو ترجیح دی، تو اسے بھی انھوں نے قبول نہ کیا۔

آخر کار انھوں نے کہا، جو کچھ بھی ہے "وہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتا ہے (اس بناء پر ساحر ہے) اس کے بعد مشرکین اس جلسے

---

[1] تفسیر "در المنثور" جلد ۶ ص ۲۷۶ و "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۷

[2] "روح المعانی" جلد ۲۸ ص ۱۰۱، اور نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۶

منتشر ہو گئے ۔

یہ بات پیغمبر تک پہنچی تو آپؐ نے اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹ لیا (اور آرام کرنے لگے) اس وقت جبرئیل آئے "یا ایہا المزمل" اور "یا ایہا المدثر" کو آپ کے پاس آکر پڑھا۔[1]

نتیجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، یہ سورہ ظاہراً مکہ میں نازل ہوئی ہے، اور یقینی طور پر اس کا ایک حصہ اسلام کے اعلانیہ اظہار، اور نسبتاً مکہ میں نفوذ کے بعد نازل ہوئی ہے، اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ سورہ کی کچھ ابتدائی آیات اوائل بعثت میں نازل ہوئی ہوں۔

بہرحال اس سورہ کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ :۔ سورہ کی ابتدائی آیات ہیں، جو پیغمبرؐ کو عبادت اور تلاوت کے لیے رات کو قیام کی دعوت دیتی ہیں، اور ایک سنگین اور سخت پروگرام کو قبول کرنے کے لیے آمادگی پر آمادہ کرتی ہیں۔

دوسرا حصہ :۔ انھیں صبر و شکیبائی اور اس خاص علاقہ میں مخالفین کے ساتھ مقاومت و مقابلہ اور مدارات و نرمی کی دعوت دیتا ہے۔

تیسرے حصہ میں :۔ معاد و قیامت کے بارے میں مباحث ہیں، اور موسیٰ بن عمران کو فرعون کی طرف بھیجنے اور اس کی سرکشی اور پھر اس کے دردناک عذاب کو بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے حصہ میں :۔ ان سخت احکام کو، جو سورہ کی ابتداء میں، رات کے وقت قیام کے سلسلہ میں آئے تھے مسلمانوں کی مشکلات کی بناء پر ان میں تخفیف کرتا ہے۔

اور پانچویں حصہ میں :۔ یعنی اس سورہ کے آخری حصہ میں دوبارہ تلاوتِ قرآن، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور استغفار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے :

من قرأ سورة المزمل رفع عنه العسر فی الدنیا والأخرة

"جو شخص سورۂ مزمل کو پڑھے گا تو دنیا و آخرت کی سختیاں اس سے اٹھ جائیں گی"۔[2]

---

[1] "نور الثقلین"، جلد ۶ ص ۲۷۶

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۷۵

اور ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من قرأ سورة المزمل فی العشاء الآخرة، او فی آخر اللیل کان له اللیل والنهار شاهدین مع السورة واحیاه الله حیاة طیبة وأماته میتة طیبة

"جو شخص سورۂ مزمل کو دوسری نمازِ عشاء (نمازِ عشاء ہی مراد ہے، کیونکہ بعض اوقات مغرب کو پہلی عشاء کہا جاتا ہے) یا آخرِ شب میں پڑھے، تو رات اور دن اور اسی طرح یہ سورہ قیامت کے دن اس کے گواہ ہوں گے اور خدا اسے پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ موت دے گا"[1]

یقیناً یہ عظیم فضائل اس صورت میں ہیں جبکہ سورت کے مضامین، رات کے قیام، قرآن کی تلاوت، صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور انفاق پر عمل کیا جائے گا نہ کہ وہ تلاوت جو عمل سے خالی ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۷۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ
۲۔ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا
۳۔ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا
۴۔ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا
۵۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱۔ اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے۔
۲۔ رات کو، تھوڑے سے حصّہ کے سوا، قیام کیا کر۔
۳۔ آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا کم کر دے۔
۴۔ یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے، اور قرآن کو دقّت و تامل کے ساتھ پڑھا کر۔
۵۔ کیونکہ ہم عنقریب ایک سنگین وثقیل بات کا تجھ پر القاء کریں گے۔

تفسیر

اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا

جیسا کہ اس سورہ کے آغاز کے لب ولہجہ سے پتہ چلتا ہے، یہ پیغمبرؐ کو استقامت کے لیے اور ایک عظیم وسنگین ذمہ داری کو قبول کرنے

کے لیے آمادگی کی ایک آسمانی دعوت ہے کہ جسے پہلے سے خود کو تیار کیے بغیر انجام دینا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے: "اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے" (یا ایھا المزمل)۔[۱]

"رات کو تھوڑے سے حصہ کے سوا قیام کیا کر" (قم الّیل الّا قلیلاً)۔

"آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا سا کم کر دے" (نصفہ او انقص منہ قلیلاً)۔

"یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے" (او زد علیہ)۔

"اور قرآن کو انتہائی غور و خوض سے اور انتہائی وضاحت و فصاحت کے ساتھ تلاوت کیا کر" (ورتل القرآن ترتیلاً)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب پیغمبرؐ ہیں لیکن "یا ایھا الرسول" اور "یا ایھا النبی" کے عنوان سے نہیں بلکہ "یا ایھا المزمل" کے عنوان سے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنے اوپر کپڑا لپیٹ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہنے کا دور نہیں ہے، بلکہ یہ کھڑے ہونے اور خود کو تیار کرنے اور عظیم رسالت کو انجام دینے کے لیے آمادگی کا دور ہے۔

اور اس کام کے لیے رات کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ:

اولاً دشمنوں کی آنکھ اور کان نیند کی حالت میں ہیں، اور

ثانیاً زندگی کے کاروبار بند ہیں، اور اس بناء پر انسان غور و فکر اور تربیتِ نفس کے لیے زیادہ سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے۔

اسی طرح اس پروگرام کے لیے متن اصلی کے عنوان سے "قرآن" کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ یہ اس سلسلہ کے تمام ضروری اسباق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ ایمان کی تقویت، استقامت، تقویٰ اور پرورشِ نفوس کا بہترین وسیلہ ہے۔

"ترتیل" کی تعبیر جو اصل میں موزوں "تنظیم" و "ترتیب" کے معنی میں ہے اور یہاں آیاتِ قرآنی کو تأنی (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) ضروری نظم، حروف کی صحیح ادائیگی، الفاظ کو وضاحت کے ساتھ پڑھنا، آیات کے مفاہیم میں دقت و تأمل اور ان کے نتائج میں غور و فکر کرنا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی اس طرح سے تلاوت انسان کو معنوی نشو و نما، اخلاقی شہامت اور تقویٰ و پرہیزگاری سرعت کے ساتھ بخش سکتی ہے اور اگر بعض مفسرین نے اس کی نماز پڑھنے کے معنی میں تفسیر کی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا ایک اہم حصہ "تلاوتِ قرآن" ہی ہے۔

"قم اللیل" کے جملہ میں "قیام" کی تعبیر، سونے کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ صرف پاؤں پر

---

[۱] "مزمل" اصل میں "متزمل" تھا۔ "تزمل" کے مادہ سے جس کا معنی اپنے اوپر کپڑا لپیٹنا ہے اور "زمیل" جو ہم ردیف کے معنی میں ہے (وہ شخص جو کسی کے پیچھے سواری پر ہو) اور اس کے بعد رفیق اور ساتھی کے معنی میں آیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ وہ ارتباط اور قریبی تعلق رکھتا ہے۔

کھڑا ہونے کے معنی میں ہے۔

لیکن ان آیات میں "شب زندہ داری" کی مقدار کے بارے میں جو مختلف تعبیریں آئی ہیں، وہ حقیقت میں "اختیار" کو بیان کرنے کے لیے ہیں، اور وہ پیغمبر کو یہ اختیار دیتی ہیں کہ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بیدار رہیں اور قرآن کی تلاوت کریں، پہلے مرحلہ میں "ساری رات" سوائے تھوڑی سی مقدار کے ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد اس میں تخفیف کرکے آدھی رات تک پہنچاتا ہے، اور اس کے بعد آدھے سے بھی کم۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے "دو تہائی" "آدھی" اور "ایک تہائی" رات کے درمیان تخییر مراد ہے۔ اس آیت کے قرینہ سے جو اسی سورہ کے آخر میں آئے گی، جس میں فرماتا ہے: (ان ربك يعلم انك تقوم ادنٰى من ثلثى الّيل و نصفه و ثلثه)

ضمنی طور پر سورہ کے آخر کی اسی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اس رات کے قیام میں اکیلے نہیں تھے، بلکہ مومنین کا ایک گروہ بھی اس خود سازی و تربیتی اور آمادگی کے پروگرام میں پیغمبر کے ساتھ تھا اور انھوں نے اس راہ میں آپ کو ایک اسوہ اور نمونہ کے طور پر قبول کیا ہوا تھا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "قم الليل الّا قليلاً" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بعض راتوں کے سوا تمام راتوں میں قیام کیا کر، اور اس طرح سے استثناء رات کے حصوں میں نہیں ہے، بلکہ راتوں کے افراد میں ہے۔ لیکن یہ تفسیر "   "کے مفرد ہونے اور "نصف" (آدھی) اور اس سے کمتر کی تعبیر کے ساتھ درست نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد اس سخت اور اہم حکم کے "ہدف نہائی" اور "مقصد اصلی" کو اس طرح بیان کرتا ہے: "ہم عنقریب ایک سخت بات تجھ کو القاء کریں گے" (انّا سنلقى عليك قولاً ثقيلاً)۔

اگرچہ مفسرین "قول ثقيل" کے بارے میں الگ الگ بیان رکھتے ہیں، جو مسئلہ کے ایک ہی پہلو کو پیش کرتے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کا سنگین ہونا، جس سے بلاشک و شبہ قرآن مجید مراد ہے، مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آیات کے مفہوم اور مطالب کے لحاظ سے سنگین۔

دلوں پر تحمل کے لحاظ سے سنگین، یہاں تک کہ خود قرآن کہتا ہے: لو انزلنا هٰذا القرآن على جبل لرأيته خاشعًا متصدعًا من خشية الله: "اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کرتے، تو تو اسے خاشع اور شگافتہ دیکھتا" (حشر ــــ ۲۱)

وعدوں اور وعیدوں، ذمہ داریوں اور مسئولیتوں کے بیان کے لحاظ سے سنگین۔

تبلیغ اور دعوت کی راہ کی مشکلات کے لحاظ سے سنگین۔

ترازوئے عمل اور عرصۂ قیامت میں سنگین

اور آخر میں پروگرام پیش کرنے اور اس کے مکمل اجراء کے لحاظ سے سنگین۔

ہاں! اگرچہ قرآن کا پڑھنا سہل و آسان اور زیبا و دلنشیں ہے لیکن اس کے مفاد اور معانی کو عمل میں لانا اسی نسبت سے سنگین اور مشکل ہے

خصوصًا پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں، اور آپ کے مکہ میں قیام کرنے کے وقت، جب ماحول کو جہالت، بت پرستی اور خرافات کے تیرہ و تار بادلوں نے گھیر رکھا تھا، لیکن پیغمبر اکرم اور ان کے تھوڑے سے ساتھی، قرآن مجید کی تربیت سے مدد لیتے ہوئے، اور نمازِ شب سے اعانت طلب کرتے ہوئے اور پروردگار کی پاک ذات کے تقرب سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے اور اس "قول ثقیل" کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔

چند نکات

۱۔ تلاوتِ قرآن اور دعا و عبادت کے لیے رات کو اٹھنا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر کی ذاتِ اقدس ہے۔ لیکن سورہ کا متن اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مومنین بھی اس پروگرام میں پیغمبر کی ذات کے ساتھ ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ کیا یہ قیام اور شب زندہ داری، پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں سب پر واجب تھی یا نہیں؟

بعض مفسرین کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ امر واجب تھا۔ بعد میں سورہ کی آخری آیت نے آکر اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اس میں تقریبًا ایک سال کا فاصلہ تھا۔

یہاں تک کہ بعض کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ حکم پنجگانہ نمازوں کی تشریع سے پہلے تھا اور جب پنجگانہ نمازیں مشروع قرار دے دی گئیں تو اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

لیکن —— جیسا کہ مرحوم "طبرسی" نے بھی "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے —— اس سورہ کی آیات کے ظاہر میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو "نسخ" کے اوپر دلیل ہو اور بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ قیام و عبادت مستحب اور سنت مؤکدہ ہے اور اس میں ہرگز وجوب کا پہلو تھا ہی نہیں، سوائے پیغمبر اکرم کی ذات کے لیے، کیونکہ قرآن کی بعض دوسری آیات کے مطابق نمازِ شب آپ پر واجب تھی اور اس میں کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ مسئلہ پیغمبر کے لیے واجب اور مسلمانوں پر مستحب ہو، اور اس سے قطع نظر اوپر والی آیات میں جو کچھ آیا ہے وہ "نمازِ شب" میں منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ نمازِ شب تو آدھی رات یا دو تہائی رات یا ایک تہائی رات تک کو بھی شامل نہیں رکھتی، جو کچھ آیت میں بیان ہوا ہے وہ تو ترتیلِ قرآن کے لیے اٹھنا ہے۔

اس بناء پر یہ کام ابتداء میں مستحب مؤکد کی صورت میں تھا اور اس کے بعد اس میں تخفیف کر دی گئی اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہر کام کے آغاز میں، خصوصًا ایک عظیم انقلاب کی ابتداء میں، ہمیشہ زیادہ قوت و توانائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ پیغمبر اور مسلمانوں کو، اس قسم کا فوق العادہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ رات کا زیادہ حصہ بیدار رہیں اور اس جدید پروگرام اور اس کی انقلابی تعلیمات سے آشنا ہوں، اور اس سے آگاہی کے علاوہ خود کو اس پر عمل کرنے کے لیے روحانی طور پر تیار کریں۔

۲۔ ترتیل کا معنی

اوپر والی آیات میں جس چیز پر تکیہ کیا گیا ہے وہ قرآن کی قراءت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ " ترتیل " کا مسئلہ ہے۔
" ترتیل " کی تفسیر میں معصومین ؑ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کے وسیع الابعاد وجہات میں سے کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی ؑ سے آیا ہے:

بينه بيانًا ولا تهذّه هذّ الشعر ولا تنثره نثر الرمل، ولكن اقرع به القلوب القاسية ولا يكونن همّ احدكم اٰخر السورة

" ترتیل " یعنی اس کو واضح طور پر بیان کر، نہ تو اشعار کی طرح جلدی اور یکے بعد دیگرے پڑھ، اور نہ ہی ریت کے ذروں کی طرح اس کو بکھیر دے۔ لیکن اس طرح پڑھ کہ اس سے سخت اور سنگین دلوں کو نرم کر دے، اور انھیں بیدار کر دے، ہرگز تمھارا مقصد یہ نہ ہو کہ تم لازمی اور حتمی طور پر آخر سورۃ تک پہنچو اور اسے ختم کر کے رہو (بلکہ اہم بات یہ ہے کہ تم آیات کے مطالب اور معانی کو سمجھو)[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق ؑ سے " ترتیل " کی تفسیر میں یہ آیا ہے:

اذا مررت باٰية فيها ذكر الجنة فاسأل الله الجنة، واذا مررت باٰية فيها ذكر النار فتعوذ بالله من النار

" جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جنت کا ذکر ہو تو رک کر خدا سے جنت کا سوال کرو (اور اپنی اس کے لیے اصلاح کرو) اور جب تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو خدا سے اس سے پناہ مانگو (اور خود کو اس سے دور رکھو)[2]

ایک اور روایت میں اسی امام ؑ سے آیا ہے کہ آپ نے " ترتیل " کی تفسیر میں فرمایا:

هو ان تتمكث فيه وتحسن به صوتك

" ترتیل " یہ ہے کہ تو آیات کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور انھیں اچھی آواز میں پڑھے "[3]

ایک اور حدیث میں انھیں حضرت سے اس طرح نقل ہوا ہے:

ان القراٰن لا يقرأ هذرمة، ولكن يرتل ترتيلا اذا مررت باٰية فيها

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۳۷۸، یہ حدیث اصول کافی جلد ۲۔ باب " ترتيل القراٰن بالصوت الحسن " اور دوسری کتابوں میں بھی مختصر فرق کے ساتھ آئی ہے۔

[2] وہی مدرک

[3] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۳۷۸

ذکرالنار وقفت عندھا و تعوذت باللہ من النار

"قرآن کو جلدی جلدی، سرعت اور تیزی کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو وہاں رک جاؤ، اور خدا سے جہنم کی آگ سے پناہ مانگو"[۱]

اور آخری بات یہ ہے کہ پیغمبر کے حالات میں نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ آیات کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرکے پڑھتے اور اپنی آواز کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے[۲]

یہ روایات، اور وہ دوسری روایات جو اسی مفہوم کی اصولِ کافی، نورالثقلین، درمنثور اور حدیث و تفسیر کی تمام کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آیاتِ قرآنی کو اس طرح نہیں پڑھنا چاہیے، جو مطالب و مضامین اور پیام سے خالی ہو، بلکہ ان تمام امور کی طرف توجہ رکھنی چاہیے، جو پڑھنے اور سننے والوں میں اس کی تاثیر کو گہرا کر دے، اور اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اللہ کا پیام ہے اور اس کا مقصد اس کے مطالب و مضامین کو تحقق بخشنا (اور عملی جامہ پہنانا ہے)

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان اس واقعیت سے بہت دُور ہو گئے ہیں، اور انھوں نے قرآن کے صرف الفاظ پر اکتفا کر لیا ہے، اور ان کا مقصد صرف سورت اور قرآن کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ یہ جانیں کہ یہ آیات کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں؟ اور کس پیام کی تبلیغ کر رہی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ بھی محترم ہیں، اور ان کو پڑھنا بھی فضیلت رکھتا ہے؟ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ الفاظ اور تلاوت ان کے مطالب و مضامین کو بیان کرنے کا مقدمہ اور تمہید ہے۔

۲۔ نمازِ شب کی فضیلت

یہ آیات دوبارہ شب زندہ داری، نمازِ شب، اور اس وقت —— جبکہ غافل لوگ خوابِ غفلت میں پڑے سوئے ہوئے ہوتے ہیں —— قرآن کی تلاوت کی اہمیت کو گوشزد کرتی ہیں، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ رات کو عبادت کرنا، خصوصاً سحر کے وقت، اور طلوعِ فجر کے نزدیک، روح کی صفائی، تہذیب نفوس اور انسان کی معنوی تربیت، پاکیزگی قلب، دل کی بیداری، ایمان و ارادہ کی تقویت اور انسان کے دل و جان میں تقویٰ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں حد سے زیادہ اثر رکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک ہی مرتبہ کی آزمائش سے، انسان اس کے آثار، واضح طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

اسی بناء پر آیاتِ قرآنی کے علاوہ روایاتِ اسلامی میں بھی اس مطلب پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔

منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان من روح اللہ تعالیٰ ثلاثۃ، التھجد باللیل و افطار الصائم

---

[۱] "نورالثقلین"، جلد ۵ ص ۴۴۷

[۲] "مجمع البیان" زیرِ بحث آیت کے ذیل میں

و لقاء الاخوان

" تین چیزیں خدا کی مخصوص عنایات میں سے ہیں، شبانہ عبادت (نمازِ تہجد) روزہ داروں کو افطار کرانا اور مسلمان اور مومن بھائیوں کی زیارت وملاقات کرنا " [1]

ایک اور حدیث میں انھیں جناب سے آیا ہے کہ آپ نے آیہ "ان الحسنات یذھبن السیئات" (نیک کام بُرے کاموں کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں) کی تفسیر میں فرمایا:

صلاة اللیل تذھب بذنوب النھار

" نمازِ تہجد دن کے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے " [2]

سُورہ اسراء کی آیہ ۷۹، کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اور ہم نے وہاں پر نمازِ تہجد کی اہمیت کے بارے میں بہت عمدہ روایات نقل کی ہیں [3]

---

[1]، [2] "بحار الانوار" جلد ۸۷ ص ۱۴۳

[3] "تفسیر نمونہ" جلد ۱۲ ص ۲۲۷

۶۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلاً ؕ

۷۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً ؕ

۸۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً ؕ

۹۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلاً ۝

۱۰۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلاً ۝

ترجمہ

۶۔ یقیناً شبانہ (عبادت) کا پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے۔

۷۔ اور دن میں تو تمھارے لیے مسلسل اور طولانی کوششیں جاری رہیں گی۔

۸۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیے جاؤ اور صرف اسی کے ساتھ دل کو لگائے رکھو۔

۹۔ وہی مشرق و مغرب کا پروردگار ہے جسکے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ پس تم اسی کو اپنا نگہبان اور کارساز مانو

۱۰۔ اور جو کچھ وہ (دشمن) کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور شائستہ طور پر ان سے دُوری اختیار کرو۔

تفسیر

رات کے وقت کی عبادت کا اثر

یہ آیات اسی طرح رات کی عبادت اور رات کی تاریکی میں قرآن کی تلاوت کے ذریعے، معنوی تعلیمات کے سلسلہ میں، بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اور حقیقت میں جو کچھ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے، یہ اس کی دلیل کے طور پر آئی ہیں "یہ عبادت اور رات کی تلاوت کا حکم اس بناء پر ہے کیونکہ (عبادت اور تعلیم کا) یہ پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے (انّ ناشئة اللیل ھی اشد وطئًا واقوم قیلًا)۔[1]

---

[1] "ناشئة" اسم فاعل ہے لیکن یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ مصدر ہو "عافیة" کی طرح۔

"ناشئة" "نشئ" (بروزن نشر) کے مادہ سے "حادثہ" کے معنی میں ہے، اور یہ بات کہ یہاں اس سے کیا مراد ہے اس کے تین تفاسیر بیان ہوئی ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد رات کی گھڑیاں ہیں، جو یکے بعد دیگرے حادث ہوتی ہیں، یا خصوصیت کے ساتھ آخر شب اور سحر کی گھڑیاں ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ اس سے مراد نماز و عبادت اور تلاوت کے لیے قیام کا پروگرام ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

هي القيام في آخر الليل الى صلاة الليل

اس سے مراد آخر شب میں نمازِ تہجد کے لیے قیام کرنا ہے[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے اس آیہ کی تفسیر میں آیا ہے:

قيامه عن فراشه لا يريد الا الله

اس سے مراد بستر سے کھڑا ہونا ہے جس کا مقصد خدا کے سوا اور کچھ نہ ہو[2]

تیسری یہ ہے کہ اس سے مراد "معنوی و روحانی حالات" اور "ملکوتی نشاط و جذبہ" ہے، جو انسان کے دل و جان میں، رات کی ان مخصوص گھڑیوں میں پیدا ہوتا ہے جس کے اثرات روحِ انسانی میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں اور ان کا دوام زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

البتہ یہ تفسیر اور اس سے پہلے والی تفسیر ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں اور یہ مناسب ہے کہ یہ دونوں ہی آیت میں جمع ہوں۔

"وطئا" اصل میں قدم رکھنے اور اسی طرح موافقت کرنے کے معنی میں ہے۔

"اشد وطئا" کی تعبیر یا تو مشقت و زحمت کے معنی میں ہے جو شبانہ قیام اور عبادت میں ہوتی ہے یا پھر ثابت و راسخ تاثیرات کے معنی میں ہے جو ان عبادات کے سایہ میں انسان کی روح اور جان میں پیدا ہوتی ہے (البتہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے)

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس زیادہ موافقت کے معنی میں ہے جو ان لمحات میں انسان کے دل آنکھ اور کان کے درمیان ہوتی ہے اور ان سب کے اجتماع سے عبادت کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

"اقوم" "قیام" کے مادہ سے محکم و مضبوط اور زیادہ صاف کے معنی میں ہے اور "قیل" "بات کرنے کے معنی میں ہے، یہاں ذکرِ خدا اور تلاوتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو "شبانہ عبادت" اور سحر گاہی دعا ثنا، اور ایسے لمحات میں جبکہ ہر وقت کی نسبت، دلی فراغت کے اسباب زیادہ فراہم ہوتے ہیں ——— محبوب کے ساتھ راز و نیاز کی رساترین باتوں کو اپنی معنی خیز تعبیروں کے ساتھ بیان کرتی ہے اور اسی طرح سے انسان کی تہذیبِ نفس، اور روحِ جان کی پرورش میں اس کی تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۷۸

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۸ حدیث ۱۶

انسان کی روح، ان لمحات میں دعاء و مناجات اور ذکر و فکر کے لیے ایک خاص قسم کی آمادگی رکھتی ہے۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ دن میں تو تمھیں مسلسل اور بہت زیادہ سعی و کوشش اور جدّو جہد کرنی پڑے گی (ان لك فی النهار سبحًا طویلًا)۔

تم ہمیشہ مخلوق کی ہدایت اور پروردگار کی رسالت کی تبلیغ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے مشکلات کو حل کرنے میں لگے رہتے ہو، اور عبادت اور مناجات کے لیے کافی وقت نہیں ملتا، لہٰذا اس کی بجائے رات کو عبادت کیا کرو۔

ایک اور احتمال بھی جو آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور کئی جہات سے زیادہ بہتر اور قبل و بعد کی آیات کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ چونکہ تم دن بھر میں سنگین وظائف، بھاری ذمہ داریوں اور بہت زیادہ جدوجہد کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہو، لہٰذا تمھیں رات کی عبادت کے ساتھ خود کو تقویت دینی چاہیے اور ان عظیم فعالیتوں کے لیے اس قیام شب کے ذریعہ ضرور تیار ہونا چاہیے۔

" سبح " (بروزن "مدح") اصل میں حرکت اور آمدورفت کے معنی میں ہے اور بعض اوقات تیرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے

گویا وہ انسانی معاشرے کو ایک بے کراں سمندر سے تشبیہ دیتا ہے، جس میں ایک گروہ کثیر غرق ہونے کی حالت میں ہے، اسکی امواج خروشاں ہر طرف حرکت میں ہیں، سرگرداں کشتیاں اس میں پناہ گاہ تلاش کرتی پھرتی ہیں اور پیغمبر اسلامؐ اس سمندر میں غرق ہونے والوں کے لیے، اکیلے نجات دہندہ ہیں اور آپ کا قرآن اس سمندر میں اکیلی نجات کی کشتی ہے۔

اس عظیم تیراک کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی شبانہ عبادات کے ذریعہ اس روزانہ کی عظیم ماموریت اور رسالت کے لیے آمادہ کرے۔

رات کی عبادت کے قیام کے حکم، اور اس کے عمیق اور گہرے آثار کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد پانچ احکام کا، جو ان کی تکمیل کرتے ہیں ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرو اور اس کا ذکر کرو" (واذکر اسم ربك)۔

مسلمہ طور پر اس سے مراد صرف خدا کے نام کا ذکر کرنا نہیں ہے بلکہ معنی کی طرف توجہ ہے، کیونکہ لفظی ذکر قلبی یاد کا ایک مقدمہ اور تمہید ہے اور قلبی ذکر روح و جان کو صفا بخشتا ہے اور دل میں معرفت و تقویٰ کے نہال کی آبیاری کرتا ہے۔

" رب " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت تم اس کے مقدس نام کا ورد کرو تو اس کی بے پایاں نعمتوں اور اپنے لیے اس کی مسلسل تربیت کی طرف توجہ رکھو۔

ایک مفسر نے پروردگار کے ذکر کے کچھ مراحل بیان کیے ہیں۔

پہلا مرحلہ اس کے نام کے ذکر کا ہے، جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد والے مرحلہ میں اس کی پاک ذات کی دل میں یاد آوری کی نوبت آتی ہے، جو سورۂ اعراف کی آیہ ۲۰۵ میں بیان ہوئی ہے " واذکر ربك فی نفسك تضرعا و خیفة " "اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع اور خوف کے

ساتھ یاد کرو۔"

آخر کار تیسرا مرحلہ آن پہنچتا ہے، اس مرحلہ میں خدا کی ربوبیت کے مرحلہ سے اوپر چلا جاتا ہے اور خدا کے صفاتِ جمال وجلال کے مجموعہ کے مقام تک ـــــ جو اللہ میں جمع ہے ـــــ پہنچ جاتا ہے، جیسا سورہ احزاب کی آیہ ۴۱ میں فرماتا ہے:

يا ايها الذين آمنوا اذكروا الله ذكرًا كثيرًا

"اے ایمان لانے والو! خدا کو کثرت سے یاد کیا کرو"

اور اس طرح سے یونہی یہ ذکر جاری وساری رہے گا اور مرحلہ بہ مرحلہ تکامل وارتقاء پیدا کرتا رہے گا اور ذکر کرنے والوں کو اوجِ کمال تک پہنچا دے گا۔[1]

دوسرے حکم میں فرماتا ہے: "خدا ہی کے ساتھ اپنے دل کو لگاؤ اور اس کے غیر سے امید کو قطع کر لو اور خلوص کے ساتھ عبادت کے لیے کھڑے ہو جاؤ" (و تبتل اليه تبتيلًا)۔[2]

"تبتل" "بتل" (بروزن ختم) کے مادہ سے اصل میں انقطاع کے معنی میں ہے اور اسی لیے مریم کو "بتول" کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے لیے کوئی شوہر انتخاب نہیں کیا اور اگر بانوئے اسلام فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کو بھی بتول کہا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے اعمال ورفتار اور معرفت کے لحاظ سے جدا اور برتر تھیں اور انقطاع الی اللہ کی حالت تک پہنچی ہوئی تھیں۔

بہرحال "تبتل" یہ ہے کہ انسان اپنے پورے دل کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو اور اللہ کے سوا ہر کسی سے منقطع ہو جائے، اور اپنے اعمال صرف اسی کے لیے بجا لائے اور اخلاص میں غرق ہو۔

اور اگر ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلام سے یہ نقل ہوا ہے کہ:

لا رهبانية، ولا تبتل في الاسلام

"اسلام میں نہ تو رہبانیت ہے اور نہ ہی تبتل"۔[3]

تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے ترکِ دنیا کرنا، جو عیسائی راہبوں میں رائج ہے، وہ اسلام میں موجود نہیں ہے وہ ترکِ دنیا کے لیے شادی بیاہ کو بھی ترک کرتے ہیں اور ہر قسم کی اجتماعی فعالیت کو بھی، لیکن اگر واقعی اور حقیقی مسلمان، قلبِ اجتماع میں زندگی بسر کرنے کے باوجود تمام تر خدا ہی طرف متوجہ رہتا ہے۔

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۱۷۷ (اقتباس)

[2] قاعدہ کے مطابق یہاں "مفعول مطلق" "تبتل" ہونا چاہیے جو باب "تفعّل" کا مصدر ہے، لیکن اس کی جگہ یہاں پہ باب تفعیل کا مصدر آیا ہے، [illegible] بات کے علاوہ کہ یہ آیات کے آخر میں ہم آہنگی کو محفوظ رکھتا ہے، ممکن ہے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو اور وہ یہ ہے کہ "انقطاع الی اللہ" [illegible] اکتسابی ہے اور نہ ہی تمام کا تمام موہبتی۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو پرہیزگار بندہ کی سعی وکوشش شرط ہے اور دوسری طرف سے پروردگار کا لطف۔

[3] "مفردات" و "مجمع البحرین" مادہ "تبتل"۔

بعض روایات میں، آئمہ معصومین سے نقل ہوا ہے کہ " تبتل " کا معنی حالت نماز میں ہاتھ کو بلند کرنا ہے [۱] لیکن یہ بات ہے کہ یہ حقیقت میں اخلاص اور انقطاع الی اللہ کے ایک مظہر کا بیان ہے ۔

بہر حال پروردگار کی وہ یاد اور یہ اخلاص، مخلوق خدا کی ہدایت کے سنگین وسخت پروگرام میں مردانِ خدا کا عظیم سرمایہ ہے ۔

اس کے بعد تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : " وہی مشرق ومغرب کا پروردگار، جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے، اسی کو اپنا محافظ اور کارساز مانو" (رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ہو فاتخذہ وکیلاً) ۔

یہاں " ذکر اللہ " اور " اخلاص " کے مرحلہ کے بعد، توکل اور تمام کاموں کو خدا کے سپرد کرنے کا مرحلہ آتا ہے : یعنی جہان کا یہ سارا مجموعہ، اسی کی حکومت وربوبیت کے زیر تسلط ہے اور پرستش کے لائق وہی یکہ وتنہا معبود ہے، یہ تعبیر حقیقت میں، توکل برخدا کے وجوب پر، ایک دلیل کے طور پر آئی ہے، انسان اس پر توکل کیسے نہ کرے اور اپنے معاملات کو اس کے سپرد کیوں نہ کرے، حالانکہ اس وسیع عالم ہستی میں اس کے علاوہ کوئی اور حاکم، فرمانروا، منعم، مربی اور معبود نہیں ہے ۔

آخر چوتھے اور پانچویں حکم میں فرماتا ہے : " دشمن جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر وشکیبائی اختیار کرو، اور ان سے شائستہ اور عمدہ طریقہ سے دوری اختیار کرلو" (واصبر علیٰ ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً) ۔

اور اس طرح سے یہاں "صبر" اور " ہجران " کا مقام آپہنچتا ہے، کیونکہ حق کی طرف دعوت کی راہ میں، دشمنوں کی بدگوئی اور اذیت وآزار بہت زیادہ، اور اگر باغبان کوئی پھول توڑنا چاہتا ہے تو اسے کانٹے کی زبان کے مقابلہ میں صبر کرنا پڑے گا ۔

اس کے علاوہ بعض اوقات یہاں بے اعتنائی اور دُوری ضروری ہو جاتی ہے ۔ تاکہ ایک تو ان کے شر سے محفوظ رہے، دوسرے اس طرح سے انھیں ایک سبق بھی دے، لیکن یہ ہجران ودُوری، تربیتی پروگراموں اور خدا کی طرف تبلیغ ودعوت کے قطع کرنے کے معنی میں نہیں ہونی چاہیے ۔

اس طرح سے اوپر والی آیات، پیغمبر اسلامؐ اور ان تمام لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں ایک جامع اور کامل نسخہ دیتی ہیں کہ وہ رات کی عبادات اور بوقت سحر پروردگار سے دعا ومناجات سے مدد حاصل کریں اور پھر اس پودے کی یادِ خدا، اخلاص، توکل، صبر اور ہجران کے پانی سے آبیاری کریں ۔ کیسا جامع اور عمدہ نسخہ ہے ؟

" رب المشرق والمغرب " (مشرق ومغرب کے پروردگار) کی تعبیر تمام عالم ہستی پر اس کی حاکمیت وربوبیت کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں : فلاں شخص نے زمین کے مشرق ومغرب پر اپنا تسلط جمالیا ہے، یعنی تمام روئے زمین کو، نہ کہ صرف مشرق ومغرب کے نقطہ کو ۔

" ھجر جمیل " (شائستہ دوری وجدائی)، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ دلسوزی اور حق کی طرف دعوت وتبلیغ سے توام ہجران ودوری کے معنی میں ہے، جو خاص خاص علاقوں میں ایک تربیتی روش شمار ہوتی ہے اور دوسرے علاقوں میں " جہاد " کے مسئلہ کے

[۱] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۵ حدیث ۲۷

ساتھ بالکل منافات نہیں رکھتی، کیونکہ ہر ایک کی ایک جگہ ہے اور ہر نقطہ کا ایک مقام ہے، دوسرے لفظوں میں یہ دوری بے اعتنائی نہیں ہے، بلکہ خود ایک قسم کی اعتناء اور پرواہ کرتا ہے، بہرحال یہ جو بعض نے اوپر والی آیت کو آیات جہاد سے منسوخ سمجھا ہے، صحیح نہیں ہے۔

مرحوم "طبرسی" "مجمع البیان" میں اس آیہ کے ذیل میں کہتے ہیں:

وفی هٰذا دلالة علی وجوب الصبر علی الاذی، لمن یدعو الی الذین و المعاشرة باحسن الاخلاق واستعمال الرفق لیکونوا اقرب الی الاجابة

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مبلغین اور قرآن کی طرف دعوت دینے والے تکالیف اور اذیتوں میں صبر اختیار کریں، اور حسن خلق و مدارات کے ساتھ لوگوں میں معاشرت کریں، تاکہ ان کی باتیں جلدی قبول ہوں"[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۹

۱۱- وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝
۱۲- إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۝
۱۳- وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝
۱۴- يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ
كَثِيبًا مَهِيلًا ۝
۱۵- إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا
إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝
۱۶- فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝
۱۷- فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ
شِيبًا ۝
۱۸- السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝
۱۹- إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ
سَبِيلًا ۝

ترجمہ

۱۱- مجھے ان جھٹلانے والے صاحبانِ نعمت (سے بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دو اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔

۱۲- کیونکہ ہمارے پاس غل وزنجیر اور (جہنم کی آگ) ہے۔

۱۳- اور گلوگیر غذا اور دردناک عذاب ہے۔

۱۴۔ اس دن زمین اور پہاڑ شدت سے لرز رہے ہوں گے اور پہاڑ (اس طرح ریزہ ریزہ ہوں گے کہ) ریت کے تودوں کی شکل میں نرم ہوجائیں گے

۱۵۔ ہم نے تمھاری طرف ایسا ہی ایک پیغمبر گواہ بناکر بھیجا ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔

۱۶۔ فرعون اس رسول کی مخالفت اور نافرمانی کے لیے کھڑا ہوگیا تو ہم نے اسے سخت سزا دی۔

۱۷۔ تو اگر تم بھی کافر ہوگئے، تو تم (خدا کے شدید عذاب سے) اس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، کس طرح خود کو بچاؤ گے۔

۱۸۔ اس دن آسمان پھٹ پڑے گا اور اس کا وعدہ پورا ہوکر رہے گا۔

۱۹۔ یہ تو ایک تنبیہ اور نصیحت ہے پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے۔

تفسیر

ان مستکبرین کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے

گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں دشمنانِ اسلام کی کارشکنیوں، ناروا باتوں اور اذیت و آزار کی طرف اشارہ تھا، زیرِ بحث آیات میں انھیں خدا کی طرف سے، دنیا و آخرت کے عذابوں کی شدید تہدیدیں اور دھمکیاں دی گئی ہیں اور انھیں اپنے شوم و منحوس پروگراموں میں تجدیدِ نظر کی دعوت دی ہے اور صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی ان دشمنوں کے سخت ہجوم کے مقابلہ میں دلداری کی ہے اور انھیں پامردی بخشی ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "مجھے ان تکذیب کرنے والے، ثروت مند اور صاحبانِ نعمت افراد کے ساتھ (بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دے اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے دے"۔ (وذرني والمكذبين اولى النعمة ومهلهم قليلاً)۔

یعنی ان کا مدِ مقابل تو نہیں ہے، میں ہوں! ان کی سزا و عذاب کا معاملہ خود مجھ پر چھوڑ دے، اور تھوڑی سی انھیں مہلت دے دے، تاہم اتمامِ حجت بھی ہوجائے اور وہ اپنی ماہیت کو ظاہر و آشکار ابھی کر دیں، اور اپنی پشت کو بارِ گناہ سے سنگین اور بوجھل کرلیں، تو اس وقت میرا عذاب ان کا گلا دبا لے گا۔

اور ہم جانتے ہیں کہ تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ مسلمان طاقت ور ہوگئے اور انھوں نے جنگ "بدر" و "حنین" و "احزاب" وغیرہ میں اپنی سخت اور توڑنے والی ضربیں دشمن کے پیکر پر لگائیں، نیز زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یہ سرکشی کرنے والے دنیا سے چلتے بنے اور برزخ میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے اور قیامت کا عذاب بھی ان سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

ضمنی طور پر "اولى النعمة" (صاحبانِ نعمت) کی تعبیر مال و دولت اور مادی امکانات و وسائل کی زیادتی سے پیدا ہونے والے غرور و غفلت کی طرف اشارہ ہے، جو ایسے لوگوں کو اکثر دامن گیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی طول تاریخ میں ــــــــ جیسا کہ قرآن شاہد گواہ

ہے ——— یہ گروہ ہمیشہ مخالفین کی صفِ اوّل میں رہا ہے ۔
حقیقت میں یہ آیت سورۂ سبا کی آیت ۳۴ کے مشابہ ہے، جو کہتی ہے: وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا ق
مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون، "ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی انذار کرنے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ ان کے مترفین (جو
میں مست تھے) نے کہا: تم جس چیز کے ساتھ بھیجے گئے ہو ہم اس سے کافر ہیں، انکار کرتے ہیں"۔
حالانکہ اس قسم کے افراد کو دوسروں سے پہلے منادیانِ حق کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے، تاکہ اس طریقہ سے ان سب خدا
شکر بجا لائیں ۔

اس کے بعد اسی تہدید کو جاری رکھتے ہوئے اور زیادہ صریح صورت میں کہتا ہے: " ہمارے پاس غل و زنجیر اور جہنم کی آگ
(ان لدینا انکالا و جحیما)۔
" انکال " " نکل " (بروزنِ فکر) کی جمع ہے اور بوجھل زنجیروں کے معنی میں ہے اور اصل میں " نکول " کے مادہ سے
ضعف و ناتوانی کے معنی میں لیا گیا ہے اور چونکہ وہ زنجیر جو ہاتھ پاؤں اور گردن میں ڈالتے ہیں، انسان کو حرکت کرنے سے روک دیتی ہے،
ناتواں بنا دیتی ہے، اس لیے یہ لفظ " زنجیر " کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ہاں! بے قید و شرط آزادی اور اس ناز و نعمت کے مقا
جو وہ اس دنیا میں رکھتے تھے، وہاں ان کا حصّہ قید اور آگ ہی ہوگی ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: " اور گلوگیر ہونے والی غذا اور دردناک عذاب"۔ (وطعاما ذا غصۃ وعذا
الیما)۔
وہ غذا، ان کی دنیا کی چرب و شیریں غذاؤں سے ——— جو آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے اتر جاتی تھیں اور مزے دار ہوتی تھ
——— برعکس ہوگی اور اس جہان کے خود غرض، مغروروں اور مستکبروں کی بے حساب آسائش کے مقابلہ میں دردناک زندگی ہوگی
اگرچہ سخت اور گلوگیر غذا خود ایک دردناک عذاب ہے لیکن اس کے بعد عذاب الیم کو الگ ذکر کرتا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشا
کرتی ہے کہ آخرت کے عذاب الیم کے ابعاد و جہات اور مختلف پہلو، شدّت و عظمت کے لحاظ سے خدا کے علاوہ کسی اور شخص کو معلوم نہیں
اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن ایک مسلمان اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا، اور پیغمبر کان دھر کر سن رہے تھے کہ اچانک اس شخص
نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ [1]
ایک اور حدیث میں یہ آیا ہے کہ خود پیغمبر اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کی ایسی حالت ہوئی۔ [2]
یہ غذا گلوگیر کیوں نہ ہوگی؟ جبکہ سورۂ غاشیہ کی آیہ ۶ میں یہ آیا ہے: لیس لھم طعام الا من ضریع ؕ

---

[1] " مجمع البیان"، جلد ۱۰ ص ۳۸۰

[2] " روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۰۷

• ان کی غذا جانگداز کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی "۔

اور سورۂ دخان کی آیہ ۴۳، ۴۴ میں یہ آیا ہے: ان شجرت الزقوم طعام الاثیم: " زقوم کا درخت (وہی تلخ، بدبودار بدذائقہ، کڑوا اور مار ڈالنے والا پودا) گنہ گاروں کی غذا ہے۔

اس کے بعد اس دن کی تشریح کرتے ہوئے جس میں یہ عذاب ظاہر ہوں گے، فرماتا ہے: " یہ اس دن ہوگا جس دن زمین اور سب پہاڑ شدت کے ساتھ لرزنے لگیں گے اور پہاڑ اس طرح سے ریزہ ریزہ ہوجائیں کہ ریت کے تودوں کی طرح نرم ہوجائیں گے "۔ (یوم ترجف الارض والجبال وکانت الجبال کثیبًا مھیلًا)۔

" کثیب " تہ بہ تہ پڑی ہوئی ریت (ٹیلہ) کے معنی میں ہے اور " مھیل " ھیل (بروزن کیل) کے مادہ سے، ریت اور آٹے جیسی کسی نرم چیز کو دوسری چیز پر ڈالنا، یہاں وہ نرم ریت مراد ہے جسے کبھی قرار نہیں ہوتا۔

اس معنی کی بناء پر قیامت میں اس طرح سے بکھر جائیں گے کہ ایسی نرم ریت کی صورت اختیار کرلیں گے کہ اگر اس پر پاؤں رکھیں گے تو وہ اس میں دھنس جائیں گے۔

قیامت کے دن کے لیے قرآن نے پہاڑوں کی قسمت کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جو سب کی سب ان کی نابودی اور ان کے نرم خاک میں تبدیل ہوجانے کی حکایت کرتی ہیں (پہاڑوں کی نابودی کے مختلف مراحل کی مزید تشریح اور اس سلسلے میں قرآن کی مختلف تعبیریں سورہ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں آئی ہیں)۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کی بعثت اور منہ زور عربوں کی مخالفت کا موسیٰ بن عمران کے فرعون کے مقابلہ میں قیام سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ہم نے تمھاری طرف ایسا ہی پیغمبر بھیجا ہے، جو تم پر گواہ ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا " (انّا ارسلنا الیکم رسولًا شاھدًا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولًا)۔

اس کا ہدف و مقصد تمھاری ہدایت اور تمھارے اعمال پر نظر رکھنا ہے، جیسا کہ موسیٰ بن عمران کا ہدف فرعون اور فرعونیوں کی ہدایت اور ان کے اعمال پر نظر رکھنا تھا۔

" لیکن فرعون اس رسول کی مخالفت کے لیے کھڑا ہوگیا تو ہم نے بھی اسے شدید عذاب اور سزا میں گرفتار کردیا " (فعصیٰ فرعون الرسول فاخذناہ اخذًا وبیلًا)۔

نہ تو اس کا عظیم لشکر ہی اسے خدا کے عذاب سے بچاسکا اور نہ ہی مملکت کی وسعت اور حکومت کی قدرت اور ان کے دولت مند اس کام کو روک سکے، اور آخر کار وہ سب کے سب نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں ——— جن پر وہ فخر کیا کرتے تھے ——— غرق ہوگئے، تو تم جوان سے بہت ہی پست سطح پر ہو اور تعداد اور تیاری کے لحاظ سے فرعون اور فرعونیوں سے کئی درجے زیادہ ضعیف ہو اپنے بارے میں

۱۔ تفسیر نمونہ جلد ۷

کیا سوچتے ہو؟ اور اس مختصر سے مال اور افراد پر کس طرح سے مغرور ہوتے ہو؟

"و بیل" "وبل" کے مادہ سے اصل میں شدید اور سنگین بارش کے معنی میں ہے اور اس کے بعد ہر شدید و سنگین چیز پر اطلاق ہوا ہے۔ خصوصاً عذاب کے بارے میں اور زیرِ بحث آیت میں بھی شدّتِ عذاب کی طرف ہی اشارہ ہے، گویا لوگوں کو شدید بارش کی طرح طوفان اور بارش میں قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ کے کفار کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے، انھیں اس طرح خبردار کرتا ہے: "اگر تم کافر ہو گئے تو آپ کو خدا کے شدید عذاب سے کس طرح بچا سکو گے، وہ دن تو ایسا ہوگا جو بچّوں کو بوڑھا کر دے گا" (فکیف تتقون ان کفرتم یومًا یجعل الولدان شیبا)۔[۱][۲]

ہاں! اس دن کا عذاب اتنا زیادہ سنگین، شدید، ہولناک اور کمر شکن ہے، جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اور یہ اس کی شدت سے کنایہ ہے۔

آخرت کا عذاب تو آسان ہے، بعض نقل کرتے ہیں کہ اسی دنیا میں بعض اوقات جب انسان حد سے زیادہ شدید سختی اور تنگی سے گزرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلدی اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔

بہرحال اوپر والی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بالفرض اگر تم اس جہان میں فرعونیوں کی طرح نابود کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ بھی ہوئے، تب بھی قیامت اور قیامت کے عذاب کا ذکر کیا کرو گے۔

بعض والی آیت میں اس وحشتناک دن کے بارے میں مزید حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس دن آسمانی کرّے پھٹ جائیں گے اور خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا" (السماء منفطر بہ کان وعدہ مفعولا)۔

قیامت اور "اشراط الساعۃ" کی بہت سی آیات (وہ واقعات جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز میں صورت پذیر ہوں گے) عظیم انفجارات، شدید زلزلوں اور سریع تبدیلیوں کا حال بیان کرتی ہیں جبکہ زیرِ بحث آیت ایک صرف ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب آسمان اور آسمانی کرّے، اس عظمت کے باوجود اس دن کے عظیم حوادث کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے تو اس ضعیف و ناتواں انسان کا کیا ہو سکتا ہے۔[۳]

۱۔ "یومًا" "تتقون" کا مفعول ہے، اور اس دن سے بچنے کا معنی، اس دن کے عذاب سے بچنا ہے۔ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ "تتقون" کا ظرف یا "کفرتم" کا مفعول ہے، لیکن یہ دونوں بعید نظر آتے ہیں۔

۲۔ "شیب" (بر وزن سیب) "اشیب" کی جمع ہے جو "بوڑھے" کے معنی میں ہے اور اصل میں "شیب" (بر وزن عیب) کے مادہ سے لیا گیا ہے اور "شیب" بالوں کے سفید ہونے کے معنی میں ہے۔

۳۔ "منفطر" "انفطار" کے مادہ سے انشقاق اور پھٹ جانے کے معنی میں ہے اور "بہ" کی ضمیر "یوم" کی طرف لوٹتی ہے، یعنی آسمان اس دن کی وجہ سے پھٹ جائے گا (توجہ رہے کہ سماء مذکر کی صورت میں بھی اور مؤنث مجازی کی صورت میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اس بحث کے آخر میں تمام گزشتہ تنبیہوں اور انذاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جو کچھ بیان کیا گیا ہے ، یہ نصیحت اور یاد دلانے کے لیے ہے" (انّ هٰذه تذكرة)۔

تم راستہ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہو: "اور جو شخص چاہے کہ اس کی ہدایت ہو اور وہ سعادتِ ابدی کا طالب ہو تو وہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ انتخاب کرلیتا ہے" (فمن شاء اتخذ الٰی ربه سبيلاً)۔

اگر اس راستہ کو طے کرنا جبر واکراہ کے ذریعہ ہو تو وہ نہ کوئی افتخار کی بات ہے اور نہ ہی فضیلت کی، فضیلت کی بات تو یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اس راستہ کا انتخاب کرے اور پھر اسے طے کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے راہ اور چاہ کی نشاندہی کر دی ہے اور دیکھنے والی آنکھ اور روشنی بخشنے والا سورج اختیار میں دے دیا ہے اور لوگوں کو یہ صلاحیت بخش دی ہے کہ وہ اس کے فرمان کی اطاعت میں ارادہ و اختیار کے ساتھ عمل کریں۔

اس بارے میں کہ " انّ هٰذه تذكرة " (یہ نصیحت اور یاد آوری ہے) کا جملہ کس چیز کی طرف اشارہ ہے ؟ مفسّرین نے کئی احتمال دیئے ہیں: کبھی تو انھوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ان مواعظ کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں اور کبھی یہ کہا گیا کہ یہ پوری سورت کی طرف اشارہ ہے یا تمام قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے یہ حکم نماز اور رات کی عبادت کی طرف اشارہ ہو جو اس سورہ کی پہلی آیات میں آئے ہیں، اور اس میں مخاطب پیغمبر تھے، یہ جملہ چاہتا ہے کہ اسے باقی مسلمانوں کے لیے وسعت دے کر عام کر دے، اس بناء پر بعد والے جملے میں بھی " سبیل " (راستہ) سے مراد نماز تہجد ہی ہے، جو پروردگار کی طرف اہم راستوں میں سے ہے، جیسا کہ سورۂ دہر کی آیہ ۲۶ میں رات کی عبادت کا حکم دینے کے بعد (ومن الليل فاسجد له وسبحه ليلاً طويلاً) مختصر سے فاصلہ کے بعد فرماتا ہے (انّ هٰذه تذكرة فمن شاء اتخذ الٰى ربه سبيلاً) جو بالکل وہی زیرِ بحث آیت ہے[1]

یقیناً یہ ایک مناسب تفسیر ہے لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور اس سورہ میں جتنے انسان ساز پروگرام ہیں تمام کو احاطہ کیے ہوئے ہو، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ایک نکتہ

عذابِ الٰہی کے چار مرحلے

اوپر والی آیات میں مغرور اور نعمت میں مست تکذیب کرنے والوں کو چار دردناک عذابوں کی تہدید کرتا ہے:

طوق اور زنجیریں: (انکال)

جہنم کی جلانے والی آگ (جحیم)

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۱۴۷

سخت گلو گیر ہونے والی مرگبار غذائیں: (وطعامًا ذا غصة)

اور دوسرے انواع و اقسام کے دردناک عذاب جو انسانی فکر میں بھی نہیں آ سکتے: (وعذابًا اليمًا)

یہ سزائیں حقیقت میں اس دنیاوی زندگی میں ان کی وضع وکیفیت کا نقطہ مقابل ہیں۔

ایک طرف ایسی آزادی کا ملنا جس کی کوئی حد اور سرحد نہ ہو

دوسری طرف سے مرفہ اور خوشحال زندگی

تیسری طرف خوشگوار غذائیں اور کھانے

چوتھی طرف سے انواع و اقسام کے آرام اور آسائشیں

اور چونکہ ان تمام چیزوں کو دوسروں کے حقوق پر ظلم و تجاوز اور کبر و غرور اور خدا سے غفلت کی قیمت پر حاصل کیا ہے، لہٰذا وہ قیامت میں اس قسم کی سرنوشت میں گرفتار ہوں گے۔

۲۰۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ
وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ
اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ
عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي
الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا
لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ
وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۰۔ تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہے، رات کی دو تہائی کے قریب یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتے ہیں اور خدا رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم اس کی مقدار کا (دقّت کے ساتھ) اندازہ نہیں کر سکتے، اس لیے اس نے تمھیں بخش دیا، اب تم قرآن کی صرف اتنی ہی مقدار جو تمھارے لیے میسّر ہو، تلاوت کرو، وہ جانتا ہے کہ عنقریب تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہو جائے گا اور ایک گروہ فضلِ خدا حاصل کرنے (اور روزی کمانے کے لیے) سفر پر جائے گا اور ایک گروہ راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ پس جتنی مقدار تمھارے لیے ممکن ہو، اس کی تلاوت کرو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو، اور خدا کو قرضِ حسنہ دو (اس کی راہ میں خرچ کرو) اور (یہ جان لو) کہ جو کارِ خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے اور خدا سے طلبِ مغفرت کرو کہ خدا غفور و رحیم ہے

تفسیر

جتنا تمھارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو

یہ آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے بہت سے ایسے مسائل پر مشتمل ہے جو گزشتہ آیات کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس بارے میں کہ یہ آیت اس سورہ کی ابتدائی آیات کے احکام کی ناسخ ہے، یا یہ ان کی توضیح وتفسیر ہے، اور اسی طرح یہ کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے یا مدینہ میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔

ان سوالات کا جواب آیت کی تفسیر کے بعد واضح ہوجاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اوران لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں، تقریباً رات کی دو تہائی یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتا ہے۔ خدا اس سے آگاہ کیوں نہ ہوگا، جبکہ رات اوردن کا اندازہ وہی کرتا ہے۔ (انّ ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثى الليل ونصفه وثلثه وطائفة من الذين معك والله يقدر الليل والنهار)[1]

یہ اسی حکم کی طرف اشارہ ہے، جو سورہ کے آغاز میں پیغمبر کو دیا گیا ہے صرف ایک چیز جس کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس عبادت شبانہ میں مومنین کا ایک گروہ بھی پیغمبر کے ہمراہ ہوتا تھا (ایک استحبابی حکم کے عنوان سے یا احتمالاً ایک وجوبی حکم کی بناء پر، کیونکہ آغازِ اسلام کے حالات کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ تلاوتِ قرآن کے ذریعہ، جو انواع واقسام کے اعتقادی، عملی اور اخلاقی درسوں پر مشتمل ہے، اور اسی طرح عبادات شبانہ کے ذریعہ اپنی تربیت اور اصلاح کریں، اور اسلام کی تبلیغ اور اس کے دفاع کے لیے خود کو آمادہ اور تیار کریں)

لیکن جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، بہت سے مسلمان ایک تہائی، آدھی رات اور دو تہائی رات کا حساب رکھنے میں مشکل اور دردسری میں گرفتار ہوجاتے ہیں (کیونکہ اس زمانے میں وقت کی مقدار اور اندازہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا) اور اسی بناء پر وہ مجبوراً احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس وجہ سے کبھی تو وہ ساری رات بیدار رہتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاؤں عبادتِ شبانہ کے قیام میں ورم کر جاتے ہیں۔

لہٰذا خدا نے ان پر اس حکم میں تخفیف کردی اور فرمایا: وہ جانتا ہے کہ تم مذکورہ مقدار کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے، اس بناء پر اس نے تمھیں بخش دیا ہے۔ لہٰذا اب قرآن میں سے جتنی مقدار تمھارے لیے میسر اور آسان ہو اتنی تلاوت کرو" (علم ان لن تحصوه فتاب عليكم فاقرءوا ما تيسر من القران)۔

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "نصفه" اور "ثلثه" کا عطف "ادنیٰ" پر ہے نہ کہ "ثلثی اللیل" پر اس بناء پر اس جملہ کا مفہوم یہ ہے تقریباً رات کی دو تہائی یا ٹھیک آدھی رات کی مقدار یا ایک تہائی رات، ضمنی طور پر توجہ کرنی چاہیے کہ لفظ "ادنیٰ" عام طور پر نزدیک مکان کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں قریبی زمانہ کی طرف اشارہ ہے۔

"لن تحصوه" "احصاء" کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، یعنی تم پورے طور پر دقت کے ساتھ رات کا وقت دو تہائی، آدھی رات اور ایک تہائی کی مقدار کے لحاظ سے تعین نہیں کر سکتے اور زحمت میں پڑ جاتے ہو۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس کام پر سال کے سارے دنوں میں مداومت نہیں کر سکتے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں بھی جب کہ کئی وسائل کے ذریعہ موقع پر نیند سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ سارے سال میں ان مقداروں کی دقت کے ساتھ تعین ——— خصوصاً رات اور دن میں مسلسل فرق پڑتے رہنے کے ساتھ ——— کوئی آسان کام نہیں ہے

"تاب علیکم" کے جملہ کو اکثر مفسرین نے "اس تکلیف اور ذمہ داری کی تخفیف" کے معنی میں بیان کیا ہے، نہ کہ "گناہ سے توبہ" کے معنی میں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جب وجوب کا حکم اٹھ جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور نتیجہ میں خدا کی بخشش کے مانند ہوگا۔

اس بارے میں کہ "فاقرءوا ما تیسر من القراٰن" "جو کچھ قرآن میں سے تمھارے لیے میسر پڑھو" کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے اس کی نماز تہجد سے تفسیر کی ہے، کیونکہ اس میں حتمی طور پر قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہی تلاوتِ قرآن ہے، چاہے وہ نماز کے اندر نہ ہو، اس کے بعد بعض نے اس کی مقدار پچاس آیات، بعض نے سو آیات اور بعض نے دو سو آیات کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی تعداد کے لیے کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جتنی مقدار سے انسان زحمت و تکلیف میں نہ پڑے اتنا قرآن پڑھے۔

یہ بات واضح ہے کہ "تلاوتِ قرآن" سے مراد یہاں وہ تلاوت ہے، جو درس و خودسازی اور ایمان و تقویٰ کی پرورش میں تعلیم کے عنوان سے ہو۔

اس کے بعد اس تخفیف کے لیے ایک اور دلیل کے بیان کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا جانتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہوں گے اور دوسرا گروہ تحصیل معاش اور خدا کے فضل کی تلاش میں سفر کی راہ اختیار کرے گا اور تیسرا گروہ راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ یہ امور اس چیز سے مانع ہوں گے کہ رات کی عبادت کو اس حساب اور نصاب سے جو پہلے معین ہوا ہے، ہمیشہ کے لیے انجام دیتے رہیں" (علم ان سیکون منکم مرضٰی واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ واٰخرون یقاتلون فی سبیل اللہ)۔

اور یہی چیز اس پروگرام میں تخفیف کا ایک سبب ہے لہٰذا دوبارہ تکرار کرتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو جس قدر تمھارے لیے ممکن ہے اور جتنی تم میں طاقت ہے بس اتنا رات کو قرآن کی تلاوت کرو" (فاقرءوا ما تیسر منہ)۔

یہ بات واضح ہے کہ بیماری اور ضروری سفروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کا ذکر، نمایاں عذروں کی تین مثالوں میں سے ہے۔ لیکن انھیں تک منحصر نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ خدا جانتا ہے کہ تم دن میں زندگی کے مختلف مشکلات میں گرفتار ہوگے اور یہ چیز اس سنگین پروگرام کو دائمی رکھنے میں مانع ہے۔ لہٰذا اس نے تمھارے لیے اس میں تخفیف کر دی ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ حکم، اس چیز کو، جو سورہ کے آغاز میں آئی ہے، منسوخ کرتا ہے؟ یا اس کے لیے استثنائی صورت میں ہے؟ آیات کا ظاہر حکم سابق کے نسخ کو بتاتا ہے۔ حقیقت میں یہ بات ضروری تھی کہ یہ پروگرام ایک مدت تک جاری رہے، اور وہ

جاری رہا، اور اس حکم کا مقصد، جو ایک موقت اور فوق العادۃ پہلو رکھتا تھا وہ حاصل ہوگیا اور اس مدت کے ختم ہونے کے بعد تخفیف صورت میں باقی رہ گیا، کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ معذور افراد کے موجود ہونے کی وجہ سے، اس حکم کی سب کے لیے تخفیف ہوگئی، نہ کہ صرف معذور لوگوں کے لیے، اس طرح سے یہ استثناء نہیں ہوسکتی، بلکہ اسے نسخ ہونا چاہیے (غور کیجیے)

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ: کیا قرآن میں سے ممکن مقدار کی تلاوت، جس کا اس آیت میں دو مرتبہ امر ہوا ہے، واجب ہے، یا مستحب ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ یقینی طور پر مستحب ہے اور بعض نے وجوب کا احتمال دیا ہے، کیونکہ قرآن کی تلاوت، توحید کے دلائل، ارسال رسل اور اس آسمانی کتاب کے اعجاز سے آگاہی اور باقی واجبات دین کی تعلیم حاصل کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس بناء پر تلاوت قرآن مقدمہ واجب ہے لہٰذا یہ واجب ہوگیا۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ اس صورت میں ضروری نہیں ہے کہ قرآن کو رات کو ہی پڑھے، یا نماز تہجد کے درمیان پڑھے۔ بلکہ ہر مکلّف (بالغ و عاقل) پر واجب ہے کہ بمقدار لازم، تعلیم و تربیت اور اصول و فروع اسلام سے آگاہی کے لیے، اور اسی طرح قرآن کو محفوظ رکھنے اور اسے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے، تلاوت کرے، بغیر اس کے کہ کوئی خاص وقت اور زمانہ اس میں پیش نظر ہو۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ " فاقرءوا ....." کے جملہ میں ظاہر امر وجوب ہے (جیسا کہ اصول فقہ میں بیان ہوا ہے)۔ مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ " امر" عدم وجوب پر فقہاء کے اجماع کی بناء پر ایک امر استحبابی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آغاز اسلام میں تو حالات و شرائط کی بناء پر یہ تلاوت اور شبانہ عبادت واجب تھی اور بعد میں مقدار کے لحاظ سے بھی اور حکم کے لحاظ سے بھی اس میں تخفیف کردی گئی ہے اور اس نے ایک استحبابی حکم کی صورت اختیار کرلی ہے اور وہ بھی اتنا جتنا کہ آسانی سے ہوسکے، لیکن بہرحال پیغمبر اسلام پر نماز تہجد کا وجوب آخر عمر تک ثابت رہا۔ (تمام آیات قرآن اور روایات کے قرینہ سے)۔

ایک روایت میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

" دو تہائی رات یا آدھی رات یا ایک تہائی رات سے مربوط حکم منسوخ ہوگیا ہے، اور اس کی جگہ " فاقرءوا ما تیسر من القرآن " قرار پایا ہے" [۱]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں تین قسم کے عذر بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک تو جسمانی پہلو رکھتا ہے (بیماری) اور دوسرا مالی پہلو رکھتا ہے (معاش کے لیے مسافرت) اور تیسرا دینی جنبہ رکھتا ہے (راہ خدا میں جہاد) لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی تلاش اور اس کے لیے کوشش کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کے ہم ردیف ہے۔

اور اس جملہ کو اس بات کی بھی ایک دلیل سمجھا ہے کہ خاص یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ مکہ میں جہاد کا وجوب نہیں تھا، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ فرماتا ہے: سیکون: (عنقریب ہوگا) ممکن ہے یہ جملہ آئندہ زمانہ میں تشریع جہاد کی خبر ہو یعنی چونکہ کچھ عذر تو تم زمانۂ حال میں رکھتے ہو اور کچھ اور عذر آئندہ تمہارے لیے پیدا ہوں گے۔ اس لیے یہ حکم دائمی صورت میں نہیں آیا اور اس صورت میں

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۵۱

آیت کے مکی ہونے کے ساتھ تضاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد اس آیت کے آخر میں چار اور احکام کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود سازی کا جو پروگرام پیش کیا گیا تھا، اس کی اس چیز کے ذریعہ تکمیل کرتا ہے فرماتا ہے: "نماز قائم کرو، زکوٰت ادا کرو، اور مستحب انفاق کرنے سے خدا کو قرض حسنہ دو، اور (یہ جان لو) کہ جو کار ہائے خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے"۔

(واقیموا الصلٰوۃ واٰتوا الزکٰوۃ واقرضوا اللہ قرضًا حسنًا وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ھو خیرًا واعظم اجرًا)۔

"اور استغفار کرو اور خدا سے بخشش طلب کرو کہ خدا غفور و رحیم ہے"۔

(واستغفروا اللہ ان اللہ غفور رحیم)۔

یہ چاروں حکم (نماز، زکوٰت، مستحب انفاق اور استغفار) تلاوت کے حکم اور قرآن میں تدبر کے ضمیمہ کے ساتھ —— جو ما قبل کے جملوں میں بیان ہوا تھا —— مجموعی طور پر خود سازی کا ایک مکمل پروگرام پیش کرتے ہیں، جو ہر عصر اور زمانہ میں خصوصاً آغازِ اسلام میں ناقابلِ انکار تاثیر رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔

یہاں "نماز" سے مراد پنجگانہ نمازیں ہیں اور "زکوٰۃ" سے مراد زکوٰۃ واجب ہے اور "قرضِ حسنہ" دینے سے مراد وہی مستحب انفاق اور خرچ ہیں، اور یہ انتہائی بزرگوارانہ تعبیر ہے جس کا اس سلسلہ میں تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تمام ملکیتوں کا مالک اس شخص سے قرض مانگ رہا ہے، جس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے، تاکہ اس طریقہ سے انفاق و ایثار اور اس عملِ خیر کے ذریعہ کسبِ فضیلت کا شوق بڑھے اور اس طریقہ سے اس کی تربیت ہو اور وہ تکامل و ارتقاء حاصل کرے۔

ان احکام کے آخر میں استغفار کا ذکر، ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان اطاعتوں کی انجام دہی کی وجہ سے خود کو انسان کامل سمجھ بیٹھو، اور اصطلاح کے مطابق خود کو طلب گار تصور کرنے لگو، بلکہ تمہیں ہمیشہ اپنے آپ کو مقصر شمار کرنا چاہیے اور بارگاہِ خدا میں عذر و معذرت کرتے رہنا چاہیے، ورنہ جو کچھ اس کی خداوندی کے لائق اور سزاوار ہے وہ کوئی شخص بھی بجا نہیں لا سکتا۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ان احکام پر اس لیے تکیہ کیا گیا ہے تاکہ یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ اگر شبانہ قیام اور تلاوتِ قرآن میں تخفیف کر دی گئی ہے تو باقی پروگراموں اور دینی احکام میں بھی اثر انداز ہوگی، بلکہ وہ اسی طرح اپنی حالت پر باقی ہیں۔[1]

ضمنی طور پر زکوٰۃ واجب کے ذکر کو یہاں اس آیت کے مدنی ہونے کی ایک اور دلیل قرار دیتے ہیں، کیونکہ زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔ لیکن بعض نے کہا ہے، اصل حکم زکوٰۃ مکہ میں ہی نازل ہوا تھا لیکن اس کا نصاب اور اس کی مقدار بیان نہیں ہوئے تھے، وہ چیز جو مدینہ میں تشریع ہوئی وہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا مسئلہ تھا۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۱۵۶

چند نکات

عقیدت کے ساتھ علمی آمادگی کی ضرورت

اہم اجتماعی کاموں کو انجام دینے کے لیے ——— خاص طور پر زندگی کے تمام حالات میں ایک وسیع و عریض انقلاب پیدا کرنے کے لیے ——— ہر چیز سے پہلے ایک انسانی پختہ اور مصمم طاقت کی ضرورت ہے، جو اس کام کے لیے، راسخ اعتقاد، مکمل آگاہی، ضروری علمی و فکری تعلیمات اور اخلاقی تربیت کے ساتھ بنی ہو۔

اور یہ ایسا دقیق کام تھا جسے پیغمبر اسلام نے، مکہ میں بعثت کے ابتدائی سالوں میں، بلکہ اپنی عمر کے سارے عرصہ میں انجام دیا اور اسی بناء پر، اور اسی محکم بنیاد کی وجہ سے، اسلام کے پودے نے سرعت کے ساتھ نشوونما پائی، کونپلیں پھوٹیں اور شاخ و برگ نکالے۔

جو کچھ اس سورہ میں آیا ہے، وہ اس حساب شدہ اور نپے تلے پروگرام کا ایک زندہ اور بہت ہی منہ بولتا نمونہ ہے، دو تہائی رات یا کم از کم ایک تہائی رات کے حکم عبادت نے ——— جو تلاوت اور قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کے ساتھ توام تھی ——— مسلمانوں کی روح میں عجیب و غریب تاثیر پیدا کر دی اور انھیں "قول ثقیل" اور "سبح طویل" کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ یہ رات کی حرکات اور "شبانہ ناشئات" جو قرآنی تعبیر کے مطابق "اشد وطئًا" اور "اقوم قیلًا" ہیں، آخر کار انھوں نے اپنا کام دکھایا اور محروم عوام اور مستضعف طبقات کا ایک چھوٹا سا گروہ اس طرح کا بن گیا کہ انھوں نے جہان کے ایک عظیم حصہ پر حکومت کرنے کی لیاقت پیدا کر لی۔

اور آج بھی اگر ہم مسلمان چاہیں کہ اپنی دیرینہ عظمت و قدرت کو دوبارہ حاصل کر لیں تو وہ راستہ یہی راستہ ہے اور وہ پروگرام یہی پروگرام ہے ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم ایسے افراد کے ساتھ، جو فکر و نظر اور ایمان کے لحاظ سے ضعیف و ناتواں ہیں، ایسے افراد جنھوں نے ضروری علمی اور اخلاقی تربیت حاصل نہیں کی ہے، "یہودیوں" کے تسلط اور غلبہ کو اسلامی ممالک کے اندر سے باہر نکال پھینکیں گے اور چھوٹی جنایتکار سپر طاقتوں کے ہاتھ کو اسلامی ممالک تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے، لیکن "آنجا کہ کس است یک حرف بس است"

۲۔ غور و فکر کے ساتھ تلاوت قرآن

روایات اسلامی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت قرآن کی فضیلت زیادہ پڑھنے سے نہیں ہے بلکہ اچھی طرح سے پڑھنے اور اس میں سوچ بچار اور غور و فکر کرنے سے ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت کے ذیل میں، جو یہ حکم دیتی ہے کہ قرآن میں سے جتنا تمھارے لیے میسر ہے، اتنا پڑھو" فاقرءوا ما تیسر منہ" ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضا سے آئی ہے کہ آپ نے اپنے جد امجد سے اس طرح نقل فرمایا ہے:

ماتیسر منہ لکم فیہ خشوع القلب وصفاء السر

"بس اتنا پڑھو جس میں خشوع قلب، صفائے باطن اور روحانی و معنوی نشاط حاصل ہو"[1]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تلاوت کا ہدف اور مقصد اصلی تعلیم و تربیت ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۸۲

اور اس سلسلہ میں روایات بہت ہیں۔

۲۔ معاش کی تلاش جہاد کے ہمردیف

اوپر والی آیت میں ـــــ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے ـــــ زندگی بسر کرنے کے لیے تلاش معاش کو "جہاد فی سبیل اللہ" کے ساتھ قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام اس موضوع کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، حالانکہ ایک فقیر، بھوکی اور دوسروں کی محتاج قوم ہرگز استقلال، عظمت اور سربلندی حاصل نہیں کرپائے گی اور اصولی طور پر "جہاد اقتصادی" " دشمن کے ساتھ جہاد" کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلہ میں مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کا ایک جملہ نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ایما رجل جلب شیئًا الی مدینة من مدائن المسلمین، صابرًا محتسبا، فباعه بسعر یومه، کان عند الله بمنزلة الشهداء، ثم قرأ "واٰخرون یضربون فی الارض"۔۔۔۔

جو شخص کچھ مال مسلمانوں کے کسی شہر میں لے جائے اور اس راہ میں اپنی زحمتوں کو خدا کے لیے محسوب کرے اور پھر اس کو اس دن کی عادلانہ قیمت میں فروخت کردے تو ایسا شخص خدا کی بارگاہ میں شہیدوں کی منزلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سورۂ مزمل کی آخری آیت کے اس جملہ کو شاہد کے عنوان سے تلاوت کیا "واٰخرون یضربون فی الارض"[1]

خداوندا! ہمیں تمام ابعاد و جہات میں جہاد کرنے کی توفیق عطا فرما۔

بارالٰہا! ہم سب کو رات کے قیام، اور قرآن کریم کی تلاوت اور اس آسمانی کتاب کے نور کے سایہ میں اپنی اصلاح کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمارے اسلامی معاشرے کو اس مضامین سے پر سورہ سے ہدایت حاصل کرنے کے ساتھ شائستہ مقام اور دیرینہ عظمت تک پہنچا!

آمین یا رب العالمین

اختتام سورۂ مزمل

اول ماہ صفر ۱۴۰۷، ۸۵/۷/۱۴

اختتام ترجمہ

بروز منگل بوقت تقریبًا ساڑھے چار بجے سہ پہر ۵ صفر ۱۴۰۸ھ

مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۸۱/ای ماڈل ٹاؤن - لاہور

---

[1] "مجمع البیان" "تفسیر ابوالفتوح رازی" "تفسیر قرطبی" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ ضمنی طور پر ایک دوسری حدیث سے جو اس حدیث کے مشابہ ہے اور تفسیر قرطبی میں رسول اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی، بلکہ یہ پیغمبر سے لی تھی۔

سورۂ مُدّثّر

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۵۶ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲ر صفر ۱۴۰۷ ہجری

سورۂ مدثر کے مضامین

اس میں شک نہیں کہ یہ سورہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ کیا یہ وہ پہلی سورت ہے جو پیغمبر پر نازل ہوئی ہے یا یہ سورۂ اقراء کے بعد نازل ہوئی ہے۔

لیکن سورہ "اقرأ" اور "سورۂ مدثر" کے مضامین میں غور و خوض کرنے سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ "اقراء" آغازِ دعوت میں نازل ہوئی تھی، اور سورۂ مدثر اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب پیغمبر آشکار دعوت پر معمور ہوئے، اور پوشیدہ اور پنہاں دعوت کا دور ختم ہوا، لہٰذا بعض نے کہا ہے کہ سورہ "اقراء" وہ پہلا سورہ ہے جو آغازِ بعثت میں نازل ہوئی اور سورۂ "مدثر" وہ پہلا سورہ ہے جو آشکارا دعوت کے بعد ہے اور یہ بات بہت اچھی نظر آتی ہے۔

بہرحال مکی سورتوں کا مزاج وطبیعت۔ جو مبداء ومعاد کی دعوت اور شرک سے مبارزہ اور مخالفین کو عذاب الٰہی کا انذار اور تھدید ہے۔ اس سورہ میں مکمل طور سے منعکس ہے۔

اس سورہ کے مباحث مجموعی طور سے سات محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر کو قیام، انذار، آشکار تبلیغ کی دعوت اور اس راہ میں صبر و استقامت اور اس کام کے لیے ضروری آمادگیوں کی تیاری۔

۲۔ قیامت کی طرف اشارہ، دوزخیوں کی صفات، وہی جو قرآن سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور جنھوں نے حق کا مذاق اڑایا۔

۳۔ کافروں کو ڈرانے کے ساتھ دوزخ کی خصوصیات کا ایک حصہ۔

۴۔ بار بار کی قسموں کے ذریعہ امرِ قیامت پر تاکید۔

۵۔ ہر انسان کی سرنوشت کا اس کے اعمال کے ساتھ ربط اور اس سلسلہ میں ہر قسم کے غیر منطقی افکار کی نفی۔

۶۔ جنتیوں اور دوزخیوں کی بعض خصوصیات اور ان میں سے ہر ایک کی سرنوشت۔

۷۔ جاہل، بے خبر، مغرور اور خود غرض لوگوں کے حق سے فرار کی کیفیت۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامی اسلامؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من قرأ سورة المدثر اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدّق بمحمد (ص) وکذب به بمکة

"جو شخص سورۂ مدثر کو پڑھے گا، اسے ان لوگوں کی تعداد میں جنھوں نے مکہ میں پیغمبر اسلامؐ کی تصدیق یا تکذیب کی تھی، دس نیکیاں دی جائیں گی"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

من قرأ فی الفریضة سورة المدثر کان حقا علی الله ان یجعله مع محمد (ص) فی درجته، ولا یدرکه فی حیاة الدنیا شقاء ابدًا

"جو شخص سورۂ مدثر کو واجب نماز میں پڑھے تو خدا پر حق ہے کہ اس کو پیغمبرؐ کے ہمراہ ان کے جوار میں اور ان کے درجہ میں قرار دے اور دنیاوی زندگی میں بدبختی اور رنج و تکلیف اسے دامن گیر نہ ہو"[2]

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے نتائج صرف سورہ کے الفاظ پڑھنے پر مترتب نہیں ہوں گے بلکہ ضروری ہے کہ سورہ کے مضامین کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

[1،2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۸۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ یٰۤاَیُّھَا الۡمُدَّثِّرُ ○
۲۔ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ○
۳۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ○
۴۔ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرۡ ○
۵ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ○
۶۔ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ○
۷ وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ○
۸ فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ ○
۹۔ فَذٰلِكَ یَوۡمَئِذٍ یَّوۡمٌ عَسِیۡرٌ ○
۱۰۔ عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ غَیۡرُ یَسِیۡرٍ ○

ترجمہ

شروع اللہ رحمن ورحیم کے نام سے

۱۔ اے بسترِ خواب میں آرام کرنے والے
۲۔ اٹھ کھڑا ہو اور انذار کر (اور عالمین کو ڈرا)
۳۔ اور اپنے پروردگار کی بزرگی بیان کر
۴۔ اور اپنے لباس کو پاک کر

۵۔ اور پلیدگیوں سے پرہیز کر۔
۶۔ اور کسی پر منت نہ رکھ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کر۔
۷۔ اور اپنے پروردگار کے لیے صبر کر۔
۸۔ جس وقت صور پھونکا جائے گا۔
۹۔ وہ دن بہت ہی سخت دن ہوگا۔
۱۰۔ اور کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

تفسیر

اٹھ اور عالمین کو ڈرا !

اس میں شک نہیں کہ ان آیات میں مخاطب خود پیغمبرؐ کی ذات ہے۔ اگرچہ اس بات کی ان میں صراحت نہیں ہوئی۔ ہے۔ لیکن ان آیات میں موجود قرائن اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اے بستر خواب میں آرام کرنے والے اور اے چادر اوڑھ کر سونے والے" (یا ایھا المدثر)۔

"اٹھ کھڑا ہو اور انذار کر اور عالمین کو ڈرا" (قم فانذر)۔

کیونکہ سونے اور آرام کرنے کا وقت گزر گیا ہے اور قیام و تبلیغ کا زمانہ آگیا ہے۔

خصوصیت کے ساتھ انذار پر تکیہ، حالانکہ پیغمبرؐ "بشیر" بھی ہیں اور "نذیر" بھی۔ اس بناء پر ہے، چونکہ "انذار" خصوصیت کے ساتھ کام کے آغاز میں، سوئی ہوئی ارواح کو بیدار کرنے میں، زیادہ عمیق اور گہری تاثیر رکھتا ہے۔

اس بارے میں کہ پیغمبر بستر میں کیوں آرام کر رہے تھے، کہ اس خطاب نے آپ کو قیام کی دعوت دی، مفسرین نے بہت سے احتمال دیئے ہیں۔

۱۔ مشرکین عرب موسم حج کے قریب جمع ہوئے اور ان کے سرداروں مثلاً ابوجہل، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث وغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ باہر سے مکہ میں آنے والے لوگوں کے سوالات کے مقابلہ میں، جنھوں نے اِدھر اُدھر سے پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے سلسلہ میں مختلف مطالب سُنے ہیں کیا کہیں؟

اگر ہر ایک الگ الگ جواب دینا چاہے، ایک اسے کاہن کہے، دوسرا مجنون کہے، تیسرا ساحر کہے تو یہ اختلاف رائے اچھا اثر نہ چھوڑے گا لہٰذا ضروری ہے کہ پیغمبر کے برخلاف پروپیگنڈے کی جنگ میں متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ بحث و گفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے بہتر یہ ہے

کہ وہ سب کے سب اسے "ساحر" کہیں، کیونکہ "جادو" کے واضح آثار میں سے ایک بیوی اور شوہر اور باپ اور بیٹے کے درمیان جدائی ڈالنا ہے اور پیغمبر نے دین اسلام کو پیش کر کے اس قسم کا کام انجام دیا ہے۔

یہ بات پیغمبر کے کان تک پہنچی تو آپ کو بہت دکھ ہوا اور بیماروں کی طرح غمگین حالت میں گھر میں آئے اور بستر میں لیٹ گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور آپ کو قیام اور مبارزہ کی دعوت دی۔

۲۔ یہ آیات وہ پہلی آیات تھیں جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوئیں، کیونکہ "جابر بن عبداللہ" کے واسطہ سے پیغمبر سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں کوہ حرا پر تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی اور کہا، اے محمدؐ! "تو خدا کا رسول ہے"۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی، میں نے اپنے سر کے اوپر دیکھا، تو ایک فرشتے کو عرش پر آسمان و زمین کے درمیان دیکھا، میں ڈر گیا اور خدیجہ کی طرف لوٹ آیا، اور میں نے کہا: "مجھ پر کپڑا ڈال دو، مجھ پر کپڑا ڈال دو اور ٹھنڈا پانی مجھ پر ڈالو" یہ وہ منزل تھی کہ جبرئیل مجھ پر نازل ہوئے اور "یا ایھا المدثر" لائے۔"

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کی آیات آشکار دعوت کو بیان کر رہی ہیں، اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آیات کم از کم تین سال تک پوشیدہ طور سے دعوت کرنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اور یہ بات اس چیز سے جو اوپر والی روایت میں بیان کی گئی ہے ساز گار نہیں ہے۔ مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ اس سورہ کی چند ابتدائی آیات آغاز دعوت میں نازل ہوئی تھیں اور بعد والی آیات چند سال کے بعد سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ پیغمبر سوئے ہوئے تھے اور اوپر چادر لی ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور آپ کو بیدار کیا اور یہ آیات آپ کے سامنے پڑھیں کہ اٹھ جائیے اور بستر اور نیند سے کنارہ کشی کیجیے اور رسالت اور پیغام الٰہی کو انجام دیجیے۔

۴۔ کپڑا اوڑھنے سے مراد ظاہری کپڑا نہیں ہے، بلکہ لباس نبوت و رسالت ہے۔ جیسا کہ پرہیزگاری کو "لباس التقوٰی" کہا گیا ہے۔

۵۔ "مدثر" سے مراد ایسا شخص ہے جس نے گوشہ عزلت اختیار کر لیا ہو اور علیحدگی اور تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہو، اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ عزلت اور گوشہ نشینی سے باہر نکل آؤ اور مخلوق کو انذار اور خدا کے بندوں کو ہدایت کرو۔

ان سب تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "فانذر" (انذار کرو) کا جملہ یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز سے ڈراؤ؟ اور کس موضوع میں انذار کرو؟ اور یہ حقیقت میں عمومیت کے بیان کے لیے ہے، یعنی بت پرستی، شرک و کفر، ظلم و بیدادگری اور فساد و عذاب الٰہی اور حساب محشر وغیرہ کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرو، (اور اصطلاح کے مطابق متعلقہ بات کا محذوف ہونا، عمومیت پر دلالت کرتا ہے) ضمنی طور پر یہ عذاب دنیا کو بھی شامل ہے اور عذاب آخرت کو بھی اور انسان کے اعمال کے برُے نتائج کو بھی جو اسے دامن گیر ہوں گے۔

اور قیام و انذار کی دعوت کے بعد پیغمبر اسلامؐ کو پانچ حکم دیتا ہے، جو دوسروں کے لیے ایک نمونہ ہیں، ان میں سے پہلا حکم توحید کے بارے میں ہے۔ فرماتا ہے: "صرف اپنے پروردگار کو بڑا سمجھ" (وربک

فکبّر) ۱؎

وہی خدا جو تیرا مالک و مربی ہے اور جو کچھ تیرے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے۔
تو اس کے غیر کو بالکل بھول جا اور تمام جھوٹے معبودوں پر سرخ لکیر پھیر دے، اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کے آثار کو محو کر دے۔
لفظ "رب" پر تکیہ اور اس کو "کبر" پر مقدم رکھنا انحصار کی دلیل ہے، اس مختصر سی عبارت میں مسئلہ توحید کو دلیل کے ذکر کے ساتھ پیش کرتا ہے، قرآن کی تعبیریں کتنی عمدہ اور مضامین سے پُر ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں یہ سب معنی بیان ہو گئے ہیں۔
"فکبّر" کے جملہ سے مراد صرف "اللہ اکبر" کہنا نہیں ہے ـــــ اگرچہ اللہ اکبر بھی کہنا اس کا ایک معنی ہے، جس کی طرف روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے ـــــ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے خدا کو اعتقاد کے لحاظ سے بھی عمل کے لحاظ سے بھی اور گفتگو میں بھی بڑا سمجھو، اور اس کو اوصاف جمال کے ساتھ متصف اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزّہ جان، بلکہ اس کو اس سے برتر سمجھ کہ اس کی تعریف و توصیف ہو سکے، جیسا کہ روایات اہل بیت میں آیا ہے کہ "اللہ اکبر" کا معنی یہ ہے کہ خدا اس سے برتر ہے کہ اس کی توصیف ہو سکے، اور وہ فکر انسانی میں سما سکے، اس بناء پر "تکبیر"، "تسبیح" کی نسبت زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو صرف ہر قسم کے نقص و عیب سے تنزیہ کو شامل ہوتی ہے۔
مسئلہ توحید کے بعد دوسرا حکم آلودگیوں سے پاکیزگی کے بارے میں دیتے ہوئے مزید کہتا ہے، "اور اپنے لباس کو پاک کر"۔

(وثیابک فطھّر)۔

"لباس" کی تعبیر ممکن ہے انسان کے عمل سے کنایہ ہو، کیونکہ ہر شخص کے اعمال، اس کے بمنزلہ لباس ہیں، اور اس کا ظاہر اس کے باطن کو بیان کرتا ہے۔
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں لباس سے مراد دل، روح اور جان ہے، یعنی اپنے دل کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر، جہاں لباس کو پاک ہونا چاہیے، تو صاحب لباس اولیت رکھتا ہے کہ وہ پاک ہو۔
بعض نے اسی ظاہری لباس کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے۔ کیونکہ لباس کے ظاہر کی پاکیزگی کسی کی شخصیت کے اہم ترین ہونے اور انسان کی تربیت اور تہذیب و تمدن کی نشانی ہے۔ خصوصاً زمانۂ جاہلیت میں بہت کم لوگ غلاظت سے اجتناب کرتے تھے اور بہت ہی گندا لباس رکھتے تھے خصوصاً معمول یہ تھا (جیسا کہ اس آخری زمانۂ جاہلیت میں گرفتار شدہ افراد میں بھی یہی معمول ہے) کہ لباس کے دامن کو بہت بڑا کرتے ہیں، اس طرح کہ وہ زمین پر کھنچتا ہے اور آلودہ ہو جاتا ہے، اور یہ جو بعض روایات میں امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: آیت کا معنی یہ ہے کہ ثیابک فقصّر (اپنے لباس کو چھوٹا کر) ۲؎ یہ بھی اسی معنی کو بیان کرتا ہے۔
بعض نے اس کی بیویوں کے ساتھ تفسیر کی ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے تم اپنی بیویوں کا لباس ہو اور وہ بھی تمہارا لباس ہیں (کیونکہ تم ایک دوسرے کی آبرو کی حفاظت کرتے ہو اور ایک دوسرے کی زینت ہو) (ھن لباس لکم و انتم لباس لھن) (بقرہ آیہ ۱۸۷)

۱؎ "فکبّر" میں "فا" بعض کے نظریہ کے مطابق زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق "شرط" کے معنی کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے اور جملہ کا معنی اس طرح ہے، چاہے جو واقعہ اور حادثہ پیش آئے، خدا کے بڑا ہونے کو نہ بھول جانا (بعد والی آیات کے بارے میں بھی یہی گفتگو ہے)

۲؎ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۸۵

ان معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

حقیقت میں آیت کا اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رہبرانِ الٰہی کی باتیں اسی وقت نفوذ کر سکتی ہیں جبکہ ان کا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو اور ان کا تقویٰ و پرہیزگاری ہر لحاظ سے مسلم ہو، اسی لیے قیام و انذار کے بعد پاکدامنی کا حکم دیتا ہے

تیسرے حکم میں فرماتا ہے: "ناپاکیوں سے اور ان چیزوں سے جو عذابِ الٰہی کا موجب ہیں پرہیز کر" والرجز فاهجر)۔

رجز (پلیدگی) کے مفہوم کی وسعت کے سبب اس کے لیے گوناگوں تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

کبھی اس کی بتوں کے ساتھ، کبھی ہر قسم کی معصیت و نافرمانی کے ساتھ، کبھی قبیح و ناپسندیدہ اخلاق کے ساتھ، کبھی محبت دنیا کے ساتھ جو ہر گناہ اور خطا کا سرچشمہ ہے، کبھی عذاب الٰہی کے ساتھ جو شرک و معصیت کا نتیجہ ہے اور کبھی ہر اس چیز کے معنی میں جو انسان کو خدا سے غافل کر دیتی ہے، تفسیر کی ہے۔ نکتہ اصلی یہ ہے کہ "رجز" اصل میں اضطراب و تزلزل کے معنی میں ہے[1] اور اس کے بعد ہر قسم کے گناہ، شرک، بت پرستی، شیطانی وسوسوں، اخلاق ذمیمہ اور عذاب الٰہی کے لیے ـــــ جو انسان کے اضطراب کا سبب بنتے ہیں اور اس کو صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں، اطلاق ہونے لگا۔

حالانکہ بعض اس لفظ کا معنی "عذاب" کرتے ہیں[2]۔ اور چونکہ شرک و گناہ، برے اخلاق اور دنیا کی محبت عذابِ الٰہی کو جلب کرتے ہیں، لہٰذا ان پر بھی "رجز" کا اطلاق ہونے لگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "رجز" (بروزن شرک) عام طور پر عذاب کے معنی میں آیا ہے[3]

بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ "رجز" اور "رجس" جو "پلیدگی" کے معنی میں ہیں، دونوں مترادف اور ہم معنی ہیں[4]

یہ تینوں معانی اگرچہ آپس میں مختلف ہیں، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ارتباط رکھتے ہیں۔ بہر حال آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ہر طرح کے انحراف، پلید اور قبیح عمل اور ہر اس کام کو جو دنیا و آخرت میں خدا کے غیظ و غضب اور اس کے عذاب کا موجب ہو، شامل ہے۔

مسلّمہ طور پر پیغمبر اسلام نبوت سے پہلے بھی ان امور سے پرہیز کرتے تھے اور ان سے دوری رکھتے تھے اور آپ کی زندگی کی تاریخ بھی جس کے دوست و دشمن سب ہی معترف ہیں، اس پر گواہ ہیں، لیکن یہاں دعوت الی اللہ کی راہ میں ایک اساسی اور بنیادی اصل کے عنوان سے بھی اور سب کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ کے عنوان سے بھی، اس پر تکیہ ہوا ہے۔

---

1. "مفردات" راغب
2. "المیزان" و "فی ظلال القرآن" (زیر بحث آیت کے ذیل میں)
3. سورۂ اعراف کی آیہ ۱۳۴ ، ۱۳۵ - اور سبا کی آیہ ۵ ، اور جاثیہ کی آیہ ۱۱ اور بقرہ کی آیہ ۵۹ ، اور اعراف کی آیہ ۱۶۲، اور عنکبوت کی آیہ ۳۴ کی طرف رجوع کریں۔
4. فخر رازی کی تفسیر میں یہ معنی ایک احتمال کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ (جلد ۳ ص ۱۹۲)

چوتھے حکم میں فرماتا ہے: "احسان نہ جتلاؤ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کرو" (ولا تمنن تستکثر)۔[۱]

اس بارے میں کہ احسان جتلانے اور زیادتی طلب کرنے سے نہی کن موارد میں ہے۔ یہاں پر آیت کا مفہوم پھر کلی اور وسیع ہے، اور خالق اور مخلوق پر ہر قسم کے احسان جتلانے کو شامل ہے، نہ تو پروردگار پر احسان جتلاؤ کہ تم اس کے لیے جہاد اور سعی و کوشش کرتے ہو، کیونکہ بہ تو اس نے تم پر احسان کیا ہے کہ یہ بلند مقام تمھیں عطا کیا ہے۔

اسی طرح اپنی عبادت، اطاعت اور نیک اعمال کو زیادہ شمار نہ کرو، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو "کمی" اور "تقصیر" میں سمجھو اور عبادت کو اپنے لیے ایک قسم کی بہت بڑی توفیق شمار کرو۔

دوسرے لفظوں میں تمھیں اپنے قیام شب و انذار، توحید کی نشر و اشاعت، پروردگار کی عظمت کو بیان کرنے، کپڑوں کو پاک رکھنے اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرو، خدا پر احسان شمار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی انھیں کوئی بڑا کام سمجھنا چاہیے بلکہ انھیں اپنے پروردگار کے گراں بہا ہدیے سمجھنا چاہیے اور ان کی وجہ سے خدا کا ممنون رہنا چاہیے، اس کے عشق و محبت میں اس طرح غرق رہنا چاہیے، کہ تم ان اہم کاموں کو بہت ہی ناچیز سمجھو۔

اور اگر تم مخلوق کی بھی کوئی خدمت کرتے ہو، چاہے وہ معنوی جہات میں ہو، جیسے تبلیغ و ہدایت، اور چاہے مادی جہات میں ہو مثلاً انفاق و بخشش، ان میں سے کسی چیز کو بھی احسان جتانے یا تلافی کی توقع سے اور وہ تلافی بھی زیادتی کے ساتھ توام نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ احسان جتلانا نیک اعمال کو باطل اور بے اثر کر دیتا ہے۔ (یا ایہا الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذٰی) (بقرہ ــــ ۲۶۴)

"لا تمنن" "منت" کے مادہ سے، ایسے موارد میں ایسی گفتگو کے معنی میں ہے جو اس نعمت کی اہمیت کو بیان کرے جو انسان نے کسی دوسرے کو دی ہے اور یہاں سے اس کا رابطہ "استکثار" (زیادہ طلب کرنے) کے مسئلہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنی خدمت کو ناچیز اور حقیر سمجھے، تو پھر وہ کسی اجر کی توقع نہیں رکھتا، چہ جائیکہ وہ زیادتی کا مطالبہ کرے، اس طرح سے احسان جتلانا ہمیشہ "استکثار" کا سرچشمہ بنتا ہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو نعمت کی قدر و قیمت کو کلی طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اور یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ: لا تعط تلتمس اکثر منھا، تو کسی کو کوئی ایسی چیز نہ دے جس سے بیشتر کی توقع رکھتا ہو[۲] حقیقت میں یہ آیہ شریفہ کے کلی مفہوم کی ایک شاخ کا بیان ہے۔

جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ امام صادق ؑ نے اس آیہ کی تفسیر میں فرمایا:

لا تستکثر ما عملت من خیر للہ

جو نیک کام تم اللہ کے لیے انجام دیتے ہو اسے ہرگز زیادہ نہ سمجھنا۔[۳] یہ بھی اس مفہوم کلی کی ایک شاخ ہی ہے۔

۱۔ توجہ رکھیے کہ "تستکثر" یہاں حال ہے نہ ہی نہی کا جواب (کیونکہ مرفوع صورت میں آیا ہے) اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا: "احسان نہ جتلاؤ درحالیکہ تم زیادتی طلب کرتے ہو یا اپنے عمل کو بڑا اور زیادہ سمجھتے ہو۔

۲، ۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۹ و "تفسیر برہان" جلد ۴ ص ۴۰۰

بعد والی آیت میں اس سلسلہ کے آخری حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اور اپنے پروردگار کے لیے صبر و شکیبائی اختیار کر۔ (ولربك فاصبر)۔

ہمیں یہاں پر پھر "صبر و استقامت اور شکیبائی کے ایک وسیع مفہوم کا سامنا ہے، جو ہر چیز کو شامل ہے۔

یعنی اس عظیم رسالت کی ادائیگی کی راہ میں صبر و شکیبائی کر، مشرکین اور جاہل و نادان دشمنوں کی تکلیف کے مقابلہ میں صابر رہ، فرمانِ خدا کی اطاعت کی عبودیت میں استقامت دکھا اور نفس سے جہاد اور دشمن کے ساتھ میدانِ جنگ کے جہاد میں صابر و شکیبا رہ۔

مسلمہ طور پر صبر و استقامت تمام گزشتہ پروگراموں کے اجراء کی بنیاد اور ضامن ہے۔ اصولی طور پر تبلیغ و ہدایت کی راہ میں اہم ترین سرمایہ یہی صبر و استقامت ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں بارہا اس پر تکیہ ہوا اور اسی وجہ سے امیرالمومنین علیؑ کے ارشاداتِ گرامی میں آیا ہے۔

الصبر من الایمان کالرأس من الجسد

"صبر و استقامت کی ایمان کے مقابلہ میں وہی حیثیت ہے جو سر کی بدن کے مقابلہ میں ہے"[1]

اور اسی بناء پر انبیاء اور مردانِ خدا کا ایک اہم ترین پروگرام ہی صبر و استقامت کا پروگرام تھا۔ جتنے زیادہ سخت اور سنگین حوادث ان پر پڑتے جاتے تھے اتنا ہی ان کا صبر و استقامت بڑھتا جاتا تھا۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے کہ آپ نے صابرین کے اجر کے سلسلہ میں فرمایا:

قال الله تعالیٰ: اذا وجهت الی عبد من عبیدی مصیبة فی بدنه او ماله او ولده، ثم استقبل ذالك بصبر جمیل استحییت منه یوم القیامة ان انصب له میزانًا او انشر له دیوانًا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: جس وقت میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کی طرف اس کے بدن یا مال یا اولاد کے لیے مصیبت لاتا ہوں اور وہ صبرِ جمیل کے ساتھ اس کا سامنا کرتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس کے لیے قیامت کے دن اعمال تولنے کے لیے میزان نصب کروں یا میں اس کے نامہ عمل کو کھولوں[2]

اس حکم کے بعد جو قیام و انذار کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آیا ہے، زیرِ بحث آیات میں انذار کو ایک بہت ہی تاکیدی اور رسا بیان کے ساتھ شروع کرتا ہے اور فرماتا ہے: "جب صور میں پھونکا جائے گا" (فاذا نقر فی الناقور)۔

"تو وہ دن ایک بہت ہی سخت دن ہوگا" (فذالك یومئذ یوم عسیر)[3]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۸۲

[2] تفسیر "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۲۰۔ [3] اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے وہ چیز ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" وہ بہت ہی پرمشقت دن ہوگا، جو کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا" (علی الکافرین غیر یسیر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ " ناقور " اصل میں مادہ " نقر " سے اس طرح دبانے کے معنی میں ہے، جس سے سوراخ ہوجائے اور " منقار " بھی، جو پرندوں کی چونچ ہے، جس سے پرندے دبا کر سوراخ کرتے ہیں اسی معنی سے لی گئی ہے، اسی بناء پر بگل کو، جس کی آواز گویا انسان کے کان میں سوراخ کرتی ہے اور دماغ میں اُتر جاتی ہے " ناقور " کہا جاتا ہے۔

قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی انتہا اور قیامت کی ابتداء میں دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا یعنی دو حد سے زیادہ وحشت انگیز اور ہلا دینے والی صدائیں ——— جن میں سے پہلی موت کی صدا ہے اور دوسری بیداری اور حیات کی صدا ہوگی ——— پوری دنیا کو گھیر لیں گی۔ جنھیں " نفخہ صورِ اوّل " اور " نفخہ صورِ دوم " سے تعبیر کیا جاتا ہے اور زیرِ بحث آیت " نفخہ دوم " کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ کافروں پر سخت اور سنگین دن ہوگا۔

ہم " صور " اور " نفخہ صور " کے بارے میں تفصیلی بحث سُورۂ زمر کی آیہ ۶۸ جلد ۱۱ میں کر چکے ہیں۔

بہر حال اوپر والی آیات اس واقعیت کو بیان کرتی ہیں کہ قیامت کے نفخہ میں کافروں کی مشکلات یکے بعد دیگرے نمایاں ہوں گی، وہ بہت ہی دردناک دن ہوگا اور ایسا مصیبت بار اور طاقت فرسا ہوگا کہ وہ طاقت ور ترین انسان کے بھی گھٹنے ٹکوا دے گا۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) جو کتاب " البیان فی غریب اعراب القرآن " میں آئی ہے، جہاں وہ کہتا ہے کہ " ذالک " مبتداء ہے اور " یومئذ " بدل ہے اور " یوم عسیر " اس کی خبر ہے۔

۱۱۔ ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ۙ

۱۲۔ وَّجَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ۙ

۱۳۔ وَّبَنِیۡنَ شُہُوۡدًا ۙ

۱۴۔ وَّمَہَّدۡتُّ لَہٗ تَمۡہِیۡدًا ۙ

۱۵۔ ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ ٭ۙ

۱۶۔ کَلَّا ؕ اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ؕ

۱۷۔ سَاُرۡہِقُہٗ صَعُوۡدًا ؕ

ترجمہ

۱۱۔ مجھے اس شخص کے ساتھ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے چھوڑ دے۔

۱۲۔ وہی شخص جس کے لیے میں نے وسیع مال قرار دیا ہے۔

۱۳۔ اور ایسے بیٹے جو ہمیشہ اس کے پاس (اور اس کی خدمت میں) رہتے ہیں۔

۱۴۔ اور میں نے ہر لحاظ سے اس کے لیے زندگی کے وسائل فراہم کیے ہیں۔

۱۵۔ پھر بھی وہ یہی طمع رکھتا ہے کہ میں اس میں اور اضافہ کر دوں۔

۱۶۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہماری آیات کے بارے میں دشمنی کرتا ہے۔

۱۷۔ عنقریب ہم اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ زندگی کی چوٹی کے اوپر جائے، (پھر ہم اسے نیچے پھینک دیں گے)

شانِ نزول

ان آیات کے لیے دو شانِ نزول بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ قریش "دارالندوہ" (مسجد الحرام کے قریب ایک مرکز تھا جس میں وہ اہم مسائل میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے) میں جمع ہوئے۔ "ولید" (مکہ کا ایک مشہور اور جانا پہچانا شخص تھا، جس کی عقل اور سمجھ کے مشرکین قائل تھے اور اہم مسائل میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے)

نے ان کی طرف رُخ کرکے کہا : تم بلند نسب اور عقل و خرد کے مالک ہو، اور عرب ہر طرف سے (خانہ کعبہ کی زیارت اور دوسرے لیے) تمھارے پاس آتے ہیں، اور وہ تم سے مختلف جواب سنتے ہیں، تم اپنی بات کو (متفق ہوکر) ایک کرو۔

پھر اس نے ان کی طرف رُخ کرکے کہا : تم اس شخص کے بارے میں (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے) کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا ہم کہتے ہیں: وہ "شاعر" ہے۔ ولید نے منہ چڑا کر کہا : ہم نے شعر بہت سنے ہیں، لیکن اس کی باتیں شعر کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتیں انھوں نے کہا : ہم کہتے ہیں کہ وہ "کاہن" ہے ۔ اس نے کہا : جب تم اس کے پاس جاتے ہو تو وہ باتیں جو کاہن (اخبار غیبی کی صورت میں) کہتے ہیں اس میں تمھیں نہیں ملتیں ، انھوں نے کہا ؛ ہم کہتے ہیں کہ وہ "دیوانہ" ہے ۔ اس نے کہا جب تم اس کے پاس جاؤ گے تو تم اس میں جنون کا کوئی اثر نہیں پاؤ گے ۔

انھوں نے کہا : ہم کہتے ہیں وہ "ساحر" ہے ۔ اس نے کہا ساحر کس معنی میں ؟ انھوں نے کہا : ایسا شخص جو دشمنوں اور دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کر دیتا ہے ، وہ کہنے لگا : ہاں ؛ وہ "ساحر" ہے، اور وہ ایسا کرتا ہے، (کیونکہ ان میں سے بعض مسلمان ہوجاتے ہیں اور اپنی راہ دوسروں سے الگ کر لیتے ہیں) ۔

اس کے بعد وہ "دارالندوۃ" سے باہر نکلے اور حالت ان کی یہ تھی کہ جو بھی ان میں سے پیغمبر اکرمؐ سے ملتا تھا تو کہتا تھا: اے ساحر اے ساحر !

یہ مطلب پیغمبرؐ پر بہت گراں گزرا تو خدا نے اس سورہ کی ابتدائی آیات اور اوپر والی آیات (آیہ ۲۵ تک) نازل فرمائیں (اور پیغمبرؐ کی دلداری کی) ۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت سورۂ الٓمٓ سجدہ (سورۂ غافر) کی آیات نازل ہوئیں تو پیغمبرؐ مسجد الحرام میں (نماز میں) کھڑے تھے اور "ولید بن مغیرہ" حضرت کے قریب تھا اور آپ کی تلاوت کو سن رہا تھا ، جب پیغمبرؐ نے اس بات کی طرف توجہ کی ، تو آپ نے ان آیات کی تلاوت کو دہرایا۔

"ولید" اپنی قوم ـــــــ قبیلہ بنو مخزوم ـــــــ کی مجلس میں آیا اور کہا ، خدا کی قسم ابھی میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ جنوں کی باتوں کے ۔

وان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اعلاہ لمثمر، وان اسفلہ لمغدق وانہ لیعلوا و ما یعلی

اس کی گفتگو میں ایک خاص شیرینی ہے اور اس میں ایک خاص زیبائی اور طراوت ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے پُر ہیں اور اس کی جڑیں قوی اور طاقتور ہیں ، وہ ایسا کلام ہے جو دوسرے ہر کلام سے برتر ہے ، اور کوئی کلام اس پر برتری حاصل نہیں کر سکتا ۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا ، قریش نے ایک دوسرے سے کہا ؛ خدا کی قسم ! وہ محمدؐ کے دین کا فریفتہ ہوگیا ہے ، اور ہمارے دین سے نکل گیا ہے اور وہ تمام قریش کو منحرف کر دے گا ، اور وہ ولید کو " ریحانۃ قریش " (قریش کا گل سرسبد) کہتے تھے ۔

ابوجہل نے کہا: میں اس کام کا کوئی علاج کرتا ہوں وہ اٹھ کر چل پڑا، اور غمگین چہرے کے ساتھ ولید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔
ولید نے کہا: اے بھتیجے! تو کس لیے غمگین ہے؟ اس نے کہا: قریش اس سن وسال کے باوجود تجھ پر عیب لگاتے ہیں اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ تو نے محمد کی بات کو زینت بخشی ہے۔ وہ ابوجہل کے ساتھ اٹھا اور اپنے قبیلے کی مجلس میں آیا اور کہا: کیا تمھارا گمان یہ ہے کہ محمد دیوانہ ہے؟ کیا تم نے کبھی جنون کے آثار اس میں دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں!
اس نے کہا: کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ کاہن ہے؟ کیا تم نے اس میں کبھی کہانت کے آثار دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا "نہیں"! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے؟"۔ انھوں نے کہا "نہیں"۔
اس نے کہا: پھر کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ کیا تم نے اسے ماضی میں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں! وہ دعوائے نبوت سے پہلے بھی ہمارے ہاں ہمیشہ "صادق امین" کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔
اس مرحلہ پر قریش نے "ولید" سے کہا: تیرے نظریہ کے مطابق ہم اسے کیا کہیں؟ ولید سوچ میں پڑ گیا، نگاہ کی اور منہ چڑا کر بولا: وہ تو ایک جادوگر ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مرد اور عورت، اولاد اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے؟ (ایک گروہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اپنے خاندان سے جدا ہو جاتا ہے)۔
اس بناء پر وہ جادوگر ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے ایک عمدہ جادو ہے [1]

تفسیر

"ولید" ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں کافروں کو مجموعی طور پر ڈرایا گیا ہے۔ زیر بحث آیات، خصوصیت کے ساتھ ان کے بعض افراد پر، جو بہت بااثر تھے، انگلی رکھتے ہوئے، اس پر گویا و ناطق، رسا اور سرکوبی کرنے والی تعبیروں کے ساتھ، شدید ترین انذاروں کی بوچھاڑ کرتی ہیں۔
پہلے کہتا ہے: مجھے اس کے ساتھ جسے میں نے اکیلے ہی پیدا کیا ہے، چھوڑ دے" (ذرنی ومن خلقت وحیدًا)۔
یہ آیت اور بعد والی آیات ــــ جیسا کہ ہم نے شان نزول میں بیان کیا ہے ــــ ولید بن مغیرہ مخزومی ــــ جو قریش کے مشہور لوگوں میں سے تھا ــــ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
"وحیدًا" (اکیلا) کی تعبیر ممکن ہے خالق کی توصیف میں ہو یا مخلوق کی، پہلی صورت میں بھی دو احتمال ہیں: پہلا یہ کہ مجھے اس کے ساتھ چھوڑ دے کہ میں خود اس کو شدید سزا دوں، یا یہ کہ میں خود تنہا نے اسے پیدا کیا ہے، اور یہ سب نعمتیں اسے بخشی ہیں، لیکن اس نے

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۸۶ - اس شانِ نزول کو بہت سے مفسرین مثلاً "قرطبی" و "مراغی" و "فخر رازی" و "فی ظلال القرآن" اور المیزان وغیرہ نے (کچھ اختلاف کے ساتھ) نقل کیا ہے۔

نمک حرامی کی ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی دو احتمال ہیں: ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ماں کے پیٹ میں بھی اور پیدائش کے بعد بھی یکہ و تنہا تھا، نہ اس کے پاس مال تھا نہ اولاد، اور یہ سب کچھ ہم نے اسے بعد میں بخشا ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو "وحید" (بے مثل و بے مثال)، (عربوں میں بے نظیر شخص) کا نام دیتا تھا اور وہ یہ کہا کرتا تھا:

انا الوحيد ابن الوحيد، ليس لی فی العرب نظير، ولا لابی نظير

"میں وحید عصر ہوں اور وحید عصر کا بیٹا ہوں، عرب میں نہ کوئی میرا مثل و نظیر ہے اور نہ ہی میرے باپ کا"۔[1]

اس مطلب کا استہزاء کے عنوان سے آیہ میں تکرار ہوا ہے۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ "میں نے اس کیلئے بہت ہی زیادہ وسیع مال قرار دیا" (وجعلت له مالاً ممدودًا)۔

"ممدود" اصل میں کھینچے ہوئے کے معنی میں ہے، جو یہاں اس کے مال کی وسعت اور حجم کے بیان کے لیے آیا ہے، یا زمان و مکان کے لحاظ سے کشش کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے اموال اس قدر وسیع تھے کہ اس کے پاس مکہ اور طائف کے درمیان کے فاصلہ میں بہت سے اونٹ، گھوڑے اور زرعی زمینیں تھیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس اتنے باغات اور کھیت تھے کہ ان میں سے ایک کا غلہ ابھی ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا تیار ہو جاتا۔

علاوہ ازیں وہ ایک لاکھ دینار طلائی کا مالک تھا، اور یہ تمام معانی لفظ "ممدود" میں جمع ہیں۔

اس کے بعد اس کی افرادی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: میں نے اس کے لیے ایسی اولاد قرار دی ہے جو ہمیشہ اس کے پاس اور اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔ (و بنین شهودًا)۔

وہ ہمیشہ اس کی مدد اور خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کی موجودگی اس کے انس اور راحت کا سبب تھی اور وہ تنگی معیشت کی وجہ سے ہرگز مجبور نہیں تھے کہ ان میں سے کوئی بھی دور دراز کے علاقے کی طرف سفر کرے اور باپ کو دوری، ہجر اور تنہائی کا رنج پہنچائیں۔ بعض روایات ...

---

[1] تفسیر "فخر رازی" و "کشاف" و "مراغی" اور "قرطبی" زیر بحث آیات کے ذیل میں، بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "وحید" ... کے اور غیر شرعی بیٹے کے معنی میں ہے، لیکن اس روایت میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے وہ اوپر والی آیت کی تفسیر بن سکے۔ علاوہ ازیں ... سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ معنی اوپر والی آیت کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔

کہ اس کے دس بیٹے تھے ۔

اس کے بعد ان تمام نعمتوں کی طرف ، جو اس نے اسے دے رکھی تھیں ، کلی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " میں نے اس کے لیے ہر لحاظ سے وسائل زندگی فراہم کیے " (ومھدت لہ تمھیدًا) ۔

نہ صرف مال اور آبرومند بیٹے ہی ، بلکہ وہ اجتماعی اور جسمانی پہلوؤں سے بھی ، ہر لحاظ سے نعمتوں میں غرق تھا ۔

" تمہید " " مہد " کے مادہ سے اصل میں اس جگہ کے معنی میں ہے جسے چھوٹے بچے کے لیے تیار کرتے ہیں (گہوارہ اور اسی قسم کی کوئی چیز) اس کے بعد ہر قسم کے راحت و آرام ، پیش رفت اور اجتماعی عمدہ مقام وحیثیت پر اس کا اطلاق ہونے لگا اور مجموعی طور پر اس کا ایک وسیع معنی ہے ، جو زندگی کی انواع و اقسام کی نعمتوں ، اور پیش رفت و موفقیت کے وسائل کو شامل ہے

لیکن وہ ان تمام نعمتوں کے بخشنے والے کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور اس کے آستانہ پر پیشانی جھکانے کے بجائے کفرانِ نعمت کرنے اور زیادہ طلب کرنے لگا : " اور اس قدر مال اور نعمت رکھنے کے باوجود ، پھر بھی یہ لالچ رکھتا ہے کہ ہم اس کی نعمتوں میں اضافہ کریں " (ثم یطمع ان ازید) ۔

یہ بات " ولید بن مغیرہ " میں ہی منحصر نہیں تھی ، بلکہ تمام دنیا پرست ایسے ہی ہوتے ہیں ، ان کی پیاس ہرگز نہیں بجھتی اور اگر ہفت اقلیم بھی ان کے زیر نگیں دے دی جائیں تو وہ پھر بھی ایک اور اقلیم کے خواہش مند ہوتے ہیں ۔

لیکن بعد والی آیت پوری شدت کے ساتھ اس نامحرم کی خواہشات کو رد کرتے ہوئے کہتی ہے : " ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ ہم اس کی نعمت میں اور اضافہ کریں ، کیونکہ وہ ہماری آیات سے دشمنی رکھتا ہے " (کلّا انہ کان لاٰیاتنا عنیدًا) ۔

اور باوجود اس کے کہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ قرآن نہ تو جن کا کلام ہے اور نہ ہی یہ بشر کا کلام ہے ، اور یہ طاقتور جڑیں ، پر ثمر شاخیں اور بے مثال کشش رکھتا ہے ، پھر بھی وہ اس کو " سحر " کا نام دیتا تھا اور اس کے لانے والے کو ساحر کہتا تھا ۔

" عنید " " عناد " کے مادہ سے ، بعض کے قول کے مطابق اس قسم کی مخالفت اور دشمنی کے لیے بولا جاتا ہے ، جو جانتے بوجھتے صورت پذیر ہو ، یعنی انسان کسی چیز کی حقانیت کو درک کرے ، اور پھر اس کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو جائے اور " ولید " اس معنی کا روشن مصداق تھا ۔

" کان " کی تعبیر بتاتی ہے کہ اس کا حق کے ساتھ عناد ایک امر مستمر اور ہمیشگی کا تھا ، ٹوٹنے والا اور جلدی گزر جانے والا نہیں تھا ۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت میں اس کی دردناک سرنوشت کی طرف مختصر اور پر معنی عبارت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " ہم عنقریب اسے مجبور کریں گے کہ وہ زندگی کی " صعب العبور " ـــــ (جس سے گزرنا مشکل ہے) ـــــ چوٹی سے اوپر جائے " (اور پھر ہم اس چوٹی کی بلندی سے اسے نیچے پھینک دیں) ۔ (سارھقہ صعودًا) ۔

"سأرهقه" "ارهاق" کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو سختی کے ساتھ ڈھانپ لینے کے معنی میں ہے اور سخت کے برداشت کرنے اور انواع واقسام کے عذاب میں مبتلا کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"صعود" (بروزن کبود) اس جگہ کے معنی میں ہے جس سے اوپر جاتے ہیں اور "صعود" (بروزن قعود) اوپر کے معنی میں ہے۔

اور چونکہ بلند چوٹیوں سے اوپر جانا بہت ہی مشکل کام ہے، اس لیے یہ تعبیر ہر مشکل اور زحمت والے کام کے لیے استعمال ہوتی ہے لیے بعض نے اس کی عذاب الٰہی کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "صعود" جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے، اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کے اوپر چڑھے، یا یہ ایک ایسا پہاڑ ہے جسے عبور کرنا سخت مشکل ہے، جس کی ڈھلان تیز اور زیادہ ہے، جب وہ اس کے اوپر جائے گا جائے گا اور نیچے آپڑے گا اور اس بات کا بار بار تکرار ہوگا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت اس جہان میں "ولید" کے دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ——— جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے ——— وہ انفرادی واجتماعی زندگی میں کامیابی کی چوٹی کی بلندی پر پہنچنے کے بعد اس طرح گرا کہ آخر عمر تک مسلسل اپنے مال اور اولاد کو ہاتھ سے دیتا رہا کہ بے حد مجبور اور دیوالیہ ہوگیا۔

لہ تفسیر "مراغی" جلد ۲۹ ص ۱۳۱

۱۸۔ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝
۱۹۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝
۲۰۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝
۲۱۔ ثُمَّ نَظَرَ ۝
۲۲۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝
۲۳۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝
۲۴۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝
۲۵۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝

ترجمہ

۱۸۔ اس نے (قرآن سے مبارزہ کرنے کے لیے) غور وفکر کی، اور ایک مطلب تیار کر لیا۔
۱۹۔ وہ ہلاک ہو جائے، کس طرح (حق سے مبارزہ کرنے کے لیے) اس نے مطلب تیار کیا۔
۲۰۔ پھر وہ مرے، اس نے کس طرح سے مطلب (اور اپنے شیطانی منصوبہ) کو آمادہ کیا۔
۲۱۔ پھر اس نے نگاہ ڈالی۔
۲۲۔ پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلدی سے کام میں لگ گیا۔
۲۳۔ پھر اس نے (حق کی طرف) پشت کی اور تکبر کیا۔
۲۴۔ اور آخر کار اس نے کہا یہ (قرآن) گزشتہ لوگوں کے جادو کی طرح، ایک پرکشش اور پرتاثیر جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔
۲۵۔ یہ انسان کے قول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

ہلاک ہوجائے وہ، اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا

ان آیات میں اس شخص کے بارے میں، جسے خدا نے فراواں مال و اولاد دی تھی اور وہ پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کرنے لگا — یعنی " ولید بن مغیرہ" مخزومی کی — مزید وضاحتیں آئی ہیں۔

فرماتا ہے: " اس نے سوچا کہ پیغمبر اور قرآن کو کس چیز کے ساتھ متہم کرے؟ اور اس نے ایک منصوبہ اپنے ذہن میں تیار کرلیا (انہ فکّر وقدّر)۔

واضح رہے کہ غور وفکر کرنا اپنی ذات سے ایک اچھا کام ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حق کی راہ میں ہو۔ بعض اوقات اس کی ایک ساعت ایک سال کی عبادت، بلکہ عمر بھر کی عبادت کی فضیلت رکھتی ہے، کیونکہ وہی ایک لمحہ ہوسکتا ہے کہ انسان کی سرنوشت کو دگرگوں کر دے لیکن اگر غور وفکر کو کفر وفساد اور شیطنت کی راہ میں استعمال کیا جائے تو وہ مذموم اور قبیح ہے اور ولید کی فکر اور سوچ اسی قسم کی تھی۔

" قدّر " " تقدیر " کے مادہ سے، یہاں مطلب کو ذہن میں آمادہ کرنے اور اس قبیح منصوبہ کے اجراء کے لیے مصمم ارادہ کرنے کے معنی میں ہے۔

پھر اس کی مذمت کے لیے مزید کہتا ہے: " وہ ہلاک ہوجائے" اس نے حق سے مبارزہ کرنے کے لیے کیسا منصوبہ بنایا ہے (فقتل کیف قدّر)۔

اس کے بعد تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: " پھر بھی وہ مارا جائے، اس نے حق سے مقابلہ کرنے کے لیے، کس قسم کا منصوبہ تیار کیا ہے" (ثم قتل کیف قدّر)۔

اور یہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو شانِ نزول میں آئی ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ مشرکین کے افکار کو متحد کرے اور انھیں ایک ہی جہت دے، تاکہ یک زبان ہوکر پیغمبرؐ کے خلاف ایک ہی طرح کا پروپیگنڈا کریں اور جب انھوں نے یہ پیش نہاد کی کہ حضرت کو " شاعر" کا لقب دیں تو اس نے قبول نہ کیا،

اس کے بعد انھوں نے " کاہن" کے عنوان کی پیش کش کی تو اس نے اس سے بھی موافقت نہ کی، پھر " مجنون" کے عنوان کو پیش کیا تو اس نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ آخر میں انھوں نے یہ پیش کش کی کہ پیغمبرؐ کو " ساحر" کہہ کر پکاریں تو اس نے ان کے ساتھ موافقت کی، کیونکہ اس کے خیال میں جادو کا اثر دو دوستوں کے درمیان جدائی ڈالنا اور دو مخالف افراد کے درمیان دوستی پیدا کرنا تھا اور یہ بات اسلام اور قرآن کے ظہور کے بعد پیدا ہوگئی تھی، اور چونکہ یہ نقشہ اور منصوبہ مطالعہ کرنے اور سوچ بچار کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا لہٰذا قرآن انھیں " فکر وقدر" کی تعبیر کے ساتھ جو بہت ہی مختصر اور پُرمعنی ہے، پیش کرتا ہے۔ اس طرح اگرچہ پیش نہاد دوسروں کی طرف سے ہوئی تھی، لیکن غور وفکر اور انتخاب " ولید" کی طرف

سے ہوا تھا۔

بہر حال یہ جملہ ـــــ خصوصاً اس کے تکراروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے ـــــ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اپنے شیطانی افکار و نظریات میں پوری مہارت تھی، اس طرح سے کہ اس کی فکر اور سوچ باعثِ تعجب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس نے دوبارہ نظر کی" (ثم نظر)۔

اور اس نے اپنی ساختہ و پرداختہ فکر کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کی، تاکہ اس کے ضروری استحکام و انسجام اور مختلف پہلوؤں سے آگاہ و مطمئن ہو جائے۔

"پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلد بازی سے کام لیا" (ثم عبس و بسر)۔

"پھر اس نے حق کی طرف سے پشت پھیر لی اور تکبر کیا" (ثم ادبر واستکبر)۔

اور آخر کار اس نے کہا: "یہ چیز ایک عمدہ اور پر کشش جادو کے سوا ـــــ جیسا کہ گزشتہ لوگوں سے نقل ہوا ہے ـــــ کچھ نہیں ہے" (فقال ان ھٰذا الّا سحر یؤثر)۔

"یہ صرف انسان کا قول ہے اور اس کا وحی الٰہی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے" (ان ھٰذا الّا قول البشر)۔

اس طرح سے اس نے اپنی آخری بات، قرآن سے مبارزہ اور مقابلہ کرنے کے لیے، بار بار کے مطالعہ اور شیطانی سوچ کے بعد کہی، اور زمانۂ جاہلیت و شرک کے اس متفکر دماغ نے اپنی پوری شیطنت خرچ کرنے کے باوجود اپنی اس بات سے قرآن کی حد سے زیادہ مدح و ثنا اور تعریف و تمجید کر ڈالی، حالانکہ وہ خود اس بات کو نہیں سمجھا، اس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قرآن ایسی کشش اور حد سے زیادہ قوتِ جاذبہ رکھتا ہے، جو ہر انسان کے دل کو مسخر کر لیتا ہے اور اس کے قول کے مطابق اس میں ایسی سحر انگیز تاثیر ہے جو دلوں کو مسحور کر دیتی ہے اور چونکہ قرآن میں جادو گروں کے جادو سے کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے، بلکہ وہ منطقی، موزون اور نپے تلے اقوال اور باتوں کا مجموعہ ہے، لہٰذا یہ بات خود اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ انسان کا کلام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک آسمانی وحی ہے اور اس نے ماوراطبیعت عالم اور خدا کے بے پایاں علم سے سرچشمہ حاصل کیا ہے جس میں پورے نظم و انسجام اور استحکام کے ساتھ تمام خوبیاں اور زیبائیاں جمع ہیں۔

"عبس" "عبوس" (بروزن جلوس) کے مادہ سے، منہ چڑانے کے معنی میں ہے اور "عبوس" (بروزنِ مجوس) اس شخص کے معنی میں ہے جو اس صفت کا حامل ہو۔

"بسر" "بسور" کے مادہ سے اور "بسر" (بروزن نصر) بعض اوقات تو کسی کام کے وقت آنے سے پہلے اس میں جلدی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی منہ چڑانے اور چہرہ کو دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے۔

زیر بحث آیت میں اگر دوسرا معنی مراد ہو تو یہ "عبس" کے جملہ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اگر یہ پہلے معنی میں ہو، تو یہ قرآن کے لیے ایک غلط عنوان چسپاں کرنے میں، لہٰذا گھبراہٹ اور سراسیمگی کے ساتھ جلد بازی سے تصمیم گیری کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

" یؤثر " کا جملہ " اثر " کے مادہ سے، اس روایت کے معنی میں ہے، جو گزشتہ لوگوں سے نقل ہوئی ہو، اور وہ آثار جو ان سے باقی رہ گئے ہوں اور بعض نے اسے " ایثار " کے مادہ سے، انتخاب کرنے، مقدم رکھنے اور ترجیح دینے کے معنی میں سمجھا ہے۔

پہلے معنی کے مطابق " ولید " کہتا ہے: یہ گزشتہ لوگوں سے نقل شدہ جادو کی مانند، ایک جادو ہے اور دوسرے معنی کے مطابق وہ یہ کہتا ہے: یہ ایک ایسا جادو ہے جو اپنی حلاوت اور کشش کی بناء پر دلوں میں اثر کرتا ہے، اور لوگ اس کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔

بہر حال یہ قرآن کے اعجاز کا ایک ضمنی اعتراف ہے، کیونکہ قرآن جادوگروں کے خارق العادۃ کاموں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا، یہ ایک ایسا سنجیدہ و محکم کلام ہے، جو معنویت سے پُر ہے اور بے مثل و نظیر قوت جاذبہ و نفوذ رکھتا ہے، اگر یہ " ولید " کے قول کے مطابق بشر کا کلام ہوتا تو پھر دوسرے بھی اس کی مثل و نظیر لا سکتے تھے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن نے بارہا مقابلہ کی دعوت دی ہے، لیکن اس کے ان سخت ترین دشمنوں میں سے ——— جو عربی زبان میں حد سے زیادہ مہارت رکھتے تھے ——— کوئی بھی اس جیسی چیز نہ لا سکے، بلکہ وہ اس سے کمتر بھی نہ لا سکے اور معجزہ کا معنی یہ ہے۔

۲۶۔ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝
۲۷۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ؕ
۲۸۔ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ۚ
۲۹۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ۚۖ
۳۰۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ؕ

ترجمہ

۲۶۔ (لیکن) ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔
۲۷۔ اور تو نہیں جانتا کہ دوزخ کیا چیز ہے؟
۲۸۔ (وہ ایک ایسی آگ ہے جو) نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے۔
۲۹۔ وہ بدن کی جلد کو کلی طور پر دگرگوں کر دیتی ہے۔
۳۰۔ انیس (عذاب کے فرشتے) اس پر مقرر کیے گئے ہیں۔

تفسیر

اس کی سرنوشتِ شوم

گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے، جو شرک کے بعض سرغنوں کی وضع و کیفیت، اور قرآن مجید اور پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت کی نفی و انکار کی بات کرتی تھیں، ان آیات میں قیامت میں ان کے وحشت ناک عذاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور دوزخ کی آگ میں جلائیں گے" (ساصليه سقر)۔

"سقر" اصل میں "سقر" (بروزن فقر) کے مادہ سے دگرگوں ہونے اور سورج کی گرمی کے اثر سے پگھل جانے کے معنی میں ہے اس کے بعد جہنم کے ناموں میں سے ایک نام کے عنوان سے انتخاب ہوا ہے اور بارہا قرآنی آیات میں آیا ہے اور اس نام کا انتخاب دوزخ کے ہولناک عذابوں کی طرف اشارہ ہے، جو اہلِ دوزخ کو دامن گیر ہوں گے، اور بعض نے جہنم کے ہول انگیز طبقات و درکات میں سے ایک کا

نام سمجھا ہے۔

اس کے بعد عذابِ دوزخ کی عظمت و شدت کے بیان کے لیے کہتا ہے: "تو کیا جانتا ہے کہ سقر کیا ہے" (وما ادراك ما سقر)۔ یعنی اس کا عذاب اس قدر شدید ہے جو دائرہ تصوّر سے باہر ہے اور کسی شخص کے فکر و خیال میں نہیں سماتا جیسا کہ جنت کی نعمتوں کی اہمیت و عظمت کسی کی فکر و خیال میں نہیں سماتیں۔

"وہ نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے۔" (لا تبقی ولا تذر)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جہنم کی آگ، دنیا کی آگ کے برخلاف ——— جو کبھی بدن کے ایک حصہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور دوسرا حصہ صحیح و سالم رہ جاتا ہے اور کبھی جسم پر اثر کرتی ہے، لیکن روح اس سے امان میں رہتی ہے ——— ایک ایسی گھیرنے والی آگ ہے جو انسان کے پورے وجود کو اپنے احاطہ میں لے لی گی اور کسی چیز کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخیوں کو نہ تو مارے گی اور نہ ہی زندہ رہنے دے گی، بلکہ وہ ہمیشہ موت و حیات کے درمیان گرفتار رہیں گے، جیسا کہ سورۂ اعلیٰ کی آیہ ۱۳ میں آیا ہے لا یموت فیھا ولا یحیٰی "نہ وہ اس میں مریں گے اور نہ ہی وہ زندہ رہیں گے۔"

یا یہ ہے کہ نہ تو جلد اور گوشت بدن پر رہنے دے گی اور نہ ہی ہڈیوں کو صحیح و سالم چھوڑے گی، اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کلی طور پر جلا دے گی اور نابود کر دے گی، کیونکہ یہ معنی اس چیز سے، جو سورۂ نساء کی آیہ ۵۶ میں آئی ہے، سازگار نہیں ہے، جہاں فرماتا ہے: (کلما نضجت جلودھم بدّلناھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب) جس وقت ان کے بدن کی جلدیں جل جائیں گی تو ہم ان پر دوسری جلدیں تبدیل کر دیں گے، تاکہ وہ خدا کے عذاب کا مزہ چکھیں۔

اس کے بعد قہرِ الٰہی کی اس جلانے والی آگ کی دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بدن کی جلد کو کامل طور پر بدل کر رکھ دے گی، جو بہت دُور کے فاصلہ سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی" (لوّاحة للبشر)[1]

وہ چہرے کو اس طرح سے سیاہ اور تاریک بنا دے گی کہ وہ شبِ تاریک سے زیادہ سیاہ نظر آئے گا۔

"بشر" یہاں "بشرہ" کی جمع ہے، جو بدن کی ظاہری جلد کے معنی میں ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسانوں کے معنی میں ہو، "لوّاحة"، "لوح" کے مادہ سے، کبھی تو ظاہر و آشکار ہونے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی تغیّر دینے اور دگرگوں کرنے کے معنی میں۔

پہلے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: دوزخ دور کے فاصلہ سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیہ ۳۶ میں آیا ہے، وبرّزت الجحیم لمن یریٰ "دوزخ دیکھنے والوں کے لیے ظاہر و آشکار ہوگی۔"

---

[1] "لوّاحة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں "ھی لوّاحة" ہے۔

اور دوسرے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہے : "دوزخ بدن کی جلد کے رنگ کو کلی طور پر دگرگوں کر دے گی"۔

اور آخری زیرِ بحث آیت میں فرماتا ہے : " انیس عذاب کے فرشتے جہنم پر مقرر کیے گئے ہیں (علیھا تسعة عشر)"[1]

وہ فرشتے جو قطعی طور سے ترحم، شفقت اور مہربانی پر مامور نہیں ہیں، بلکہ سزا دینے، عذاب اور سختی پر مامور ہیں۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں صرف انیس کے عدد کا ذکر ہوا ہے اور عذاب پر مامور ملائکہ کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن بعد والی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعداد عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ فرشتوں کے انیس گروہوں کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ انیس افراد کی طرف، اور " وما یعلم جنود ربك الا ھو" (تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا) کا جملہ، جو بعد والی آیت میں آیا ہے، اس کو اس معنی پر قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن مامورینِ عذابِ الٰہی کے لیے اعداد میں سے صرف انیس کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، کوئی بھی شخص دقت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا، لیکن کچھ لوگوں نے یہ احتمال دیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس کے عدد میں، اکائیوں میں سب سے بڑا عدد (نو کا عدد) اور دہائیوں میں سے سب سے چھوٹا عدد (دس کا عدد) جمع ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ کی جڑیں انیس ظاہری و باطنی اخلاق کی طرف لوٹتی ہیں اور چونکہ اخلاقِ رذیلہ میں سے ہر ایک عذابِ الٰہی کا ایک عامل ہے، اس لیے دوزخ کے انیس طبقے ہیں، جو ان کی تعداد کے مطابق ہیں اور ہر طبقہ پر ایک فرشتہ یا فرشتوں کا ایک گروہ عذاب پر مامور ہے۔

اصولی طور پر قیامت، بہشت و دوزخ اور ان کے جزئیات و خصوصیات سے مربوط مسائل ہم لوگوں کے لیے، جو محدود دنیا کے محیط میں اسیر ہیں، پورے طور پر واضح نہیں ہیں، جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان کے کلیات ہیں۔ اسی لیے روایات میں یہ آیا ہے کہ ان انیس فرشتوں میں سے ہر ایک بہت بڑی قدرت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے قبیلہ کو آسانی کے ساتھ جہنم میں پھینک سکتا ہے۔

اور یہاں سے ان لوگوں کے افکار کا ضعف و ناتوانی واضح ہو جاتا ہے، جو ابوجہل کی طرح سوچتے ہیں، اس نے جب یہ آیت سنی تو اس نے قبیلہ قریش سے بطور استہزاء کے یہ کہا کہ تمھاری مائیں تمھاری عزا میں بیٹھیں، کیا تم سنتے نہیں ہو کہ " ابن ابی کبشہ" (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے[2])

---

[1] اس جملہ میں " علیھا" خبر مقدم ہے اور " تسعة عشر" مبتدائے مؤخر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لفظ مبنی بر فتحہ ہے۔ اس لیے ظاہر میں اس پر رفع نہیں آسکتا اور اس کی وجہ نحویوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ واو عاطفہ کے معنی کو متضمن ہے۔

[2] اس بارے میں کہ قریش پیغمبرؐ کو اس عنوان سے کیوں پکارتے تھے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: اس کی وجہ یہ ہے کہ قبیلہ "خزاعہ" کا ایک شخص "ابوکبشہ" نامی تھا جو زمانہ جاہلیت میں بتوں کی عبادت سے دستبردار ہو گیا تھا اور چونکہ پیغمبر بت پرستی کے شدید مخالف تھے لہٰذا وہ آپ کو "ابوکبشہ" کے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ابوکبشہ پیغمبر کے مادری اجداد میں سے تھا لیکن بہرحال اس میں شک نہیں کہ ان کا مقصد اس نام کے انتخاب کرنے میں تمسخر اڑانا تھا، کیونکہ عربی زبان میں "کبش" "مینڈھے" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ یہ نام مدح کے طور پر بھی آیا ہے اور لشکر کے بہادروں اور کمانڈروں کو بھی کہتے ہیں۔

کیا کہتا ہے ؟ وہ کہتا ہے کہ دوزخ کے خازن انیس افراد ہیں، لیکن تم بہادروں کا ایک بہت بڑا گروہ ہو، کیا تم میں سے ہر دس آدمی بھی ان میں سے ایک کو مغلوب نہیں کر سکتا ؟" "ابوالاسد جمحی" (قریش میں سے ایک طاقت ور شخص) نے کہا: میں ان میں سے سترہ کے لیے کافی ہوں، باقی کے دو نفر کا حساب چکا لینا۔[1]

یہ پست دماغ کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس تمسخر اور استہزاء کے ذریعہ، نورِ حق کا راستہ روک دیں، اور اپنے آپ کو حتمی اور یقینی نابودی سے نجات دیں۔

ایک نکتہ

انیس کا عدد، عذاب کے فرشتوں کا عدد ہے

اوپر والی آیات میں، جہنم کے خازنوں کی تعداد واضح طور پر انیس افراد یا انیس گروہ اور لشکر بتائی گئی ہے اور بعد والی آیات میں اسی مطلب پر تکیہ ہوا ہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض منحرف فرقے اس عدد کے مقدس ہونے پر اصرار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ سال کے مہینوں کی تعداد اور مہینوں کے دنوں کی تعداد ـــــ تمام طبعی اور فلکی موازین کے برخلاف ـــــ اسی انیس کے محور پر منظم کریں، اور اپنے عملی احکام بھی اسی کے مطابق قرار دیں۔

اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک مؤلف جو شاید ان کے نظریات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے، ایک ہنسانے والا، اور عجیب اصرار رکھتا ہے کہ وہ قرآن کی ہر چیز کی انیس کی بنیاد پر توجیہ کرے، اور بہت سے ایسے موارد میں، جہاں یہ عدد اس کی دلی خواہش کے مطابق، آیاتِ قرآنی میں موجود واقعیتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہاں وہ اپنی مرضی سے کچھ کم اور کچھ زیادہ کرتا ہے تاکہ وہ انیس کے عدد یا انیس کے عدد کی ضربوں سے ہم آہنگ ہو جائے اور ان کے مطالب کو ذکر کرنے میں وقت صرف کرنا، یا ان کے جواب دینا شاید اتلافِ وقت میں محسوب ہوگا۔

ہاں! ایک "دوزخی مذہب" کو "دوزخی عدد" کے محور پر ہی گردش کرنا چاہیے اور ایک دوزخی گروہ کو عذاب کے فرشتوں کے عدد کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۸۸ اور دوسری تفاسیر

۳۱۔ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ
اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ
يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ
مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ اِلَّا
ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝

ترجمہ

۳۱۔ ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا، اور ان کی تعداد بھی کافروں کی آزمائش کے علاوہ اور کسی بات کے لیے معیّن نہیں کی، تاکہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین کر لیں اور مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو اور اہلِ کتاب اور مومنین (اس آسمانی کتاب کی حقانیت میں شک و تردد نہ کریں، وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافر یہ کہیں: خدا کا اس تعریف سے کیا مقصد ہے؟ ہاں! خدا جسے چاہتا ہے، اسی طرح سے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ انسانوں کی تنبیہ اور تذکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

دوزخ کے مامورین کی یہ تعداد کس لیے ہے؟

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا نے دوزخ کے خازنوں اور مامورین کی تعداد انیس افراد (یا انیس گروہ) بیان کی ہے، اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس عدد کا ذکر مشرکین اور کفار کے درمیان گفتگو کا سبب بنا، اور ایک گروہ نے اس کا مذاق اڑایا اور ان کی تعداد کے کم ہونے کو

اس بات کی دلیل خیال کیا کہ ان پر غلبہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

زیر بحث آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے انھیں جواب دیتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سے حقائق کو واضح کرتی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا" (وما جعلنا اصحاب النار الا ملائكة)[1]

طاقت ور اور قدرت والے فرشتے اور قرآن کی تعبیر میں، "غلاظ"، و"شداد" "بہت شدید اور سخت گیر، جن کے سامنے تمام گنہگار ضعیف و ناتواں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے ان کی تعداد کافروں کی آزمائش کے سوا اور کسی بات کے لیے قرار نہیں دی ہے" (وماجعلنا عدتهم الا فتنة للذين كفروا)۔

یہ آزمائش دو لحاظ سے تھی، ایک تو یہ کہ وہ استہزاء اور تمسخر کرتے تھے کہ تمام اعداد میں سے انیس (۱۹) کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، حالانکہ دوسرا جو بھی عدد انتخاب ہوتا، اسی میں یہ سوال پیدا ہوتا۔

اور دوسری طرف وہ اس تعداد کو بہت کم سمجھتے تھے، اور بطور تمسخر اور استہزاء کے کہتے تھے، کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے مقابلہ کے لیے دس دس افراد کھڑے کر دیں گے اور انھیں درہم و برہم کر کے رکھ دیں گے۔

حالانکہ خدا کے فرشتے ایسے ہیں کہ قرآن کے قول کے مطابق ان میں سے چند افراد ہی قوم لوط کی ہلاکت پر مامور ہوئے تھے، اور انھوں نے ان کے آباد شہروں کو زمین سے اٹھا کر زیر و زبر کر دیا تھا اور اس سے قطع نظر، جہنم کے خازنوں کے لیے انیس کے عدد کا انتخاب، دوسرے معانی بھی رکھتا ہے، جو گزشتہ آیات کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس سے مقصد یہ تھا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین پیدا کریں" (ليستيقن الذين اوتوا الكتاب)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے بعض اصحاب پیغمبرؐ سے خازنین جہنم کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اسی وقت جبرئیل نازل ہوئے اور پیغمبرؐ کو خبر دی: "عليها تسعة عشر" "انیس افراد (یا انیس گروہ) اس پر مقرر کیے گئے ہیں"[2]

اور چونکہ انھوں نے اس موضوع پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے اپنی کتب کے ساتھ ہم آہنگ پایا، اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت پر ان کے یقین میں اضافہ ہوا، اور یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ مومنین بھی اپنے عقیدہ اور ایمان میں زیادہ راسخ ہو جائیں۔

---

[1] "اصحاب النار" کی تعبیر قرآن مجید کی آیات میں بہت زیادہ ذکر ہوئی ہے، اور ہر جگہ "دوزخیوں" کے معنی میں ہے۔ سوائے اس جگہ کے کہ یہاں "خازنین" کے معنی میں ہے ضمنی طور پر ان کے بارے میں اس تعبیر کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ گزشتہ آیات میں "سقر" کا معنی سارا جہنم ہے، نہ کہ اس کا ایک حصہ۔

[2] اس حدیث کو "بیہقی"، "ابن ابی حاتم" اور "ابن مردویہ" نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر مراغی، جلد ۲۹ ص ۱۳۴)

اس لیے بعد والے جملہ میں مزید کہتا ہے : " اس سے مقصد یہ تھا کہ مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوجائے " (ویزداد الذین امنوا ایمانًا)۔

اور اس جملہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ انھی تین اہداف و مقاصد کی طرف ، تاکید کے عنوان سے لوٹتا ہے اور نئے سرے سے اہل کتاب کے ایمان ، اس کے بعد مومنین کے ایمان اور پھر کفار و مشرکین کی آزمائش پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے : " اور مقصد یہ تھا اور اہل کتاب اور مومنین قرآن کی حقانیت میں شک اور تردد نہ کریں اور کافر اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ کہیں کہ خدا کا اس تعریف سے کیا ارادہ ہے اور اس کا کیا مقصد ہے ؟ (ولا یرتاب الذین اوتوا الکتاب والمؤمنون و لیقول الذین فی قلوبھم مرض و الکافرون ماذا اراد اللہ بھٰذا مثلاً)[1]۔

اس بارے میں کہ " الذین فی قلوبھم مرض " (وہ لوگ کہ جن کے دل میں بیماری ہے) سے کون لوگ مراد ہیں ؟ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد " منافقین " ہیں ، کیونکہ قرآنی آیات میں یہ تعبیر ان کے بارے میں آئی ہے ، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے ، جو قبل و بعد کی آیات کے قرینہ سے منافقین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے : فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا : ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیتا ہے اور اسی بات کو وہ آیت کے مدنی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ گروہ منافقین اسلام کی قدرت کے موقع پر مدینہ میں پیدا ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔

لیکن آیاتِ قرآنی میں اس تعبیر کے ذکر کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر منافقین میں منحصر نہیں ہے ، بلکہ یہ ان تمام کفار کے لیے جو حق تعالیٰ کی آیات کے بارے میں عناد ، ہٹ دھرمی اور دشمنی رکھتے تھے ، ——— اطلاق ہوئی ہے ، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کا منافقین پر عطف ہوا ہے ، جو ممکن ہے کہ ان کی دوگانگی اور الگ الگ ہونے پر دلیل ہو ، مثلاً سورۂ انفال کی آیہ ۴۹ میں آیا ہے ۔

اذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض غرّ ھٰؤلاء دینھم

" جس وقت منافقین اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری تھی یہ کہا کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے "

اور اسی طرح اور دوسری آیات ۔

اس بناء پر اس آیت کے مکی ہونے کی نفی پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے ، خصوصًا جبکہ یہ ماقبل کی آیات کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور ارتباط رکھتی ہے ۔ جن میں مکی ہونے کی نشانیاں مکمل طور پر نمایاں ہیں ۔ (غور کیجیے)

پھر ان باتوں کے بعد ، جو مومنین اور بیمار دل کافروں کی ارشاداتِ الٰہی سے فائدہ اٹھانے کی کیفیت کے بارے میں تھیں ، مزید کہتا ہے اس طرح سے خدا جسے چاہتا ہے ، گمراہ کر دیتا ہے ، اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے "۔ (کذالک یضل اللہ من یشاء

---

[1] اس بات پر توجہ رہے کہ " لیستیقن " کا " لام " تو " لام علت " ہے اور " لیقول " میں " لام غایت " اور شاید اسی بناء پر تکرار ہوا ہے ۔ حالانکہ اگر دونوں کا ایک ہی معنی ہوتا تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں تھی اور دوسرے لفظوں میں مومنین میں یقین پیدا کرنا ، خدا کی مشیت اور اس کا حکم تھا ، لیکن کافروں کی کفر آمیز باتیں اس کی مشیت اور حکم نہیں ہیں ، بلکہ وہ ان کے اس کام کا انجام اور نتیجہ تھیں ۔

ویھدی من یشاء)۔

گزشتہ جملے، اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتے ہیں کہ بعض کی ہدایت اور بعض دوسرے کی گمراہی کے بارے میں یہ مشیت ارادۂ الٰہی، بے حساب نہیں ہے، وہ لوگ جو معاند، ہٹ دھرم اور دل کے بیمار ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی حق نہیں رکھتے، اور وہ لوگ جو خدا کے فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور وہ مومن ہیں وہ اسی قسم کی ہدایت کے مستحق ہیں۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "بہرحال تیرے پروردگار کے لشکر کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ چیز انسانوں کو تنبیہ کرنے اور تذکر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے (و ما یعلم جنود ربک الّا ھو و ما ھی الّا ذکرٰی للبشر)۔

اس بناء پر اگر دوزخ کے انیس خازنین کا ذکر درمیان میں آیا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خدا کے لشکر انھیں میں محدود ہیں، بلکہ پروردگار کے لشکر اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض روایات کی تعبیر کے مطابق تمام زمین اور آسمانوں کو انھوں نے بھر رکھا ہے، یہاں تک کہ تمام عالمِ ہستی میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں خدا کا ایک فرشتہ تسبیح میں مشغول ہے۔

اس بارے میں کہ "و ما ھی الّا ذکرٰی للبشر" (اور یہ انسانوں کے لیے تذکر کے علاوہ کچھ نہیں) کے جملہ میں "ھی" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے، مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ: یہ جنود اور خدا کے لشکروں کی طرف لوٹتی ہے، جن میں سے ایک گروہ خازنینِ دوزخ ہیں۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: "سقر" یعنی خود دوزخ کی طرف لوٹتی ہے۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ یہ سب چیزیں تذکر، بیداری اور آگاہی کا سبب ہیں، لیکن آیات کے لب ولہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اگر خدا نے اپنے لیے لشکروں کا انتخاب کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خود معاندین اور گنہگاروں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا سکتا، اور عذاب نہیں دے سکتا، بلکہ یہ سب کچھ تذکر و بیداری اور عذابِ الٰہی کے مسئلہ کے حقیقت ہونے کی طرف توجہ کے لیے ہے۔

ایک نکتہ

پروردگار کے لشکروں کی تعداد

ہر جگہ خدا کا حضور اور اس کی قدرت کی وسعت، تمام عالمِ ہستی میں، اس کی پاک ذات کو ہر قسم کے یار و مددگار اور لشکر سے بے نیاز کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مخلوقات کو اپنی عظمت بتانے، اور ان کے تذکر اور یاد دہانی کے لیے اس نے فراواں لشکروں کا انتخاب کیا ہے، جو سارے عالم میں اس کے فرمان کو اجراء کرنے والے ہیں۔

اسلامی روایات میں پروردگار کے لشکروں کی کثرت وعظمت اور قدرت کے لیے عجیب وغریب تعبیریں وارد ہوئی ہیں، چونکہ وہ ان موازین کے ساتھ، جن سے ہم سروکار رکھتے ہیں سازگار نہیں ہیں، اسی لیے ان کا سننا ہمارے لیے بہت تعجب آور ہے۔

یہاں پر ہم علیؑ کے اس عظمت والے کلام پر، جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں نقل ہوا ہے، قناعت کرتے ہیں، اور چونکہ عبارت طولانی ہے، لہٰذا ہم اس کا صرف ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

اس وقت اوپر والے آسمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا، اور ان کو فرشتوں کی مختلف اصناف واقسام سے پُر کر دیا۔

ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ سجدہ میں رہتا ہے اور وہ رکوع میں نہیں جاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے اور وہ رکوع سے سر نہیں اٹھاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ قیام میں رہتا ہے اور عبادت میں مشغول رہتا ہے اور وہ اپنی جگہ کو نہیں بدلتا۔

ایک گروہ ہمیشہ تسبیح کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔

کبھی نیند ان کی آنکھوں کو بند نہیں کرتی اور سہو ونسیان ان کی عقل پر غالب نہیں آتے۔

ان کے جسم سستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور غفلت اور فراموشی انھیں لاحق نہیں ہوتی۔

اور ایک دوسرا گروہ اس کی وحی کا امین ہے اور اس کے پیغمبروں کی طرف اس کی زبان ہے اور یہ گروہ اس کے فرمان اور امر کی تبلیغ کے لیے مسلسل آتا جاتا رہتا ہے۔

کچھ اور اس کے بندوں کے محافظ ہیں اور بہشت بریں کے دربان ہیں۔

ان میں سے بعض کے پاؤں زمین کے نچلے طبقات میں ثابت اور ان کی گردنیں آسمانِ بریں سے آگے نکل گئی ہیں اور ان کے وجود کے ارکان ابعاد واطرافِ جہان سے خارج ہو گئے ہیں اور ان کے کندھے عرشِ خدا کے پایوں کی حفاظت کے لیے آمادہ ہیں۔[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں (ملک) ایک وسیع وعریض مفہوم رکھتا ہے جو ان فرشتوں کو بھی شامل ہے جو عقل وشعور اور اطاعت وتسلیم کے حامل ہیں اور عالمِ ہستی کی بہت سی قوتوں اور توانائیوں کو بھی۔

ہم نے اس موضوع کے بارے میں سورۂ فاطر کے آغاز کی آیات میں (جلد ۱۰ ص ۱۶۲ سے آگے) مزید تفصیل بیان کی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ اول

۳۲۔ كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ

۳۳۔ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ

۳۴۔ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۙ

۳۵۔ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۙ

۳۶۔ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۙ

۳۷۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ

ترجمہ

۳۲۔ جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم۔

۳۳۔ اور رات کی قسم جب (وہ دامن سمیٹے اور) پشت پھیرے۔

۳۴۔ اور صبح کی قسم جب وہ چہرہ کھولے۔

۳۵۔ کہ وہ (قیامت کے ہولناک حوادث) اہم مسائل میں سے ہیں۔

۳۶۔ تمام انسانوں کے لیے تنبیہ اور انذار ہے۔

۳۷۔ تم میں سے ان لوگوں کے لیے جو یہ چاہتے ہیں کہ آگے بڑھ جائیں یا پیچھے رہ جائیں (یعنی نیکیوں کی ہدایت کے لیے آگے بڑھ جائیں یا آگے نہ بڑھیں)

تفسیر

پیغمبر اسلام کی نبوت کے منکرین اور قیامت کے انکار کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں کئی ایک قسمیں کھائی ہیں، اور قیامت، قبروں سے اٹھنے اور دوزخ و عذاب کے مسئلہ پر تاکید ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم (کلّا والقمر)۔

"کلّا" "حرف" ردع" ہے اور عام طور پر ان باتوں کی نفی کے لیے آتا ہے جنھیں طرف مقابلے نے پہلے ذکر کیا ہو اور کبھی بعد والی باتوں کی نفی کے لیے بھی ہوتا ہے اور یہاں گزشتہ آیات کے قرینہ سے ان مشرکین کے گمان کی جو دوزخ اور اس کے عذاب کے منکر تھے، اور

کے خازن فرشتوں کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے، نفی کرتا ہے ۔

"چاند" کی قسم کا ذکر اس بناء پر ہے کہ وہ خدا کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہے۔ خلقت کے لحاظ سے بھی اور منظم دور اور گردش کرنے کے لحاظ سے بھی، اور روشنی و خوبصورتی اور تدریجی تغیرات کے لحاظ سے بھی، جو دنوں کی تشخیص کے لیے خود ایک زندہ تقویم اور جنتری ہے

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور قسم ہے رات کی جس وقت وہ پشت پھیرے اور دامن سمیٹے (واللیل اذ ادبر)۔

"اور قسم ہے صبح کی جس وقت وہ اپنے چہرے سے نقاب اٹھائے" (والصبح اذا اسفر)[1]

حقیقت میں یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ چاند کی جلوہ گری راتوں میں ہے اور دن کے وقت چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کے تحت الشعاع میں ہوتی ہے اور وہ مطلقاً جلوہ نہیں دکھاتا۔

رات بھی اگرچہ آرام بخش ہوتی ہے اور خاموش اور حق تعالیٰ کے عاشقوں کے راز و نیاز کا وقت ہوتا ہے، لیکن یہ شبِ تاریک اس وقت بہت ہی عمدہ دکھائی دیتی ہے جب وہ پشت پھیرتی ہے اور صبح روشن کی طرف رُخ کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور آخر سحر کا وقت ہوتا ہے اور صبح کا طلوع کرنا، جو شبِ تاریک کا اختتام ہے، سب سے زیادہ دل آویز ہوتا ہے، جو ہر انسان کو وجد و نشاط میں لاتا ہے اور نور و صفا میں غرق کر دیتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ تینوں قسمیں "قرآن" کے نورِ ہدایت، اور "شرک و بت پرستی" کی تاریکیوں کے پشت پھیرنے اور "توحید" کی صبح کی سفیدی کے پھوٹنے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

ان قسموں کو بیان کرنے کے بعد اس چیز کی طرف رُخ کرتا ہے، جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، فرماتا ہے: "یقیناً قیامت کے ہولناک حوادث، دوزخ اور عذاب کے فرشتے اہم مسائل میں سے ہیں" (انہا لاحدی الکبر)[2]

"انہا" کی ضمیر یا تو "سقر" (دوزخ) کی طرف لوٹتی ہے یا "جنود" اور پروردگار کے لشکروں کی طرف، یا قیامت کے تمام حوادث کی طرف اور ان میں سے جو بھی ہو، اس کی عظمت واضح ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "دوزخ کی خلقت کا مقصد انتقام جوئی ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تو انسانوں کو ڈرانے کا ایک ذریعہ ہے (نذیرًا للبشر)[3]

---

[1] "اسفر" "سفر" (بروزن فقر) کے مادہ سے ڈھکنا کھولنا اور حجاب کو دور کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے بے پردہ عورتوں کو "سافرات" کہا جاتا ہے اور یہ تعبیر طلوعِ صبح کے لیے ایک خوبصورت اور عمدہ تشبیہ ہے۔

[2] "کبر" کبری کی جمع ہے جو بزرگ اور بڑی چیز کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "سقر" دوزخ کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے۔ لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے اور آیات سے معلوم ہوتا ہے، سازگار نہیں ہے۔

[3] "نذیرًا" "انہا" کی ضمیر کا حال ہے جو "سقر" کی طرف لوٹتی ہے اور بعض نے اسے تمیز سمجھا ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ "نذیر" مصدری معنی رکھتا ہو اور "انذار" کے معنی دیتا ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

تاکہ سب کو ڈرائے اور انذار کرے اور اس وحشت ناک عذاب سے، جو کافروں، گنہ گاروں اور حق کے دشمنوں کے انتظار میں ہے،

آخر میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "یہ انذار کسی معین گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ تو تمام افرادِ بشر کے لیے ہے، تم میں ان سب لوگوں کے لیے، جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور نیکیوں اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی طرف پیش رفت کرنا چاہتے ہیں اور چاہے وہ لوگ ہوں اس قافلہ سے پیچھے رہ جانے کی طرف مائل ہوں" (لمن شاء منکم ان یتقدم او یتأخر)۔

جو شخص آگے بڑھنے کی راہ پر چل پڑے، تو اس کا کیا ہی کہنا ہے اور جو تاخیر کی راہ اپنائے اور پیچھے کو ہٹے تو اس کا بُرا حال ہو گا۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدم و تأخر سے مراد جہنم کی آگ کی طرف تقدم اور اسی سے پیچھے ہٹنا ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد، نفسِ انسانی کا تقدم اور تکامل و ارتقاء ہے یا اس کا انحطاط اور تاخر ہے۔

پہلا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب ہے، اور دوسری تفسیر چنداں مناسب نہیں ہے۔

۳۸۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝
۳۹۔ إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ۝
۴۰۔ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ۝
۴۱۔ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ۝
۴۲۔ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ۝
۴۳۔ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ۝
۴۴۔ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ۝
۴۵۔ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلْخَآئِضِينَ ۝
۴۶۔ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ۝
۴۷۔ حَتَّىٰٓ أَتَىٰنَا ٱلْيَقِينُ ۝
۴۸۔ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَٰعَةُ ٱلشَّٰفِعِينَ ۝

ترجمہ

۳۸۔ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے۔
۳۹۔ مگر "اصحاب یمین" (جن کا اعمال نامہ ایمان وتقویٰ کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔
۴۰۔ وہ جنت کے باغات میں ہوں گے اور وہ سوال کریں گے۔
۴۱۔ مجرموں سے
۴۲۔ تمھیں دوزخ کی طرف کس چیز نے بھیجا۔
۴۳۔ وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

۴۴۔ اور مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے ۔
۴۵۔ اور ہمیشہ اہلِ باطل کے ہم نشین و ہم صدا رہتے تھے ۔
۴۶۔ اور ہمیشہ روزِ جزا کا انکار کرتے تھے ۔
۴۷۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی ۔
۴۸۔ لہٰذا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے لیے سود مند نہیں ہوگی ۔

تفسیر

تم اہلِ دوزخ کیوں ہوگئے ؟

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گزشتہ آیات میں دوزخ اور دوزخیوں کے بارے میں آئی ہے ۔ ان آیات میں مزید کہتا ہے: "ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے" (کل نفس بما کسبت رهينة)۔

"رهينة"، "رهن" کے مادہ سے (گرو) کے معنی میں ہے اور یہ وہ وثیقہ ہے جو عام طور پر "قرض" کے مقابلہ میں دیتے ہیں گویا انسان کا تمام وجود اس کے وظائف، تکالیف اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں گرو ہے، جس وقت انھیں انجام دے لیتا ہے، آزاد ہو جاتا ہے، ورنہ قیدِ اسارت میں رہے گا ۔

اہلِ لغت کے بعض کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "رہن" کے معانی میں سے ایک ملازمت و ہمراہی ہے[1]۔ اس معنی کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا، کہ سب لوگ اپنے اعمال کے ہمراہ ہوں گے چاہے نیکوکار ہوں یا بدکار ۔

لیکن بعد والی آیات کے قرینہ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے ۔

لہٰذا بلا فاصلہ فرماتا ہے: "مگر اصحابِ یمین، جو اس اسارت کی قید سے آزاد ہیں"۔ (الا اصحاب اليمين)۔

انھوں نے ایمان اور عملِ صالح کے سائے میں، اسارت کے طوق اور زنجیروں کو توڑ دیا ہے، لہٰذا وہ بے حساب جنت میں داخل ہوں گے[2]۔

اس بارے میں کہ یہاں "اصحاب اليمين" سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔

---

[1] "لسان العرب" مادہ "رہن"

[2] اس بارے میں کہ یہاں استثناء "متصل" ہے یا "منقطع"، بعض نے مثلاً مرحوم شیخ طوسی نے "تبیان" میں اسے "منقطع" قرار دیا ہے اور بعض نے مثلاً "روح البیان" نے اسے متصل جانا ہے۔ یہ فرق ان مختلف تفسیروں کے ساتھ مربوط ہے جو ہم نے "رهينة" کے مفہوم کے بارے میں ذکر کی ہیں۔ جس تفسیر کو ہم نے انتخاب کیا ہے، اس کے مطابق استثناء منقطع ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق استثناء متصل ہوگا ۔ (غور کیجیے)

بعض نے تو اس کی ایسے افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔
اور بعض انھیں ایسے مومنین سمجھتے ہیں، جنھوں نے بالکل گناہ نہ کیا ہو، اور بعض فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور دوسرے احتمالات بھی ہیں۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے اور اس پر قرآن گواہ ہے، وہی پہلا معنی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان اور عملِ صالح کے حامل ہیں اور اگر ان سے کوئی چھوٹے موٹے گناہ ہوئے بھی ہوں، تو وہ ان کی نیکیوں کے تحت الشعاع میں ہیں اور ان الحسنات یذھبن السیئات)۔ (ھود ۱۱۴) کے حکم میں ہیں۔

ان کے نیک اعمال ان کے اعمالِ بد کو چھپالیں گے، یا تو وہ بلا حساب کے جنت میں وارد ہو جائیں گے، اور اگر ان کا حساب ہوا بھی، تو وہ سہل، سادہ اور آسان ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ انشقاق کی آیہ ۸ میں آیا ہے: فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا۔ لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، اس کا حساب آسان ہوگا۔"

اہلِ سنت کے مشہور مفسر "قرطبی" نے امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن و شیعتنا اصحاب الیمین، و کل من ابغضنا اھل البیت فھم المرتھنون

"ہم اور ہمارے شیعہ اصحابِ یمین ہیں اور جو شخص ہم اہلِ بیت کو دشمن رکھتا ہے، تو وہ اپنے اعمال کی قید میں ہے"۔[1]

اس حدیث کو دوسرے مفسرین، منجملہ "مجمع البیان" اور تفسیر "نور الثقلین" کے مؤلف اور بعض دوسروں نے بھی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

اس کے بعد "اصحاب الیمین" اور ان کے مدِمقابل گروہ کے حالات کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ جنت کے پُرنعمت اور باعظمت باغوں میں ہوں گے اور اس حال میں وہ سوال کریں گے" (فی جنات یتساءلون)۔[2]

"گنہ گاروں سے" (عن المجرمین)۔

---

[1] تفسیر "قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۸۷۸

[2] "یتساءلون" اگرچہ باب "تفاعل" سے ہے، جو عام طور پر دو افراد یا چند افراد کے درمیان ہونے والے کام کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہاں بعض دوسرے مقامات کے مانند ہی یہ معنی نہیں دیتا اور یہاں یہ "یسألون" کے معنی دیتا ہے۔ ضمنی طور پر "جنات" کا نکرہ ہونا اس کی عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ اور بہرحال "فی جنات" ایک محذوف مبتدا کی خبر ہے اور تقدیر میں یہ "ھم فی جنات" ہے۔

وہ کہیں گے: "تمھیں دوزخ میں کس چیز نے پہنچا دیا" (ماسلککم فی سقر)۔

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بہشتیوں اور دوزخیوں کے درمیان کلی طور پر رابطہ منقطع نہیں ہوگا، جنتی اپنے عالم سے دوزخیوں کی حالت کا مشاہدہ کر سکیں گے اور ان سے گفتگو کر سکیں گے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مجرمین "اصحاب الیمین" کے اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں ؟ وہ اس سلسلہ میں اپنے چار گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

پہلا یہ کہ" وہ کہیں گے: "ہم نمازگزاروں میں سے نہیں تھے" (قالوا لم نک من المصلین)۔

اگر ہم نماز پڑھتے، تو نماز ہمیں خدا کی یاد دلاتی اور فحشاء اور منکر سے روکتی، اور ہمیں خدا کی صراطِ مستقیم کی دعوت دیتی"۔

دوسرا یہ کہ" ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے" (ولم نک نطعم المسکین)۔

"اطعامِ مسکین" کا معنی اگرچہ غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، لیکن ظاہراً اس سے مراد، ضرورت مندوں کی ہر ضرورت و حاجت میں مدد کرنا ہے، چاہے وہ خوراک ہو یا پوشاک و مسکن وغیرہ۔

اور جیسا کہ مفسرین نے تصریح کی ہے، اس سے مراد" زکاتِ واجب" ہے، کیونکہ مستحبی انفاقات کو ترک کرنا جہنم میں داخل ہونے کا سبب نہیں بنتا، اور یہ آیت دوبارہ اس مطلب کی تاکید کرتی ہے کہ زکات کا حکم اجمالی طور پر مکہ میں ہی نازل ہوا تھا، اگرچہ جزئیات کی تشریح اور حدود کی خصوصیات کا تعین، خصوصاً اس کا بیت المال میں مرتکز ہونا، مدینہ میں ہوا تھا۔

تیسرا یہ کہ" ہم ہمیشہ اہلِ باطل کے ساتھ ہم نشین اور ہم صدا ہو جاتے ہیں" (و کنا نخوض مع الخائضین)۔

حق کے خلاف جس گوشہ سے بھی کوئی صدا بلند ہوتی اور جو مجلس بھی باطل کی ترویج کے لیے برپا ہوتی، اور ہم اس سے باخبر ہو جاتے تو ہم ان کا ساتھ دیتے۔ اور جماعت کے رنگ میں رنگے جاتے، ان کی باتوں کی تصدیق کرتے اور ان کے تکذیب اور انکار کرنے کو صحیح قرار دیتے اور حق کا استہزاء کرنے اور تمسخر اڑانے سے لذت حاصل کرتے تھے۔

"نخوض" "خوض" (بروزن حوض) کے مادہ سے، اصل میں پانی میں داخل ہونے اور اس میں حرکت کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد تمام امور میں داخل ہونے اور ان میں آلودہ ہونے کے لیے بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآن مجید میں اکثر باطل اور بے بنیاد مطالب میں وارد ہونے کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

"باطل میں خوض" ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے، جو ان لوگوں کی مجالس میں داخل ہونے کو بھی شامل ہے، جو آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، یا بدعت کی ترویج کرتے ہیں، یا پست اور چھچھوری باتیں کرتے ہیں، یا ان گناہوں کو جنھیں انھوں نے انجام دیا ہے، فخریہ اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، اسی طرح غیبت، تہمت اور لہو و لعب وغیرہ کی مجالس میں شرکت کرنا، لیکن زیرِ بحث آیت میں زیادہ تر ان مجالس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، جو خدا کے دین کو کمزور کرنے اور اس کے مقدسات کا استہزاء اور مذاق اڑانے اور کفر و شرک و

بے دینی کی ترویج کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور ہم ہمیشہ روز جزا کا انکار کیا کرتے تھے"۔ (وکنا نکذب بیوم الدین)۔

یہاں تک کہ ہماری موت کا وقت آپہنچا"۔ (حتّٰی اتانا الیقین)۔

یہ بات واضح ہے کہ معاد وقیامت اور حساب وجزا کے دن کا انکار تمام الٰہی اور اخلاقی قدروں کو متزلزل کر دیتا ہے اور انسان کو گناہ کے ارتکاب کی جرأت دلاتا ہے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے، خصوصًا اگر یہ مسئلہ آخر عمر تک ایک مسلسل عمل کی صورت اختیار کر لے۔

بہرحال ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اولاً کفار بھی، اصول دین کی طرح سے، فروع دین کے بھی مکلف ہیں اور اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ چاروں امور یعنی نماز، زکوٰۃ، اہل باطل کی مجالس کو ترک کرنا اور قیامت پر ایمان رکھنا، ایمان کی ہدایت اور تربیت میں حد سے زیادہ اثر رکھتے ہیں اور اس طرح سے جہنم، واقعی نمازگزاروں، زکوٰۃ دینے والوں، باطل کو ترک کرنے والوں اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کی جگہ نہیں ہے۔

البتہ نماز اس لحاظ سے کہ وہ خدا کی عبادت ہے لہٰذا وہ خدا پر ایمان کے بغیر اسے حاصل نہیں ہو سکتی، اس بناء پر اس کا ذکر، خدا پر ایمان واعتقاد اور اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی ایک رمز ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں امور توحید سے شروع ہوتے ہیں اور معاد وقیامت پر ختم ہوتے ہیں اور خالق ومخلوق اور انسان کے خود اپنے آپ سے ربط کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "یقین" سے مراد یہاں موت ہے، کیونکہ یہ مومن وکافر دونوں کے لیے ایک یقینی امر شمار ہوتی ہے اور انسان ہر چیز میں شک کر سکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کر سکتا، سورۂ حجر کی آیہ ۹۹ میں بھی آیا ہے واعبد ربک حتّٰی یأتیك الیقین "اپنے خدا کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آجائے"۔

لیکن بعض نے یہاں یقین کی، انسان کی موت کے بعد، برزخ وقیامت کے مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے جو پہلی تفسیر کے ساتھ ایک جہت سے ہم آہنگ ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، "لہٰذا شفاعت کرنے والوں میں سے کسی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں دے گی"۔ (فما تنفعهم شفاعة الشافعين)۔

نہ تو خدا کے انبیاء، رسولوں اور آئمہ معصومین کی شفاعت اور نہ ہی فرشتوں، صدیقین، شہداء اور صالحین کی شفاعت، کیونکہ شفاعت کے لیے مناسب حالات کی ضرورت ہے اور انہوں نے تمام اسباب کو کلی طور پر ختم کر دیا ہے۔ شفاعت اس شفاف پانی کے مانند ہے، جسے کسی کمزور پودے کی جڑ پر ڈالا جائے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اگر پودا کلی طور پر مرچکا ہو تو یہ صاف ستھرا پانی اسے زندہ نہیں کر سکتا، دوسرے لفظوں میں جیسا کہ ہم شفاعت کی بحث میں بیان کر چکے ہیں، "شفاعت" شفع کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضمیمہ کرنے کے معنی میں ہے اور

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جا رہی ہے اس نے راستہ کا کچھ حصّہ اپنے پاؤں سے طے کیا ہے اور سخت قسم کے نشیب و فراز میں رہ گیا ہے، شفاعت کرنے والا اس کا ضمیمہ بن کر اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ باقی راستہ طے کرلے۔[1]

ضمنی طور پر یہ آیت، دوبارہ مسئلہ شفاعت اور بارگاہِ خداوندی میں شفاعت کرنے والوں کے تنوع اور تعدد کی تاکید کرتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اصل شفاعت کے منکر ہیں، ایک دندان شکن جواب ہے۔ اسی طرح یہ اس بات کے لیے ایک تاکید بھی ہے کہ شفاعت بے قید و شرط کے نہیں ہوگی اور گناہ کے لیے ہری جھنڈی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کی تربیت کا ایک ایسا عامل ہے جو اسے کم از کم اس مرحلہ تک پہنچا دے، کہ اس میں شفاعت کرانے کی قابلیت پیدا ہوجائے، اور خدا اور اس کے اولیاء سے اس کا رابطہ کلی طور پر منقطع نہ ہوجائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اوپر والی آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے اس قسم کے لوگوں کی شفاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ شفاعت ان کی حالت کے لیے سودمند نہیں ہوگی، لہٰذا وہ ان کی شفاعت نہیں کریں گے، کیونکہ اولیاء خدا لغو و بیہودہ کاموں کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ایک نکتہ

روزِ جزا کے شفاعت کرنے والے

زیرِ بحث آیات اور اسی طرح قرآنِ مجید کی بعض اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں شفاعت کرنے والے متعدد ہوں گے (اور ان کے شفاعت کا دائرہ مختلف ہوگا) ان تمام روایات سے جو شیعہ اور اہلِ سنت کے منابع سے نقل ہوئی ہیں ——— اور یہ روایات بہت زیادہ ہیں ——— معلوم ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کرنے والے قیامت کے دن ان گنہ گاروں کے لیے، جن میں شفاعت کی استعداد موجود ہے، شفاعت کریں گے۔

۱۔ سب سے پہلی شفاعت کرنے والی ہستی پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ مقدّس ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

انا اوّل شافع فی الجنة[2]

"جنت کے بارے میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا۔"

۲۔ تمام انبیاء قیامت کے دن شفاعت کریں گے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یشفع الانبیاء فی کل من یشھد ان لا الٰہ الا اللہ مخلصًا فیخرجونھم منھا

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اوّل، سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں

[2] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۳۰

"انبیاء ان تمام افراد کے بارے میں شفاعت کریں گے جو خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی وحدانیت کی گواہی دیں گے اور وہ انھیں دوزخ سے باہر نکال لیں گے"۔[1]

۲۔ فرشتے بھی روزِ محشر شفاعت کریں گے، جیسا کہ رسولِ خدا سے نقل ہوا ہے:

یؤذن للملائکة والنبیین والشهداء ان یشفعوا

"اس دن فرشتوں، انبیاء اور شہداء کو اجازت دی جائے گی کہ وہ شفاعت کریں"۔[2]

۴۔۵۔ آئمہ معصومینؑ اور ان کے شیعہ بھی شفاعت کریں گے، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

لنا شفاعة ولاهل مودتنا شفاعة

"ہمارے لیے حق شفاعت ہے اور ہمارے شیعہ اور دوستوں کے لیے بھی مقام شفاعت ہے"۔[3]

۶، ۷۔ علماء اور دانشور اور اسی طرح شہداء راہِ خدا شفاعت کرنے والوں میں سے ہوں گے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

یشفع یوم القیامة الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء

روزِ قیامت پہلے انبیاء شفاعت کریں گے، پھر علماء اور اس کے بعد شہداء"۔[4]

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

یشفع الشهید فی سبعین انسانا من اهل بیته

"شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر افراد تک قابلِ قبول ہوگی"۔[5]

ایک اور دوسری حدیث میں جسے مرحوم "علامہ مجلسیؒ" نے "بحار الانوار" میں نقل کیا ہے:

"ان کی شفاعت ستر ہزار افراد کے لیے قابلِ قبول ہوگی"۔[6]

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ستر اور ستر ہزار کا عدد دونوں اعداد تکثیر میں سے ہیں، لہٰذا ان دونوں روایات میں کوئی منافات نہیں ہے۔

۸۔ قرآن بھی قیامت کے دن شفاعت کرے گا، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

---

[1] "مسند احمد" جلد ۳ ص ۱۲

[2] "مسند احمد" جلد ۵ ص ۴۳

[3] "خصال الصدوق" ص ۶۲۴

[4] "سنن ابی ماجہ" جلد ۲ ص ۱۴۴۳

[5] "سنن ابی داؤد" جلد ۲ ص ۱۵

[6] "بحار الانوار" جلد ۱۰۰ ص ۱۴

واعلموا انّه (القرآن) شافع ومشفع

"جان لو کہ قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور مقبول الشفاعة ہے"[1]

۹۔ وہ لوگ جنھوں نے ایک عمر اسلام میں صرف کی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

اذا بلغ الرجل التسعين غفر الله ماتقدّم من ذنبه وما تأخر وشفّع فی اهله

"جب انسان نوے سال کا ہو جاتا ہے (اور ایمان کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے) تو خدا اس کے گزشتہ اور آئندہ کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے"[2]

۱۰۔ عبادات بھی شفاعت کریں گی، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ خدا سے آیا ہے:

الصيام والقرآن يشفعان للعبد يوم القيامة

"روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندوں کی شفاعت کریں گے"[3]

۱۱۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک اعمال بھی مثلاً وہ امانت جس کی حفاظت کرنے میں انسان نے کوشش کی ہو، قیامت میں انسان کی شفاعت کریں گے[4]

۱۲۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود خداوندِ عالم بھی گنہ گاروں کی شفاعت کرے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ اکرمؐ سے آیا ہے:

يشفع النبيون والملائكة والمؤمنون فيقول الجبار بقيت شفاعتی

"قیامت میں انبیاء، فرشتے اور مومنین شفاعت کریں گے اور خدا کہے گا، خود میری شفاعت باقی رہ گئی ہے"[5]

اس بارے میں روایات بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ ان کا ایک گوشہ ہے[6]

ہم دوبارہ اس بات کو دہراتے ہیں کہ شفاعت کے کچھ شرائط و قیود ہیں، جن کے بغیر شفاعت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں یہ معنی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ مجرموں کے ایک گروہ کے بارے میں تمام شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بے اثر ہو گی۔ اہم بات یہ ہے کہ قابل میں قابلیت بھی ہو، کیونکہ فاعل کی فاعلیت اکیلی کافی نہیں ہے (ہم اس سلسلے میں مزید تشریح جلد اوّل میں شفاعت کی بحث میں پیش کر چکے ہیں)۔

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۷۶

[2] "مسند احمد" جلد ۲ ص ۸۹

[3] "مسند احمد" جلد ۲ ص ۱۷۴

[4] "مناقب ابن شہر آشوب" جلد ۲ ص ۱۴

[5] "صحیح بخاری" جلد ۹ ص ۱۴۹

[6] مزید وضاحت کے لیے کتاب "مفاہیم القرآن" جلد ۴ ص ۲۰۸ تا ۳۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

۴۹۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ○
۵۰۔ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ○
۵۱۔ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ○
۵۲۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ○
۵۳۔ كَلَّا ۖ بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ○
۵۴۔ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ○
۵۵۔ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ○
۵۶۔ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ○

ترجمہ

۴۹۔ وہ اس تذکرہ سے گریزاں کیوں ہیں ؟
۵۰۔ گویا وہ وحشت زدہ گدھے ہیں۔
۵۱۔ جو شیر سے بھاگ رہے ہیں۔
۵۲۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اس بات کا منتظر ہے (کہ خدا کی طرف سے) ایک علیحدہ خط اسے بھیجا جائے۔
۵۳۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔
۵۴۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، وہ (قرآن) تو ایک تذکرا اور یاد آوری ہے۔
۵۵۔ جو شخص چاہتا ہے اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔
۵۶۔ اور کوئی شخص نصیحت نہیں لیتا مگر یہ کہ خدا چاہے وہ اہلِ تقویٰ اور اہل مغفرت ہے۔

تفسیر

حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیر سے گدھے

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گزشتہ آیات میں مجرموں اور دوزخیوں کے بارے میں آئی تھی، زیرِ بحث آیات میں اس معاند اور ہٹ دھرم گروہ کی حق بات سننے، اور ہر قسم کی پند و نصیحت سے وحشت کرنے کو، واضح ترین صورت میں بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: "وہ اس تذکرا اور یادآوری سے روگرداں کیوں ہیں؟" (فمالھم عن التذکرۃ معرضین)۔[1]

وہ قرآن جیسی شفا بخش دوا سے فرار کیوں کرتے ہیں؟ وہ ہمدرد طبیب کی بات کو رد کیوں کرتے ہیں؟ واقعاً تعجب کا کام ہے۔

"گویا وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگنے والے گدھے ہیں"۔ (کانّھم حمر مستنفرۃ)۔

"جنھوں نے شیر یا شکاری) سے فرار کیا ہے" (فرّت من قسورۃ)۔

"حمر"، "حمار" کی جمع ہے، گدھے کے معنی میں، البتہ یہاں شیر یا شکاری کے چنگل سے قرار کے قرینے سے، وحشی گدھا یا "گورخر" مراد ہے[2] دوسرے لفظوں میں یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو وحشی اور اہلی دونوں قسم کے گدھے کو شامل ہے۔

"قسورۃ" "قسر" کے مادہ سے —— (جو قہر و غلبہ کے معنی میں ہے) —— لیا گیا ہے، اور وہ شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور بعض نے اس کی تیر انداز یا شکاری کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

مشہور ہے کہ "وحشی گدھا" "شیر" سے عجیب و غریب وحشت رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیر کی آواز کو سنتا ہے تو اس طرح کی وحشت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ وہ دیوانہ وار ہر طرف کو بھاگتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب شیر اُن کے گلہ میں پہنچ جائے تو وہ اس طرح سے پراگندہ ہو کر ہر طرف کو دوڑتے ہیں کہ یہ منظارہ عجیب افراتفری کا عالم پیش کرتا ہے۔ (آج کل فلموں میں شیر کو جانوروں کا شکار کرتے ہوئے عام دکھایا جاتا ہے)

بہرحال یہ آیت، مشرکین کے قرآن کی روح پرور آیات سے وحشت کرنے اور ان سے فرار کرنے کی ایک بہت ہی رسا، گویا اور ناطق تعبیر ہے، ان کو گورخر کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس میں عقل و شعور بھی نہیں ہے اور وحشی ہونے کی بناء پر ہر چیز سے گریزاں بھی ہے، حالانکہ اُن کے سامنے "تذکرہ" (یادآوری، بیداری اور ہوشیاری کے ایک وسیلہ کے) سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

---

[1] اس جملہ میں "ما" "مبتدا" ہے اور "لھم" "خبر" اور "معرضین" "لھم" کی ضمیر کے لیے حال ہے اور "عن التذکرۃ" "جار و مجرور" "معرضین" سے متعلق ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "عن التذکرۃ" کا "معرضین" سے مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ صرف مفید قسم کی یادآوریوں سے منہ پھیرتے ہیں، بہرحال یہاں "تذکرہ" سے مراد، ہر قسم کی مفید و سودمند یادآوری ہے، جن کا رأس و رئیس قرآن مجید ہے۔

[2] "گورخر"، "گور" بمعنی "صحرا" اور "خر" بمعنی (گدھا) سے مرکب ہے، اسی لیے اس کو خر وحشی اور خر صحرائی بھی کہتے ہیں۔

لیکن اس نادانی اور بے خبری کے باوجود وہ ایسے مغرور اور متکبر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ خدا کی طرف سے اسے ایک علیحدہ خط دیا جائے" (بل یرید کل امرئ منهم ان یؤتی صحفا منشرة)۔[1]

یہ اس چیز کے مشابہ ہے، جو سورۂ اسراء کی آیہ ۹۳ میں آئی ہے: (ولن نؤمن لرقیك حتّٰی تنزل علینا کتابا نقرؤه) "اگر تو آسمان پر بھی چڑھ جائے تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ (خدا کی طرف سے) ہم پر تو کوئی خط نازل کرے"، یا سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۴ کی طرح ہے جو یہ کہتی ہے: (قالوا لن نؤمن حتّٰی نؤتی مثل ما اوتی رسل الله) وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ وہی چیز جو اللہ کے رسولوں پر نازل ہوتی ہے، ہمیں نہ دی جائے"۔

اور اس طرح سے ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اولوالعزم پیغمبر ہو اور خدا کی طرف سے اس کے نام کا خصوصی خط آسمان سے نازل ہو، اور اگر اس قسم کی چیز ان پر نازل ہو بھی جاتی تب بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے، جب تک تو آسمان سے ایسا ایک خط نہ لے آئے جس کا عنوان یہ ہو: "خداوند رب العالمین کی طرف سے فلاں بن فلاں کے نام"، اور اس میں رسمی طور پر یہ حکم دیا جائے کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں۔[2]

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جس طرح سے وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے"۔ (کلا)۔

ان پر آسمانی کتاب کا نازل ہونا اور اسی قسم کے دوسرے مطالب یہ سب بہانے ہیں۔

"حقیقت میں وہ آخرت سے نہیں ڈرتے" (بل لا یخافون الاٰخرة)۔

اگر وہ آخرت سے ڈرتے ہوتے، تو یہ سب بہانے نہ کرتے، رسولِ خدا کی تکذیب نہ کرتے، آیاتِ الٰہی کا مذاق نہ اڑاتے اور عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کو استہزاء کا ذریعہ نہ بناتے۔

اور یہاں سے تقویٰ، گناہ سے پرہیز اور انواع و اقسام کے گناہانِ کبیرہ سے پاک ہونے میں، معاد پر ایمان کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ عالم محشر پر ایمان اور قیامت میں جزا و سزا ملنے کا عقیدہ، انسان کو ایک نئی شخصیت عطا کرتا ہے اور بے قید و بند، متکبر، خود خواہ اور ظالم افراد کو، عہد کی پابندی کرنے والے، متقی، متواضع اور عدالت پیشہ انسان میں تبدیل کر سکتا ہے۔

---

[1] "صحف"، "صحیفہ" کی جمع ہے، جو اس ورق کے معنی میں ہے، جسے اِس طرف اور اُس طرف کرتے ہیں، (چونکہ "صحف" اور "صحیفہ" کا اصل مادہ چہرہ کی مانند پھیلی ہوئی چیز کے معنی میں ہے، اس لیے خط اور کتاب پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

[2] تفسیر "قرطبی"، وتفسیر "مراغی" اور دوسری تفاسیر

اس کے بعد ایک مرتبہ اور تاکید کرتا ہے کہ جس طرح وہ قرآن کے بارے میں سوچتے ہیں ایسا نہیں ہے" (کلاّ)۔ "یقیناً قرآن تو تذکر اور یاد آوری ہے" (انہ تذکرۃ)۔

"اور جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے" (فمن شاء ذکرہ)۔

قرآن نے راستے کی نشاندہی کر دی ہے، اور دیکھنے والی آنکھوں کو بھی اختیار دے دیا ہے اور نورِ آفتاب بھی ہے تاکہ انسان اپنے آگے دیکھ کر چلے۔

اس کے باوجود اس سے پند و نصیحت حاصل کرنا، خدا کی مشیت اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور وہ نصیحت نہیں لیتے مگر یہ کہ خدا چاہے (وما یذکرون الّا ان یشاء اللہ)۔

اس جملہ کی کئی تفسیریں ہیں، ایک تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، یعنی انسان پروردگار کی عنایت کے دامن سے متوسل ہوئے بغیر ہدایت کی راہ کو طے نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس کی توفیق و امداد کے بغیر ہدایت پا سکتا ہے۔ ؎

تاکہ از جانبِ معشوق نباشد کششی
کوشش عاشق بے چارہ بہ جائے نہ رسد

"جب تک محبوب کی طرف سے کشش نہ ہو
بے چارے عاشق کی کوشش کچھ کام نہیں دیتی"

البتہ یہ خدائی امداد استعداد رکھنے والوں پر نازل ہوتی ہے۔

دوسری یہ کہ: "فمن شاء ذکرہ" کا جملہ جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ توہم پیدا کرے کہ ہر چیز خود انسان کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کا ارادہ ہر لحاظ سے استقلال رکھتا ہے، تو یہ آیت اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے کہتی ہے کہ انسان مختار و آزاد ہونے کے باوجود مشیتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، وہ مشیت جو سارے عالمِ ہستی اور جہان آفرینش پر حکم فرما ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کا یہی اختیار و آزادی بھی، اس کی مشیت کے ساتھ ہے اور وہ جس لمحہ چاہے، اس کو اس سے لے لے۔

تیسری یہ کہ کہتا ہے: وہ کسی قیمت پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ خدا چاہے اور انھیں مجبور کر دے، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کسی کو ایمان یا کفر پر مجبور نہیں کرتا۔

البتہ پہلی اور دوسری تفسیر بہتر اور زیادہ مناسب ہے۔

اور آیت کے آخر میں کہتا ہے: "وہ اہلِ تقویٰ اور اہلِ مغفرت ہیں"۔ (ھو اھل التقوٰی واھل المغفرۃ)۔

مناسب یہی ہے کہ اس کے عتاب سے ڈریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں، اور یہی شائستہ بات ہے کہ اس کی مغفرت کے امیدوار رہیں۔

حقیقت میں یہ جملہ "خوف" و "رجاء" کے مقام اور "عذاب" و "مغفرت" الٰہی کی طرف اشارہ ہے، اور یہ حقیقت میں پہلی

آیت کے لیے ایک علت کو بیان کرتی ہے ۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا : خدا فرماتا ہے :

انا اهل ان اتقی، ولا یشرك بی عبدی شیئًا وانا اهل ان لم یشرك بی شیئًا ان ادخله الجنة

"میں اس لائق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے اور میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے اور میں اس کا اہل ہوں کہ اگر میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے تو میں اسے جنت میں داخل کروں" [1]

اگرچہ تمام مفسرین نے ——— جہاں تک ہم نے دیکھا ہے ——— "تقویٰ" کی یہاں مفعول کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ خدا اس کا اہل ہے کہ اس سے (اس کے شرک اور نافرمانی سے) پرہیز کریں، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ فاعل کے معنی میں اس کی تفسیر ہو۔ یعنی خدا اہلِ تقویٰ ہے اور وہ ہر قسم کے ظلم، قبیح فعل اور ہر قسم کے خلافِ حکمت کام سے پرہیز کرتا ہے، اور حقیقت میں تقویٰ کا بالاترین مقام خدا ہی کے لیے ہے، اور بندوں میں جو کچھ ہے وہ اس غیر متناہی تقوایٰ کی ایک ضعیف سی چنگاری ہے، اگرچہ خدا کے بارے میں اسم فاعل کے معنی میں "تقویٰ" کی تعبیر بہت کم ہوتی ہے ۔

بہر حال یہ سورہ "انذار" اور "وظائف اور ذمہ داریوں" کے حکم سے شروع ہوا اور "تقوایٰ" کی دعوت اور "مغفرت کے وعدے" پر ختم ہوا، یہ وہ مقام ہے جہاں ہم انتہائی خضوع اور تضرع کے ساتھ اس کی مقدس بارگاہ میں عرض کرتے ہیں :

پروردگارا ! ہمیں تقوایٰ اور اپنی مغفرت کے مستحق افراد میں قرار دے ۔

خداوندا ! جب تک تیری توفیق اور تیرا لطف ہماری دستگیری نہیں کرے گا ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہمیں اس عنایت کا مشمول فرما ۔

بارالٰہا ! جال سخت ہے اور راستہ پرپیچ و خم ہے اور شیطان گمراہ کرنے پر آمادہ ہے، اس راستہ کو تیری مدد کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا، ہماری مدد فرما ۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ مدثر کا اختتام ۱۹ ماہِ صفر ۱۴۰۷ ھ

اختتام ترجمہ

پونے پانچ بجے سہ پہر بروز پیر ۱۱ صفر ۱۴۰۸ ہجری

مطابق ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۱۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور

صفدر حسین نجفی

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۰۵

سورۂ قیامت

یہ سورۂ مکّہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۱۹ صفر ۱۴۰۷ھ

سورۂ قیامت کے مضامین

جیسا کہ اس سورہ کے نام سے واضح ہے یہ قیامت کے دن اور معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتی ہے، سوائے چند آیات کے، جو قرآن مجید اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور وہ مباحث جو اس سورہ میں قیامت کے بارے میں آئے ہیں وہ مجموعی طور پر چار قسم پر ہیں :

۱۔ اشراط الساعۃ (وہ عجیب و غریب اور بہت ہی ہولناک حوادث، جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے وقت رونما ہوں گے) سے مربوط مسائل۔

۲۔ اس دن نیکو کاروں اور بدکاروں کی حالت سے مربوط مسائل۔

۳۔ موت کے پُر اضطراب لمحوں اور اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال سے مربوط مسائل

۴۔ انسان کی خلقت کے مقصد سے مربوط مسائل اور اس کا مسئلہ معاد سے ربط

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

من قرأ سورة القيامة شهدت انا وجبريل له يوم القيامة انه كان مؤمنًا بيوم القيامة، وجاء وجهه مسفر على وجوه الخلائق يوم القيامة

"جو شخص سورۂ قیامت کو پڑھے گا، تو میں اور جبرئیل اس کے لیے قیامت کے دن گواہی دیں گے، کہ وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتا تھا، اور اس دن اس کا چہرہ تمام لوگوں سے زیادہ درخشندہ ہوگا"[1]

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۹۲

من ادمن قراءة "لا اقسم" وكان يعمل بها، بعثها الله يوم القيامة معه في قبره، في احسن صورة تبشره وتضحك في وجهه، حتى يجوز الصراط والميزان

"جو شخص سورہ "لا اقسم" (قیامت) کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا، تو خدا اس سورہ کو قیامت کے دن اس کے ہمراہ، اس کی قبر سے بہترین چہرے کے ساتھ اٹھائے گا، اور یہ مسلسل اس کو بشارت دیتی رہے گی اور اس کے سامنے ہنستی رہے گی، یہاں تک کہ وہ پل صراط اور میزان سے گزر جائے گا"۔[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں دوسرے مقامات پر جو کچھ ہم نے قرآن سے معلوم کیا تھا وہ یہاں متن روایت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: جو شخص اس کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا" اور اس پر عمل کرے گا" اس بناء پر یہ سب کچھ اس کے مضمون کا پابند ہونے اور اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۹۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ ○

۲۔ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ○

۳۔ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ○

۴۔ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ○

۵۔ بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَهٗ ○

۶۔ یَسۡـَٔلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَةِ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قیامت کے دن کی قسم

۲۔ اور نفسِ لوامہ، بیدار اور ملامت کرنے والے وجدان کی قسم (کہ قیامت حق ہے)۔

۳۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔

۴۔ ہاں! ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں (کے سرے کی لکیروں) کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں۔

۵۔ (انسان قیامت کے بارے میں شک نہیں رکھتا) بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ (آزاد رہے اور) زندگی بھر گناہ کرتا رہے۔

۶۔ (اسی لیے) پوچھتا ہے کہ قیامت کب ہوگی۔

تفسیر

قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے وجدان کی قسم

یہ سورہ دو پُر معنی قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے ، فرماتا ہے : " قیامت کے دن کی قسم " (لا اُقسم بیوم القیامۃ)۔

" اور قسم ہے انسان کے بیدار وجدان اور ملامت کرنے والے نفس کی "۔ (ولا اقسم بالنفس اللوّامۃ)۔

اس بارے میں کہ " لا " ان دونوں آیات میں " زائدہ " اور تاکید کے لیے ہے (اس بناء پر قسم کی نفی نہیں کرتا ، بلکہ اس کی اور زیادہ تاکید کرتا ہے) ، یا " لا " نافیہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کہے کہ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ میں اس کی قسم نہیں کھاتا (جیسا کہ لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں ، میں تیری جان کی قسم نہیں کھاتا کہ وہ قسم سے برتر ہے) مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔

اکثر مفسرین نے پہلے احتمال کو انتخاب کیا ہے ، جبکہ بعض دوسری تفسیر کے طرفدار ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ " لا " زائدہ ابتدائے کلام میں نہیں آتا ، بلکہ اسے وسطِ کلام میں ہونا چاہیے ۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے ، کیونکہ قرآن نے قیامت سے زیادہ اہم امور مثلاً خدا کی پاک ذات کی قسم کھائی ہے ، اس بناء پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں قیامت کے دن کی قسم نہ کھائی جائے اور " لا " زائدہ کے آغازِ کلام میں ہونے کی کئی مثالیں موجود ہیں ، جیسا کہ امرءالقیس کے اشعار میں آیا ہے کہ اس نے اپنے قصائد کے آغاز میں لاء زائدہ کا استعمال کیا ہے [1]

لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق " لا " کے زائدہ ہونے یا نافیہ ہونے کے بارے میں بحث کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ، کیونکہ دونوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے ، اور وہ اس موضوع کی اہمیت ہے ، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے ۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ان دونوں قسموں (قیامت کے دن کی قسم اور بیدار وجدان کی قسم) کے درمیان کیا رابطہ ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ معاد کے وجود کی ایک دلیل ، انسان کی روح کے اندر ، " محکمہ وجدان " کا وجود ہے ، جو نیک کام کو انجام دینے کے وقت ، انسان کی روح کو خوشی اور نشاط سے پر کر دیتا ہے ، اور اس طریقہ سے اسے جزا دیتا ہے اور بُرے کام کے انجام دینے یا کسی جرم کا ارتکاب کرنے کے موقع پر ، اس کی روح پر سخت دباؤ ڈال کر اسے سزا دیتا ہے اور شکنجہ میں جکڑتا ہے ۔ یہاں تک کہ بعض روایات وجدان کے عذاب سے نجات پانے کے لیے انسان خودکشی تک کا اقدام کر لیتا ہے ۔

---

[1] لا و ابیک ابنۃ العامر

لا یدعی القوم انی افر

" اے دختر عامر تیرے باپ کی قسم ہے ، قوم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھاگ جاؤں گا "

یعنی حقیقت میں وجدان نے اس کے قتل کرنے کا حکم صادر کیا ہے اور وہ اسے اپنے ہاتھ سے اجراء کرتا ہے ۔

"نفس لوامہ" کا دِ عمل اور اثر انسانوں کے وجود میں بہت ہی وسیع و عریض ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ غور و مطالعہ ہے، اور ہم نکات کی بحث میں اس کی طرف مزید اشارہ کریں گے ۔

جب "عالم صغیر" یعنی انسان کا وجود اپنے اندر ایک چھوٹا سا محکمہ اور عدالت رکھتا ہے تو" عالم کبیر" اپنی اس عظمت کے باوجود، ایک عظیم محکمہ عدل کیوں نہ رکھتا ہوگا ۔

اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہم " وجدان اخلاقی " کے وجود سے " قیامت اور معاد " کے وجود کی ٹوہ لگاتے ہیں اور یہیں سے ان دونوں قسموں کا ایک عمدہ رابطہ واضح ہوجاتا ہے اور دوسرے لفظوں میں دوسری قسم پہلی قسم کی ایک دلیل ہے ۔

اس بارے میں کہ " نفسِ لوامہ" [۱] سے کیا مراد ہے ؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک مشہور تفسیر تو وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے ۔ یعنی" اخلاقی وجدان" جو انسان کو غلط اعمال کے وقت اسی دنیا میں ملامت کرتا ہے اور تلافی و تجدید منظر پر اُسے ابھارتا ہے ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد تمام انسانوں کا قیامت میں اپنی خود ملامت کرنا ہے، مومنین اس لیے اپنے آپ کو ملامت کریں گے کہ ہم نے نیک اعمال تھوڑے کیوں کیے ؟ اور کفار اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر و شرک اور گناہ کی راہ کیوں اختیار کی ؟

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد صرف کافروں کا نفس ہے، جو قیامت میں ان کی، ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے بہت زیادہ ملامت اور سرزنش کرے گا ۔

لیکن قبل و بعد کی آیت کے ساتھ مناسب وہی پہلی تفسیر ہی ہے ۔

ہاں! یہ عدالتِ وجدان اتنی عظمت و احترام کی حامل ہے کہ خدا اس کی قسم کھا رہا ہے اور اس کو عظیم شمار کرتا ہے اور واقعًا وہ عظیم و بزرگ ہے کیونکہ وہ انسان کی نجات کا ایک اہم عامل شمار ہوتی ہے، بشرطیکہ وجدان بیدار ہو اور کثرتِ گناہ کی وجہ سے ضعیف و ناتوان نہ ہوجائے ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان دو پر اہمیت اور پر معنی قسموں کے بعد یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ کس چیز کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور اصطلاح کے مطابق " مقسم لہ " محذوف ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد والی آیات کے سیاق سے مطلب بالکل واضح ہے ۔ اس بناء پر اوپر والی آیات اس طرح کا معنی دیتی ہیں " قیامت کے دن اور نفسِ لوامہ کی قسم ہے کہ تم سب قیامت میں اٹھائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا بدلہ پاؤ گے [۲] ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے دن کی قسم کھائی گئی ہے جو قیامت، اور قبروں سے اٹھنے کا دن ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبروں سے اٹھنے کا مسئلہ اتنا مسلّم شمار کیا گیا ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں اس کی قسم تک کھائی جاسکتی ہے ۔

اس کے بعد ایک استفہام انکاری کے عنوان سے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: " کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو

---

[۱] " لوامہ " مبالغہ کا صیغہ ہے، اور بہت زیادہ ملامت کرنے والے کے معنی میں ہے ۔

[۲] تقدیریں " لنبعثن یوم القیامۃ " یا " انکم تبعثون " ہے ۔

جمع نہیں کریں گے" (ایحسب الانسان الّن نجمع عظامہ)۔

ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں، کہ اس کی انگلیوں (کے سروں کی لکیروں) تک کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں" (بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوّی بنانہ)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جو پیغمبر کی ہمسائیگی میں رہتا تھا اور اس کا نام "علی بن ربیعہ" تھا، آنحضرت کی خدمت میں آیا اور اس نے روزِ قیامت کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کس طرح ہے؟ اور کب آئے گی؟ اس کے بعد اس نے مزید کہا: اگر میں اس دن کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں تو پھر بھی تیری تصدیق نہیں کروں گا اور تجھ پر ایمان نہیں لاؤں گا، کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ان ہڈیوں کو جمع کرے؟ یہ بات قابلِ یقین نہیں ہے۔

اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کو جواب دیا، لہٰذا پیغمبر نے اس ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے شخص کے بارے میں فرمایا:

اللّٰھم اکفنی شر جاری السوء

خداوندا! اس بُرے ہمسایے کے شر کو مجھ سے دور کر دے[1]

اس معنی ومفہوم کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، منجملہ ان کے سورۂ یٰس کی آیہ ۸، میں آیا ہے کہ معاد کے منکرین میں سے ایک شخص ایک بوسیدہ ہڈی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور پیغمبر سے یہ کہہ رہا تھا: (من یحی العظام وھی رمیم) ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، درآں حالیکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں"؟

ضمنی طور پر "یحسب" کی تعبیر ("حسبان" کے مادہ سے گمان کے معنی میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ منکرین اپنی کہی ہوئی بات پر ہرگز ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ صرف بے ہودہ اور بے بنیاد خیال اور گمانوں پر تکیہ کرتے تھے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ہڈیوں پر ہی کیوں تکیہ کیا ہے۔

اولاً تو ہڈیاں باقی اعضاء کی نسبت زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں، لہٰذا جب یہ ہی بوسیدہ اور خاک ہو جائیں اور ان کے غبار کے ذرات پراگندہ ہو جائیں تو ان کی بازگشت کی امید سطحی افراد کی نظر میں کم ہو جاتی ہے۔

ثانیاً ہڈی انسانی بدن کا اہم ترین رکن ہے کیونکہ بدن کا ہر ستون ہڈیوں سے مل کر بنتا ہے اور تمام حرکات اور گھومنا پھرنا اور بدن کی اہم کارکردگیاں ہڈیوں کے ذریعہ ہی انجام پاتی ہیں اور انسان کے بدن میں ہڈیوں کی کثرت اور مختلف اشکال و انداز سے، خدا کی خلقت کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں اور انسان کی پشت کے ایک ہی مہرے کی قدر و قیمت کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ بیکار ہو جائے اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا سارا بدن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

"بنان" لغت میں "انگلیوں" کے معنی میں بھی آتا ہے اور "انگلیوں کے سروں" (پوروں) کے معنی میں بھی، اور دونوں صورتوں میں

---

[1] اس روایت کو "مراغی" نے اور اسی طرح "روح المعانی" اور "تفسیر صافی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ایک ہی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نہ صرف ہڈیوں کو جمع کرے گا اور انھیں پہلی حالت کی طرف پلٹائے گا بلکہ انگلیوں کی چھوٹی پتلی اور باریک ہڈیوں کو بھی ان کی اپنی جگہ پر قرار دے گا، اور ان سے بھی بالاتر بات یہ ہے کہ انگلیوں کے پوروں تک کو موزوں صورت میں پہلی حالت میں پلٹا دے گا۔

یہ تعبیر ممکن ہے، انسانی پوروں کی لکیروں کی طرف، ایک لطیف اشارہ ہو، کہتے ہیں کہ بہت کم انسان روئے زمین میں ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کے پوروں کی لکیریں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہوں یا دوسرے لفظوں میں باریک اور پیچیدہ لکیریں جو ہر انسان کے پوروں میں نقش ہوتی ہیں، اس شخص کے تعارف کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارے زمانہ میں " انگشت نگاری " (پوروں کی لکیروں کے آثار کو ضبط کرنے) کا شعبہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اس کے ذریعہ بہت سے مجرم پہچانے جاتے ہیں اور بہت سے جرموں کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک چور کمرے یا کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ دروازے کے قبضہ یا کمرے کے شیشے یا تالے اور صندوق پر رکھتا ہے تو اس کی انگلی کی لکیریں اس پر رہ جاتی ہیں، تو فوراً اس کا نمونہ حاصل کر کے، چوروں اور مجرموں کے سابقہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت کر کے، مجرم کو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں معاد کے انکار کی ایک حقیقی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ایسا نہیں ہے کہ انسان ہڈیوں کے جمع کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے پر خدا کی قدرت کے بارے میں شک رکھتا ہو، بلکہ ان کا مقصد انکار کرنے سے یہ ہے کہ وہ ساری زندگی گناہ کرتا رہے" (بل یرید الانسان لیفجر امامہ)۔

وہ چاہتا ہے کہ انکار معاد کے ذریعہ ہر قسم کی ہوس رانی ظلم و بیداد گری اور گناہ کے لیے آزادی حاصل کرے اور اس طریقہ سے چھوٹ طور سے سیر کرے، اور مخلوقِ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنے لیے کسی جوابدہی کا قائل نہ ہو، کیونکہ معاد و قیامت پر ایمان رکھنا اور دادگاہ عدل الٰہی کا قائل ہونا، ہر قسم کے عصیان و گناہ کے مقابلہ میں ایک عظیم رکاوٹ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس لگام کو پکڑے اور اس بند کو توڑ دے اور آزادانہ طور پر جو عمل چاہے وہ کرتا پھرے۔

یہ بات گزشتہ زمانوں کے ساتھ ہی منحصر نہیں تھی آج بھی مادیت کی طرف میلان اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک سبب، فسق و فجور، ذمہ داریوں سے گریز اور ہر قسم کے خدائی قانون کو توڑنے کے لیے آزادی حاصل کرنا ہے، ورنہ مبداء و معاد کے دلائل واضح و آشکار ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

یقدم الذنب ویؤخر التوبۃ و یقول سوف اتوب

" آیت میں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے جو گناہ کو آگے رکھتا ہے اور توبہ کو تاخیر میں ڈالتا ہے، اور کہتا ہے، میں بعد میں توبہ کر لوں گا۔"

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں " فجور " سے مراد " جھٹلانا " ہے، اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہے: انسان چاہتا ہے کہ معاد و قیامت کو جو اس کے سامنے ہے جھٹلائے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اور اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس لیے پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟ (یسئل ایان یوم القیامۃ)۔
ہاں! وہ ذمہ داریوں سے گریز کے لیے قیام قیامت کے وقت کے بارے میں، استفہام انکاری کے طور پر پوچھتا ہے، تاکہ
فسق و فجور کے لیے راستہ ہموار کرے۔

اس نکتہ کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ قیامت کے وقت کے بارے میں ان کا سوال کرنا، اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ اصل قیامت قبول کرتے ہیں اور صرف اس کے وقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، بلکہ یہ سوال اصل قیامت کے انکار کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے، ٹھیک اس طرح سے جیسا کہ کوئی کہے "فلاں شخص سفر سے آئے گا" اور جب اس کے آنے میں طول ہو اور وہ نہ آئے تو دوسرا شخص جو اس مسافر کے آنے کا منکر ہو، یہ کہتا ہے: وہ مسافر کب آئے گا؟

چند نکات

۱۔ عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغریٰ

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ روح اور نفسِ انسانی تین مراحل رکھتی ہے؛

۱۔ "نفسِ امارہ" یعنی سرکش نفس، جو انسان کو ہمیشہ برائیوں اور بدیوں کی دعوت دیتا ہے اور شہوات اور فجور کو اس کے سامنے زینت بخشتا ہے، یہ وہی چیز ہے کہ جب اس ہوس باز عورت، عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے بُرے کام کے انجام کا مشاہدہ کیا تو کہا: وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء "میں ہرگز اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتی، کیونکہ سرکش نفس ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے"
(یوسف ــــ ۵۳)

۲۔ "نفسِ لوامہ" جس کی طرف زیرِ بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے، وہ بیدار اور نسبتاً آگاہ و باخبر نفس ہے، اگرچہ اس نے گناہ کے مقابلہ میں معصومیت حاصل نہیں کی ہے لہٰذا اس سے بعض اوقات لغزش ہو جاتی ہے۔
اور وہ گناہ کر بیٹھتا ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد بیدار ہو جاتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے اور سعادت کی راہ کی طرف لوٹ آتا ہے، اس کی طرف سے انحراف کامل طور پر ممکن ہے لیکن وہ وقتی ہوتا ہے، دائمی نہیں، اس سے گناہ تو سرزد ہو جاتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں گزرنے پاتی کہ وہ اپنے طور پر ملامت، سرزنش اور توبہ کا آغاز کر دیتا ہے۔
یہ وہی چیز ہے کہ جسے "اخلاقی وجدان" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور بعض انسانوں میں بہت قوی اور طاقتور ہوتا ہے، بعض میں بہت ضعیف و ناتواں، لیکن اس کے باوجود یہ ہر انسان میں موجود ہوتا ہے یا اور بات ہے کہ کثرتِ گناہ کی وجہ سے اسے بیکار بنا دیا جائے۔

۳۔ "نفسِ مطمئنہ" یعنی تکامل وارتقاء کو پہنچی ہوئی روح، جو اطمینان کے مرحلہ تک پہنچی ہوئی ہو، جس نے سرکش نفس کو رام کر لیا ہو اور تقوائے کامل اور احساسِ مسئولیت کے مقام پر پہنچ گئی ہو کہ اب اس کے لیے آسانی کے ساتھ لغزش کرنا ممکن نہ رہے۔

یہ وہی چیز ہے، جس کے بارے میں سورۂ والفجر کی آیہ ۲۷، ۲۸ میں فرماتا ہے: یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ـــــــ "اے نفسِ مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، جبکہ تو بھی اس سے راضی ہے اور وہ بھی تجھ سے خوش ہے"۔

بہرحال ـــــ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ـــــ یہ "نفسِ لوّامہ" انسان میں ایک چھوٹی سی قیامت ہے اور نیک یا بد کام انجام دینے کے بعد، جان کے اندر اس کا محکمہ بلا فاصلہ قائم ہو جاتا ہے اور وہ اس کا حساب وکتاب کرتا ہے۔

اسی لیے بعض اوقات وہ ایک اچھے اور اہم کام کے مقابلہ میں ایسا اندرونی سکون محسوس کرتا ہے اور اس کی روح مسرت ونشاط سے اس طرح لبریز ہو جاتی ہے کہ جس کی لذت شان اور زیبائی کسی بیان اور قلم سے قابلِ توصیف نہیں۔

اس کے برعکس وہ بعض اوقات کسی غلطی اور عظیم جرم کے بعد ایسے وحشت ناک خواب، اور غم واندوہ کے طوفان میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اس طرح جلتا رہتا ہے کہ زندگی سے کلی طور پر سیر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس پریشانی کے چنگل سے آزاد ہونے کے لیے قاضی کو اپنا تعارف کراتے ہوئے سولی پر چڑھنے کے لیے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے۔

یہ عجیب وغریب اندرونی عدالت، قیامت کی عدالت کے ساتھ بلا کی مشابہت رکھتی ہے۔

۱۔ حقیقت میں یہاں قاضی وشاہد اور حکم کا اجراء کرنے والا ایک ہی ہے جیسا کہ قیامت میں بھی اسی طرح ہے: عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک: "پروردگارا! تو پنہاں اور آشکار بھیدوں سے آگاہ ہے اور تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا" (زمر ـــــ ۴۶)

۲۔ یہ وجدانی عدالت سفارش، رشوت، پارٹی بازی اور انسانوں میں رائج سفارشی خطوں کو قبول نہیں کرتی، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی یہی آیا ہے:

واتقوا یومًا لا تجزی نفس عن نفس شیئًا ولا یقبل منھا شفاعۃ ولا یؤخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون

"اس دن سے ڈرو جس میں کسی شخص کو کسی دوسرے کی جگہ پر سزا نہیں دی جائے گی اور نہ ہی کوئی سفارش قبول ہو گی، اور نہ ہی کوئی فدیہ ورشوت کو قبول کیا جائے گا، اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ونصرت کی جائے گی"۔

(بقرہ ـــــ ۴۸)

۳۔ عدالتِ وجدان: اہم ترین اور ضخیم ترین اعمال ناموں کی مختصر ترین مدت میں جانچ پڑتال کر لیتا ہے اور اپنا آخری فیصلہ بڑی تیزی کے ساتھ صادر کر دیتا ہے، نہ اس میں نئے سرے سے درخواست دینے کی ضرورت ہے نہ تجدیدِ نظر کی، اور نہ ہی مہینوں اور سالوں تک چکر لگانے کی، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی یہی بات ہے: واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب "خدا حکم کرتا ہے، اور اس کا حکم نہ رد ہوتا ہے اور نہ ہی ٹوٹتا ہے اور اس کا حساب وکتاب بہت ہی تیز ہو گا"

(رعد ـــــ ۴۱)

۴۔ اس کی سزا اور کیفر کردار، اس جہان کی رسمی عدالتوں کی سزاؤں کے برخلاف، اس کے اولین شعلے اس کے دل وجان کی گہرائیوں میں

بھڑکتے ہیں اور وہاں سے باہر کی طرف سرایت کرتے ہیں، پہلے وہ انسان کی روح کو تکلیف و آزار پہنچاتے ہیں، اس کے بعد اس کے آثار چہرہ میں اور اس کے خواب و خوراک کے دگرگوں اور تبدیل ہونے میں ظاہر و آشکار ہوتے ہیں، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی بیان ہے (نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ) خدا کی روشن کی ہوئی آگ دلوں سے شعلے نکالتی ہے۔

(ہمزہ ـــــــ ۶، ۷)

۵۔ اس وجدان کی عدالت کو، دیکھنے والوں اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود متہم انسان کی معلومات اور آگاہیوں کو، اس کے نفع میں، یا اس کے برخلاف "گواہیوں" کے عنوان سے قبول کرتا ہے، جیسا کہ قیامت کی عدالت میں بھی، انسان کے وجود کے ذرات، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے بدن کی جلد اس کے اعمال کے گواہ ہوں گے، جیسا کہ فرماتا ہے:

حتّٰی اذا ما جاءوھا شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم

"جب وہ جہنم کی آگ کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے خلاف گواہی دیں گے"۔ (حٰم السجدۃ ـــــــ ۲۰)

ان دونوں عدالتوں کے درمیان، یہ عجیب و غریب مشابہت مسئلہ معاد کے فطری ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔ کیونکہ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک انسان کے وجود میں تو ـــــــ جو اس عالم ہستی کے عظیم سمندر میں ایک چھوٹا سا قطرہ ہے ـــــــ اس قسم کا حساب و کتاب اور مرموز و اسرار آمیز عدالت موجود ہو، لیکن اس عظیم عالم کے اندر بالکل کوئی حساب و کتاب، عدالت و محکمہ موجود نہ ہو، بھلا یہ چیز باور کرنے کے قابل ہے؟[1]

۲۔ قرآن مجید میں قیامت کے نام

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے معارف، اور اس کے اعتقادی مسائل کا ایک اہم حصّہ، قیامت و معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان کی تربیت اور تکامل و ارتقاء کی طرف بڑھنے میں اہم ترین تاثیر رکھتے ہیں۔

قرآن میں اس عظیم دن کے لیے جو نام انتخاب کیے گئے ہیں وہ بھی بہت ہیں، جن میں سے ہر ایک اس دن کے مختلف جہات و ابعاد میں سے ایک جہت و بعد کو بیان کرتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسائل کو اکیلا ہی واضح کر دیتا ہے۔

"فیض کاشانی" کے قول کے مطابق، جو انھوں نے "محجۃ البیضاء" میں لکھا ہے۔ ان ناموں میں سے ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا ہے اور ہر توصیف میں کوئی نہ کوئی اہم معنی بیان ہوا ہے، لہٰذا کوشش سے ان معانی کا ادراک کرنا چاہیے، اور ان اسرار کو معلوم کرنا چاہیے۔

انھوں نے قیامت کے ایک سو سے زیادہ نام ذکر کیے ہیں، ان تمام کو یا ان میں سے اکثر کو قرآن مجید سے معلوم کیا جا سکتا ہے مثلاً "یوم الحسرۃ"، "یوم الندامۃ"، "یوم المحاسبۃ"، "یوم المسألۃ"، "یوم الواقعۃ"

---

[1] محکمہ وجدان کے سلسلہ مزید وضاحت کے لیے کتاب "رہبران بزرگ" (بحث وجدان) اور کتاب "معاد و عالم پس از مرگ" (بحث دلائل) کی طرف رجوع کریں۔

"یوم القارعۃ" "یوم الراجفۃ" "یوم الرادفۃ" "یوم الطلاق" "یوم الفراق" "یوم الحساب" "یوم التناد" "یوم العذاب" "یوم الفرار" یوم الحق" "یوم الحکم" "یوم الفصل" "یوم الجمع" "یوم الدین" "یوم تبلی السرائر" "یوم لا یغنی مولی عن مولی شیئا" "یوم یفر المرء من اخیه" "یوم لا ینفع مال ولا بنون" "ویوم التغابن" و .... [1]

لیکن اس کا زیادہ مشہور نام "یوم القیامۃ" ہی ہے جس کا قرآنِ مجید میں ستر بار ذکر ہوا ہے اور وہ بندوں کے عمومی قیام اور انسانوں کے عظیم معاد کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا بھی، انسان کو اس دنیا میں، اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قیام کی دعوت دیتا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق، خوابِ غفلت اور فریب سے بیدار ہونے اور سرکش نفس کو لگام دینے اور انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم ان ناموں میں غور و فکر کریں اور اس عظیم دن میں ——— جس میں ہم سب خدا کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور پردے ہٹ جائیں گے اور اندرونی بھید کھل جائیں گے اور بہشت کو مزین کیا جائے گا اور جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ اور سب کے سب میزانِ عدلِ الٰہی کے پاس حاضر ہوں گے ——— ہم اپنی حالت کو نظر میں رکھیں۔ (خداوندا! ہمیں اس دن اپنی پناہ میں جگہ دے دے)۔

---

[1] "المحجۃ البیضاء" جلد ۸ ص ۲۲۱ (مختصر طور سے)

۷۔ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝
۸۔ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝
۹۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝
۱۰۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝
۱۱۔ کَلَّا لَا وَزَرَ ۝
۱۲۔ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ ۣالْمُسْتَقَرُّ ۝
۱۳۔ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ ۣبِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝
۱۴۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝
۱۵۔ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ۝

ترجمہ

۷۔ اس وقت آنکھیں شدت وحشت سے پھرنے لگیں گی۔
۸۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا
۹۔ اور سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔
۱۰۔ اس دن انسان کہے گا: بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟
۱۱۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، کوئی راہِ فرار اور پناہ گاہ نہیں ہے۔
۱۲۔ اصلی پناہ گاہ تو تیرے پروردگار کی طرف ہی ہے۔
۱۳۔ اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جو آگے یا پیچھے کیے ہیں، آگاہ کیا جائے گا۔
۱۴۔ بلکہ انسان تو خود اپنی حالت سے آگاہ ہے۔
۱۵۔ اگرچہ (ظاہر میں) وہ اپنے لیے عذر (اور بہانے) تراشے۔

تفسیر

انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو اس سوال پر کہ ـــــ جو منکرینِ قیامت اور معاد کے بارے میں کرتے تھے ـــــ ختم ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ اگر قیامت سچ ہے تو وہ کب آئے گی، زیرِ بحث آیات گویا اس سوال کا ایک واضح جواب ہیں۔

پہلے قیامت کے قبل کے حوادث کی طرف ـــــ یعنی اس انقلابِ عظیم کے سلسلہ میں جو دنیا میں پیدا ہوگا، اور اس دنیا کا نظام متلاطم اور خراب ہو جائے گا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب آنکھیں خوف اور وحشت کی شدت سے گردش کر رہی ہوں گی اور مضطرب ہوں گی" (فاذا برق البصر)[1]

"اور جس وقت چاند بے نور اور منخسف ہو جائے گا" (وخسف القمر)۔

"اور جب سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے (وجمع الشمس والقمر)۔

اس بارے میں کہ "چاند اور سورج" کے جمع ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف تفاسیر بیان کی ہیں۔

کبھی کہا ہے: دونوں ایک ساتھ اکٹھے ہو جائیں گے یا دونوں اکٹھے مشرق سے طلوع کر کے مغرب میں غروب ہوں گے۔

اور کبھی کہا ہے: دونوں اس صفت میں کہ اپنا نور کھو بیٹھیں گے، جمع ہوں گے[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ چاند بتدریج سورج کی قوتِ جاذبہ کے زیرِ اثر اس کے نزدیک اور انجام کار اس میں جذب ہو جائے گا اور پھر دونوں بے نور ہو جائیں گے۔

بہرحال یہاں دنیا کے آخر میں ظاہر ہونے والے انقلابوں میں سے دو اہم ترین حصوں، یعنی چاند کے بے نور ہو جانے اور سورج اور چاند کے

---

[1] "برق" "برق" کے مادہ سے (بروزن فرق) اصل میں روشنی اور اس بجلی کے معنی میں ہے جو بادلوں کے درمیان ظاہر ہوتی ہے، اس کے بعد ہر قسم کی روشنی پر اطلاق ہونے لگا، آنکھوں کا چمک مارنا، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، شدید اور اضطراب آمیز حرکت کے معنی میں ہے جو ہول اور خوف کی شدت سے ہوتی ہے، بعض اسے آنکھ کے ڈھیلے کے رک جانے اور ٹکٹکی باندھ کر ایک ہی نکتہ کی طرف نگاہ کرنے کے معنی میں ـــــ جو عام طور پر وحشت کی نشانی ہے ـــــ تفسیر کرتے ہیں اور اس معنی پر کہ آنکھ کا چمک مارنا، تحیر کے معنی میں ہے، اشعارِ عرب سے کچھ شواہد لائے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

[2] مرحوم "طبرسی" مجمع البیان میں فرماتے ہیں کہ جمع تین قسم کی ہوتی ہے: ایک مکان میں جمع ہونا، ایک وقت میں جمع ہونا اور ایک چیز میں کئی اوصاف کا جمع ہونا۔ (مثلاً علم و عدالت کا ایک شخص میں جمع ہونا) لیکن دو چیزوں کے ایک صفت میں اشتراک کے معنی میں جمع ہونا، مثلاً چاند اور سورج کا بے نور ہونا، ایک قسم کی مجازی تعبیر ہے (جیسے قرینہ سے معلوم ہونا چاہیے)

(مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۹۵)

ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہوجانے کی طرف اشارہ ہوا ہے، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی کم وبیش اشارے ہوئے ہیں، مثلاً سورۂ تکویر کی آیہ ۱ میں فرماتا ہے: " اذا الشمس کوّرت " "جس وقت سورج تاریک ہوجائے گا" اور ہم جانتے ہیں کہ چاند کا نور سورج سے ہے، تو جب سورج تاریک ہوگا تو پھر چاند بھی تاریک ہوجائے گا اور نتیجہ میں کُرۂ زمین ایک وحشت ناک ظلمت اور تاریکی میں ڈوب جائے گا۔

اس طرح سے یہ دنیا ایک عظیم تحوّل اور انقلاب کے ساتھ ختم ہوجائے گی، اس کے بعد ایک دوسرے انقلاب سے (دوسرے نفخۂ صور سے جو نفخۂ حیات ہے)۔ انسانوں کا قبروں سے اٹھنا شروع ہوگا، " اور اس دن انسان کہے گا کہ فرار کی راہ کہاں ہے؟" (یقول الانسان یومئذ این المفرّ)۔[۱]

ہاں کافر اور گنہ گار انسان، جو قیامت کے دن کی تکذیب کیا کرتے تھے، اس دن شدت خجالت اور شرم سے کوئی پناہ گاہ تلاش کریں گے اور گناہ کے بار کی سنگینی اور عذاب کے خوف سے فرار کی راہ ڈھونڈیں گے، بالکل اسی دنیا کی طرح کہ جب وہ کسی خطرناک حادثہ کا سامنا کرتے تھے تو بھاگنے کی سوچتے تھے، لہٰذا وہ اس جگہ کا بھی اس جگہ سے قیاس کریں گے۔

لیکن بہت جلد ان سے کہہ دیا جائے گا، : " ہرگز ایسا نہیں ہے، یہاں راہ فرار اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے" (کلّا لا وزر)۔[۲]

" بلکہ سب سے اصلی قرارگاہ پروردگار کی طرف ہے" اور اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے (الیٰ ربک یومئذ المستقر)۔

اس آیت کے لیے اوپر والی تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: اس دن آخری حکم خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یا یہ کہ آخری قرارگاہ، جنت اور دوزخ ہیں اس کے حکم سے ہوگی۔

یا یہ کہ محاکمہ اور حساب کے لیے اسی کی بارگاہ میں ٹھہرنا ہوگا۔

لیکن بعد والی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے، وہ تفسیر جو ہم نے انتخاب کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو انسان کے ابدی تکامل وارتقاء کے راستے کو بیان کرتی ہیں اور یہ آیت ان آیات کے زمرے میں سے ہے جو کہتی ہیں" والیہ المصیر " سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے'' (تغابن ـــــ ۳) اور

---

[۱] " مفر"، " فرار" سے اسم مکان ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے، لیکن یہ احتمال یہاں بعید نظر آتا ہے۔

[۲] " وزر" (بروزن قمر) اصل میں پہاڑی پناہ گاہ وغیرہ کے معنی میں ہے اور" وزیر" کو اس لیے" وزیر" کہتے ہیں، کہ لوگ اپنے کاموں میں اس کی پناہ لیتے ہیں بہر حال زیر بحث آیت میں ہر قسم کی پناہ گاہ کے معنی میں ہے۔

(یاایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ) اے انسان تو سعی و کوشش اور زحمت و مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے، اور تو اس سے ملاقات کرے گا" (انشقاق ـــــ ۶) وان الیٰ ربک المنتھیٰ" اور یہ کہ سب تیرے پروردگار کی طرف پلٹ جائیں گے" (نجم ـــــ ۴۲)[1]

زیادہ واضح تعبیر میں انسان ایسے رہرو ہیں جو عدم کی سرحد سے چلے ہیں اور انھوں نے سلطنتِ وجود کا یہ سارا راستہ طے کیا ہے، اور اس سلطنتِ وجود میں بھی وہ خدا کے وجودِ مطلق اور بے پایاں ہستی کی طرف چلے جا رہے ہیں، اور اگر وہ اصل راستے اور صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہوں، تو یہ ارتقائی حرکت ابد تک جاری رہے گی اور وہ ہر روز قربِ خدا کے ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوں گے، لیکن اگر وہ اپنی راہ سے منحرف ہو جائیں تو گر کر تباہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جنھیں اس نے "مقدم" رکھا تھا یا "موخر" کیا تھا، آگاہ کیا جائے گا" (ینبّؤا الانسان یومئذ بما قدّم واخّر)۔

اس بارے میں کہ ان دونوں تعبیروں سے کیا مراد ہے؟ بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ کہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے اپنی زندگی میں آگے بھیجے ہیں، یا وہ آثار جو موت کے بعد اس سے باقی رہ گئے ہیں، چاہے وہ نیک سنت ہو یا بد، جو اس نے لوگوں میں چھوڑی ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کی نیکیاں اور برائیاں اس کو پہنچتی رہتی ہیں، یا کتاب اور تحریریں اور خیر و شر کی بنیادیں، یا نیک و بد اولاد، جن کے آثار اس تک پہنچیں گے۔

دوسری تفسیر سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے بجا لایا تھا اور وہ آخری اعمال جنھیں اس نے اپنی تمام عمر میں انجام دیئے، دوسرے لفظوں میں وہ اپنے تمام اعمال سے باخبر ہو جائے گا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے وہ مال مراد ہے جو اس نے آگے بھیجا ہے اور وہ مال جو اس نے وارثوں کے لیے چھوڑا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں، جنھیں اس نے مقدم رکھا، اور وہ اطاعتیں ہیں جنھیں اس نے مؤخر رکھا تھا، یا اس کے برعکس۔

لیکن سب سے مناسب پہلی تفسیر ہے، خاص طور پر جبکہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

> (ینبؤ) بما قدم من خیر و شر و ما اخر من سنۃ لیس بھا من بعدہ فان کان شرًّا کان علیہ مثل وزرھم ولا ینقص من وزرھم شیئًا وان کان خیرًا کان لہ مثل اجورھم، ولا ینقص من اجورھم شیئًا

---

[1] البتہ ان آیات کی تفسیر میں کچھ دوسرے نظریات بھی ہیں جو ہم نے انھیں آیات کے ذیل میں بیان کیے ہیں۔

"اس دن انسان کو اس خیر اور شر سے باخبر کیا جائے گا جسے اس نے مقدم رکھا تھا، یا مؤخر کیا تھا۔ ان سنتوں کے طور پر جنھیں اس نے یادگار کے طور پر چھوڑا تھا، تاکہ وہ لوگ جو اس کے بعد آئیں گے اس پر عمل کریں اور اگر وہ بُری سنت تھی تو عمل کرنے والوں کے گناہوں کے برابر اس کے گناہ میں اضافہ ہوگا اور ان کے گناہوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی، اور اگر وہ اچھی سنت تھی تو ان ہی جیسے اجر و ثواب اس کے لیے بھی ہوں گے اور ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔"[1]

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: اگرچہ خدا اور اس کے فرشتے انسان کو اس کے تمام اعمال سے آگاہ کریں گے، لیکن اس اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ انسان خود اپنی حالت سے آگاہ ہے اور اس عظیم دن میں وہ خود اور اس کے اعضاء اس کی گواہی دیں گے: (بل الانسان علٰی نفسه بصيرة[2])۔

"چاہے وہ ظاہر میں اپنے لیے کتنے ہی عذر تراشتا رہے" (ولو القٰی معاذيره)۔

یہ آیات حقیقت میں وہی چیز بیان کر رہی ہیں جو قرآن کی دوسری آیات میں، انسان کے اعمال پر اس کے اعضاء کی گواہی کے بارے میں آیا ہے، مثلاً سورہ حٰم سجدہ کی آیہ ۲۰ میں آیا ہے: (شهد عليهم سمعهم وابصارهم وجلودهم بما كانوا يعملون) "ان کے کان اور آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے اعمال کی گواہی دیں گے"، اور سورہ یٰس کی آیہ ۶۵ میں آیا ہے و تكلمنا ايديهم و تشهد ارجلهم بما كانوا يكسبون "ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے، اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی جنھیں وہ انجام دیتے تھے گواہی دیں گے"

اس بناء پر قیامت کی اس عظیم عدالت میں انسان کے اعمال کا بہترین گواہ وہ خود ہی ہے، کیونکہ وہ اپنی حالت سے سب سے زیادہ آگاہ ہے، اگرچہ خدا نے اتمام حجت کے طور پر بہت سے دوسرے گواہ بھی اس کے لیے تیار کیے ہیں۔

"بصيرة" مصدری معنی بھی رکھتا ہے (بینائی و آگاہی) اور وصفی معنی بھی (آگاہ شخص) اس لیے بعض نے اس کی "حجت" دلیل اور برہان کے معنی میں جو آگاہی بخش ہوتی ہے تفسیر کی ہے۔

"معاذير" "معذرت" کی جمع ہے، جو اصل میں ایسی چیز کے پیدا کرنے کے معنی میں ہے، جو گناہ کے آثار کو ختم کر دے، جو کبھی تو واقعی عذر ہوتا ہے اور کبھی ظاہری، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "معاذير" "معذار" کی جمع ہے، جو پردہ اور پوشش کے معنی میں ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوتا ہے۔ انسان اپنے اوپر آگاہی رکھتا ہے، چاہے وہ اپنے اعمال پر کتنے ہی پردے ڈالے اور اپنے کاموں کو

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۰۶۔ اسی حدیث کے مانند تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۸۹۱ میں بھی آیا ہے۔

[2] پہلے احتمال کی بناء پر اس کی "تاء" مصدری ہے اور دوسرے احتمال کی بناء پر "تاء تانیث" ہے کیونکہ انسان یہاں "اعضاء و جوارح" کے معنی میں ہے یا "نفس" کے معنی میں ہے جو تانیث مجازی ہے اور بعض اسے "تاء مبالغہ" سمجھتے ہیں، جو انسان کی اپنے بارے میں شدت آگاہی کی خبر دیتی ہے۔

پوشیدہ رکھے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال اس عظیم دن حساب و جزا پر حاکم وہ ہستی ہے جو ظاہر و باطن کے بھیدوں سے آگاہ ہے اور خود انسان کو بھی اس کے اعمال پر حساب کرنے والا قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیہ ۱۴ میں آیا ہے: اقرأ كتابك كفى بنفسك اليوم عليك حسيبًا" اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ، آج تو اپنے حساب کے لیے خود بھی کافی ہے۔

اگرچہ زیرِ بحث آیات سب کی سب معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن ان کا مفہوم وسیع ہے، اس دنیا کو بھی شامل ہے یہاں بھی لوگ اپنے حال سے آگاہ ہیں، اگرچہ کچھ لوگ جھوٹ موٹ اسے پسِ پشت ڈال کر، ظاہر سازی اور ریاکاری سے اپنے حقیقی چہرے کو چھپا لیتے ہیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ما يصنع احدكم ان يظهر حسنًا ويسر سيئًا اليس اذا رجع الى نفسه يعلم انه ليس كذٰلك، والله سبحانه يقول: بل الانسان على نفسه بصيرة، ان السريرة اذا صلحت قويت العلانية۔

"جب تم میں سے کوئی شخص اپنے ظاہر کو آراستہ کرے، لیکن پوشیدہ طور پر بدکار ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کیا جب وہ اپنے نفس کی طرف لوٹتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا نہیں ہے؟ جیسا کہ خداوندتعالیٰ فرماتا ہے: بلکہ اپنی حالت سے آگاہ ہے جب انسان کا باطن صالح اور درست ہو جائے تو اس کے ظاہر کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔[1]

بیمار کے روزہ کی احادیث میں بھی آیا ہے کہ امام صادقؑ کے ایک صحابی نے آپ سے سوال کیا ما حد المرض الذي يفطر صاحبه؟ اس بیماری کا معیار کیا ہے جس سے افطار جائز ہو جاتا ہے تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

"بل الانسان على نفسه بصيرة، هو اعلم بما يطيق"

انسان اپنی حالت پر سب سے زیادہ آگاہ ہے اور وہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس میں کس قدر توانائی ہے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۹۶

[2] وہی مدرک (اس حدیث کو مرحوم صدوق نے "من لا یحضر" کی کتاب صیام میں بھی نقل کیا ہے۔ جلد ۲ ص ۱۳۲۔ باب حد المرض الذی یفطر صاحبہ حدیث ۱۹۴۱

۱۶۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ

۱۷۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚۖ

۱۸۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ

۱۹۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ

ترجمہ

۱۶۔ اس قرآن کو پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دے۔

۱۷۔ کیونکہ اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

۱۸۔ اور جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس کی پیروی کر۔

۱۹۔ پھر اس کو بیان کرنا (اور اس کی وضاحت کرنا بھی) ہمارے ہی ذمہ ہے۔

تفسیر

قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمّہ ہے

یہ آیات حقیقت میں جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں، جسے گفتگو کرنے والا اپنی گفتگو کے درمیان میں لاتا ہے، مثلاً کوئی شخص تقریر کر رہا ہے اور وہ یہ دیکھتا ہے کہ مجلس کا آخری حصّہ لوگوں سے پُر ہو گیا ہے جبکہ اس کا اگلا حصّہ خالی ہے تو وہ وقتی طور پر اپنی تقریر روک کر حاضرین کو آگے آنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے جگہ کھلی ہو جائے اور پھر اپنی تقریر کو شروع کر دیتا ہے یا کوئی استاد درس کے دوران اپنے کسی شاگرد کو غافل دیکھتا ہے تو وہ اپنی گفتگو کو توڑ کر اسے تنبیہ کرتا ہے اور پھر درس کو جاری کر دیتا ہے۔

اگر کوئی بے خبر آدمی اس تقریر یا درس کو ٹیپ سے سنے تو ممکن ہے وہ اشتباہ میں پڑ جائے اور ان جملوں کے قبل و بعد کے جملوں سے غیر مربوط ہونے پر تعجب کرے، لیکن مجلس کے مخصوص حالات میں وقت اور غور کرنے سے ان معترضہ جملوں کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس سادہ سے مقدمہ کی طرف توجہ کرنے کے بعد ہم زیر بحث آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں

خدا نے قیامت، مومنین اور کفار کے حالات کے بارے میں جو سلسلہ گفتگو تھا، اسے وقتی طور پر چھوڑ دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو قرآن کے بارے میں، ایک مختصر سی یاد دہانی کراتا ہے، اور فرماتا ہے: "اپنی زبان کو اس کے پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے حرکت نہ دے" (لا تحرك به لسانك لتعجل به)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین نے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے اور مجموعی طور پر اس کے لیے تین تفاسیر بیان کی گئی ہیں ۔

پہلی تفسیر تو وہی معروف تفسیر ہے جو ابن عباس سے کتب حدیث و تفسیر میں بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اس شدید عشق اور لگاؤ کی بناء پر، جو آپ قرآن کو حاصل کرنے اور اسے حفظ کرنے کے بارے میں رکھتے تھے، جب وحی لانے والا فرشتہ آپ کے سامنے قرآنی آیات کو پڑھتا تھا، تو آپ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو حرکت دیتے تھے اور جلدی کرتے تھے، خدا نے آپ کو منع کیا کہ یہ کام نہ کیجیے ہم خود اسے تیرے لیے جمع کر رہے ہیں ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ : قرآن کے دو نزول ہیں : " نزولِ دفعی " یعنی وہ سارا کا سارا یکجائی طور پر " شب قدر " میں پیغمبرؐ کے پاک دل پر نازل ہوا اور " نزولِ تدریجی " جو ۲۳ سال کے عرصہ میں صورت پذیر ہوا، پیغمبرؐ اس جلدی کی بناء پر جو انھیں دعوت کی تبلیغ کے بارے میں تھی، بعض اوقات نزول تدریجی سے پہلے یا اس کے ہمراہ آیات کی تلاوت کرتے تھے، تو انھیں حکم دیا گیا کہ یہ کام نہ کریں اور ہر آیت کی اپنے موقع پر ہی تلاوت اور تبلیغ کریں ۔

اس طرح سے اس آیت کا مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۱۴ کے مانند ہے ۔ (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان يقضٰى اليك وحيه) " وحی کے مکمل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کرو " ۔

یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی زیادہ فرق نہیں رکھتیں اور مجموعی طور پر ان کی بازگشت اس معنی کی طرف ہے کہ پیغمبر کو وحی کے حاصل کرنے کے لیے بھی عجلت، اور جلد بازی نہیں کرنا چاہیے ۔

تیسری تفسیر جس کے طرفدار بہت ہی کم ہیں، یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب، قیامت میں گنہگار ہیں، جنھیں حکم دیا جائے گا کہ اپنے نامۂ اعمال کو پڑھیں اور اپنا حساب خود کریں اور انھیں کہا جائے گا کہ اس کے پڑھنے میں جلدی نہ کریں ۔ یہ فطری بات ہے کہ وہ اپنا نامۂ اعمال پڑھتے وقت جب اپنی " برائیوں " تک پہنچیں گے تو پریشان ہو جائیں گے اور ان سے جلدی کے ساتھ گزر جانا چاہیں گے تو یہ حکم انھیں دیا جائے گا اور انھیں جلد بازی سے روکا جائے گا اور ان کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ جس وقت خدا کے فرشتے ان کے اعمال نامے پڑھیں تو وہ ان کی پیروی کریں

اس تفسیر کے مطابق، یہ آیات جملہ معترضہ کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ یہ گزشتہ اور آیندہ کی آیات کے ساتھ مربوط ہیں اور سب کی سب ایک دوسرے کے ساتھ ربط رکھتی ہیں، کیونکہ یہ سب ہی قیامت و معاد کے حالات کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن پہلی اور دوسری تفسیر کے مطابق ــــــ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ــــــ یہ آیات جنبہ معترضہ رکھتی ہیں ۔

لیکن بہرحال تیسری تفسیر ــــــ خصوصاً قرآن کے نام کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو بعد کی آیات میں آیا ہے ــــــ بہت بعید نظر آتی ہے اور اصولی طور پر آیات کا لب و لہجہ بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گزشتہ دو تفسیروں میں سے کوئی سی ایک مراد ہے اور ان دونوں کے جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے اگرچہ بعد والی آیات کا لب و لہجہ پہلی تفسیر یعنی مشہور تفسیر کے موافق ہے (غور کیجیے)

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے " (انّ علينا جمعه وقرانه) ۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تو پریشان نہ ہو، ہم اس کی آیات کو جمع بھی کریں گے اور وحی لانے والے کے ذریعہ تیرے سامنے پڑھیں گے بھی۔

"اور جب ہم اسے پڑھ چکیں پھر تو اس کی پیروی کر اور اسے پڑھ" (فاذا قرأناه فاتبع قرانه)۔

"پھر اس کو بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے" (ثم انّ علينا بيانه)۔

اس بناء پر قرآن کا جمع کرنا، اور اس کی تیرے سامنے تلاوت کرنا اور اس کے معانی کی توضیح و تفصیل بتانا، یہ تینوں امور ہمارے ذمہ ہیں لہذا تو کسی طرح بھی اس سلسلہ میں پریشان نہ ہو، جس ہستی نے اس وحی کو نازل کیا ہے، وہی تمام مراحل میں اس کا محافظ ہے تیری ذمہ داری تو صرف ایک طرف تو وحی لانے والے فرشتے کی تلاوت کی پیروی کرنا ہے اور دوسری طرف عامۃ الناس کو اس رسالت کی تبلیغ کرنا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جمع کرنے سے مراد وحی کی زبان میں جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ پیغمبر کے سینہ میں جمع کرنا اور آنحضرتؐ کی زبان سے اس کی تلاوت ہے، یعنی جلدی نہ کرو۔ ہم ان تمام آیات کو تیرے سینہ میں جمع کر دیں گے اور پھر اس کی قرأت تیری زبان پر جاری کریں گے۔

بہرحال یہ تمام تعبیریں پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ جبرئیل کے ذریعہ نزول وحی کے وقت، ہمیشہ جلدی کرتے تھے کہ آیات کو جلدی کے ساتھ تکرار کریں کہ کہیں ان کے حافظہ سے نکل نہ جائیں اور اس موقع پر خدا کی طرف سے انہیں یہ بتایا گیا کہ آپ مطمئن رہیں کہ نہ صرف آیات جمع کرنے اور ان کے پڑھنے بلکہ ان کے معانی کی توضیح و تشریح کی بھی، خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے

ضمنی طور پر یہ آیات قرآن کی اصالت اور اس کی ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے حفاظت کو بیان کرتی ہیں، کیونکہ خدا نے اس کے جمع کرنے اس کی تلاوت کرنے اور اس کی معانی کی وضاحت و تشریح کرنے کا وعدہ دیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ان آیات کے نزول کے بعد، جب جبرئیل آپ پر نازل ہوتے تو آپ مکمل طور سے سکوت اختیار کرتے اور جب جبرئیل چلے جاتے، تو پھر آپ آیات کی تلاوت شروع کرتے [1]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۹۷

۲۰۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۙ
۲۱۔ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۗ
۲۲۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ
۲۳۔ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ
۲۴۔ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۙ
۲۵۔ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۗ

ترجمہ

۲۰۔ جیسا کہ تم خیال کرتے ہو ایسا نہیں ہے (تم معاد کے دلائل کو مخفی شمار کرتے ہو) بلکہ تم جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو (اور بے قید و شرط کی ہوس رانی کو چاہتے ہو)۔

۲۱۔ اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

۲۲۔ اس دن کچھ چہرے تو شاداب و مسرور ہوں گے۔

۲۳۔ اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

۲۴۔ اور اس دن کچھ چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔

۲۵۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں ایسا عذاب انجام پائے گا، جو کمر کو توڑ کر رکھ دے گا۔

تفسیر

میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے، اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے

ان آیات میں پھر دوبارہ معاد و قیامت سے مربوط مباحث کو شروع کرتا ہے قیامت کی کچھ خصوصیات اسی طرح معاد کے انکار کے علل و اسباب کو بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: اس طرح نہیں ہے کہ معاد و قیامت کے دلائل مخفی ہوں اور تم اس کی حقانیت تک

نہ پہنچ سکتے ہو، "بلکہ تم اس جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو" (کلّا بل تحبون العاجلۃ)۔

"اور اسی بناء پر تم آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو" (و تذرون الاٰخرۃ)۔

معاد کے انکار کی اصلی وجہ، خدا کی قدرت "بوسیدہ ہڈیوں" کو جمع کرنے اور پراگندہ مٹی کو اکٹھا کرنے میں شک اور تردد نہیں ہے بلکہ دنیا اور سرکش شہوات اور ہوس رانیوں کے ساتھ تمہارا شدید لگاؤ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ تم ہر قسم کے موانع اور رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا دو، اور چونکہ معاد اور خدا کے امر و نہی کو قبول کر لینا اس راستے میں بہت سے موانع اور رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے اس لیے یہ لوگ اصل مطلب کے انکار کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آخرت کو کلی طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ مادیت کی طرف جھکاؤ اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک اہم سبب، شہوات و لذات اور ہر قسم کے گناہ کے مقابلہ میں بے قید و شرط آزادی حاصل کرنا ہے، نہ صرف گزشتہ زمانہ میں بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ معنیٰ زیادہ واضح اور آشکار صورت میں صادق آتا ہے۔

یہ دونوں آیات حقیقت میں اسی چیز کی ایک تاکید ہے جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، جس میں فرمایا تھا: بل یرید الانسان لیفجر امامہ۔ یسئل ایان یوم القیامۃ[1]

اس کے بعد اس دن میں نیکوکار مومنین اور بدکار کفار کی حالت کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "اس دن کچھ صورتیں ہنسی خوشی اور نورانی و خوبصورت ہوں گی" (وجوہ یومئذ ناضرۃ)۔

"ناضرۃ" "نضرۃ" کے مادہ سے ایک خاص قسم کی خوشی کے معنی میں ہے جو وفور نعمت اور مرفہ حالی کی وجہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہے جس میں سرور و زیبائی اور نورانیت ہوتی ہے۔ یعنی ان کے رخسار کا رنگ ان کی حالت کی خبر دیتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں میں کس طرح سے غرق ہیں۔ حقیقت میں یہ اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ مطففین کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے: تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم: —— "تم ان (بہشتیوں) کے چہروں پر نعمت کی شادابی کو مشاہدہ کرو گے"۔

یہ تو مادی جزاؤں کے لحاظ سے ہے، لیکن ان کی روحانی جزاؤں کے بارے میں فرماتا ہے "وہ صرف اپنے پروردگار کی پاک ذات کی طرف دیکھیں گے" (الٰی ربھا ناظرۃ)۔

دل کی آنکھ اور شہودِ باطنی کا دیدار، وہ دیدار جس سے وہ اس بے مثال ذات اور اس کمال و جمال مطلق کے مجذوب بن جائیں گے اور ایک

---

[1] بعض نے اوپر والی آیات میں "کلّا" کو ان کے قرآن مجید میں تدبر کرنے کی نفی میں سمجھا ہے لیکن یہ تفسیر صحیح نہیں ہے، کیونکہ —— جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے —— قرآن سے مربوط آیات میں مخاطب پیغمبر ہیں اور وہ جنبہ معترضہ رکھتی ہیں، لیکن زیر بحث آیات کا قیامت کے سلسلہ میں ایک تسلسل ہے۔

روحانی اور ناقابلِ بیان لذت انھیں حاصل ہوگی، جس کا ایک ایک لمحہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے برتر و بالاتر ہے ۔

اس بات پر توجہ رہے کہ " الیٰ ربھا " کا " ناظرۃ " پر مقدم ہونا حصر کا فائدہ دیتا ہے ۔ یعنی اسی کی طرف دیکھیں گے، نہ کہ اس کے غیر کی طرف ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بہشتی یقینی طور پر اس کے غیر کی طرف بھی نگاہ کریں گے تو ہم کہتے ہیں: اگر وہ اس کے غیر کی طرف نگاہ کریں گے تو ان سب کو اس کے آثار میں سے سمجھیں گے اور اثر کی طرف نگاہ کرنا مؤثر کی طرف نگاہ کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ہر جگہ اسی کو دیکھیں گے اور ہر چیز میں اسی کی قدرت اور جمال و کمال کا مشاہدہ کریں گے ، لہذا جنت کی نعمتوں کی طرف توجہ بھی انھیں خدا کی ذات کی طرف نظر کرنے سے غافل نہیں کرے گی ۔

اسی وجہ سے بعض روایات میں —— جو اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں —— آیا ہے کہ: وہ خدا کی رحمت، اس کی نعمت اور اس کے ثواب کی طرف نظر کریں گے "[۱] کیونکہ ان چیزوں کی طرف دیکھنا بھی، اس ذاتِ مقدس کی طرف ہی دیکھنا ہے ۔

بعض بے خبروں نے اوپر والی آیت کو قیامت میں خدا کے حسی مشاہدہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس دن خدا کو اسی ظاہری آنکھ کے ساتھ دیکھیں گے ۔

حالانکہ اس قسم کے مشاہدہ کا لازمہ، خدا کا جسمانی ہونا ، اور کسی خاص مکان، کیفیت اور حالتِ جسمانی میں ہونا ہے ، اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی پاک ذات ان آلودگیوں سے منزہ ہے ، جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بارہا اس پر تکیہ ہوا ہے ۔ منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: لاتدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار : " اس کو آنکھیں نہیں دیکھتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے، یہ آیت مطلق ہے اور دنیا کے ساتھ کسی قسم کا اختصاص نہیں رکھتی ۔

بہرحال خدا کے حسی مشاہدہ کا نہ ہونا، اس سے کہیں زیادہ واضح ہے کہ ہم اس پر مزید بحث کرنا چاہیں، جو شخص قرآن اور معارفِ اسلامی سے معمولی سی بھی آشنائی رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا ۔

بعض نے " ناظرۃ " کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ " انتظار " کے مادہ سے ہے ۔ یعنی اس دن مومنین صرف خدا کی ذاتِ پاک سے توقع رکھتے ہوں گے ۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال پر بھی تکیہ نہیں کریں گے ۔ اور ہمیشہ اس کی رحمت اور نعمت کے منتظر رہیں گے ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس انتظار میں ایک قسم کی پریشانی آمیختہ ہوگی حالانکہ وہاں مومنین کے لیے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی ۔

تو وہ جواب میں یہ کہتے ہیں: اس انتظار میں پریشانی ہوتی ہے جس کے انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو لیکن جب اطمینان حاصل ہو، تو پھر ایسا انتظار آرام و سکون کے ساتھ آمیختہ ہوتا ہے[۲]

---

[۱] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۶۴ ، ۴۶۵

[۲] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ " نظر " جو انتظار کے معنی میں ہے وہ " الی " کے ساتھ متعدی نہیں ہوتا، بلکہ وہ حرفِ جر کے بغیر متعدی ہوگا، لیکن اشعارِ عرب میں سے کچھ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ " نظر " جو انتظار کے معنی میں ہے وہ " الی " کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" نظر کرنے" اور " انتظار کرنے" کے معنی کے درمیان جمع کرنا بھی بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ کا استعمال متعدد معانی میں لیکن اگر بناء یہ ہو کہ ان دو معانی میں سے صرف ایک ہی مراد ہو تو ترجیح پہلے معنی کو ہے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرمؐ کی ایک پُر معنی حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

" اذا دخل اهل الجنة الجنة يقول الله تعالى تريدون شيئاً ازيدكم؟

فيقولون الم تبيض وجوهنا؟ الم تدخلنا الجنة و تنجينا من النار؟

قال فيكشف الله تعالى الحجاب فما اعطوا شيئاً احب اليهم من النظر الى ربهم!"

" جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو خداوندِ عالم فرمائے گا، کیا تم کوئی اور چیز چاہتے ہو، جس کا میں تمہارے لیے اضافہ کروں؟

وہ کہیں گے: (پروردگارا! تو نے ہمیں سب کچھ دیا ہے) کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور جہنم سے رہائی نہیں بخشی؟

اس وقت تمام پردے ہٹ جائیں گے (اور وہ خدا کا چشمِ دل سے مشاہدہ کریں گے) اور اس حالت میں ان کے نزدیک کوئی چیز اپنے پروردگار کی طرف نگاہ کرنے سے زیادہ محبوب نہیں ہوگی [۱]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں " انس بن مالک" کے واسطہ سے آنحضرتؐ سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ينظرون الى ربهم بلا كيفية ولا حد محدود ولا صفة معلومة:

" وہ اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، لیکن کسی کیفیت کو نہیں اور نہ ہی کسی محدود حد اور مشخص صفت کو" [۲]

اور یہ حدیث شہود باطنی پر ایک تاکید ہے، نہ کہ آنکھ سے مشاہدہ کرنے پر۔

" مومنین کے اس گروہ کے مقابلہ میں ایک ایسا گروہ بھی ہوگا جن کے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے" (و وجوه يومئذ باسرة)۔

" باسرة" " بسر" (بروزن نصر) کے مادہ سے، ناپختہ چیز اور وعدہ سے پہلے کام کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے کھجور کے کچے پھل کو " بسر" (بروزن عسر) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چہرے کے بگڑنے اور ترش رو ہونے پر بولا جانے لگا، کیونکہ یہ وہ عکس العمل ہے، جس کا انسان رنج، تکلیف اور پریشانی کے آنے سے پہلے اظہار کرتا ہے۔

بہرحال جس وقت وہ لوگ عذاب کی نشانیوں کو دیکھیں گے اور اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے خالی اور برائیوں سے بھرا ہوا پائیں گے تو سخت پریشان، رنجیدہ اور غمگین ہوں گے اور منہ چڑھائیں گے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۹۸، اور تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۹۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ " روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۴۵

۲۔ " تفسیر المیزان" جلد ۲۰ ص ۲۰۴

انھیں معلوم ہے کہ وہ سخت عذاب جوان کی کمر کو توڑ ڈالے گا ان پر واقع ہو کر رہے گا (تظن ان یفعل بھا فاقرة)۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں "ظن" علم کے معنی میں ہے یعنی انھیں اس قسم کے عذاب کے بارے میں یقین ہو جائے گا جبکہ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں "ظن" اپنے اصلی معنی یعنی گمان میں ہے البتہ وہ اجمالی طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں عذاب ہوگا، البتہ اس قسم کے کمر توڑ عذاب کے بارے میں وہ گمان کرتے ہیں[1]

"فاقرة" "فقرة (بروزن ضربة) کے مادہ سے ہے اور اس کی جمع فقار ہے جو پشت کے مہروں کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر "فاقرہ" اس سنگین حادثہ کو کہتے ہیں جو کمر کے مہروں کو توڑ دیتا ہے اور "فقیر" کو اس وجہ سے فقیر کہا گیا ہے کہ گویا اس کی کمر ٹوٹی ہوئی ہے[2]

بہر حال یہ تعبیر ان سنگین اور سخت سزاؤں سے کنایہ ہے جو دوزخ میں اس گروہ کے انتظار میں ہیں، یہ گروہ کمر شکن عذابوں کا منتظر ہے جبکہ سابقہ گروہ پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہے اور محبوب کی ملاقات کے لیے آمادہ ہے۔ ان کے لیے بدترین عذاب ہے اور ان کے لیے بہترین جسمانی رحمت، نعمت اور روحانی لذت ہے۔

---

[1] منجملہ ان شواہد کے جو اس موضوع کے سلسلہ میں انھوں نے نقل کیے ہیں، یہ ہے کہ اگر "ظن" علم کے معنی میں ہو تو اس کے بعد جو "ان" ہے اسے "مثقلہ" نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ مخففہ ہونا چاہیے، حالانکہ زیر بحث آیت میں "ان" مصدریہ ہے اور اس میں قرینہ یہ ہے کہ اس نے نصب دی ہے۔

[2] "فاقرة" ایک محذوف موصوف کی صفت ہے اور تقدیر میں "داھیة فاقرہ" ہے اور "تظن" فعل ہے جس کا فاعل "وجوہ" ہے اور تقدیر میں "ارباب الوجوہ" یا "ذوات الوجوہ" ہے۔

۲۶- كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝

۲۷- وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ۝

۲۸- وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝

۲۹- وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝

۳۰- اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ۝

ترجمہ

۲۶- اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان گلے تک نہ پہنچے، وہ ایمان نہیں لائے گا۔

۲۷- اور یہ کہا جائے گا: کیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دے؟!

۲۸- اور دنیا سے فراق کا یقین پیدا کرے۔

۲۹- اور پاؤں کی پنڈلیاں (جان کنی کی شدت سے) ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں۔

۳۰- (ہاں) اس دن سب کا راستہ تیرے پروردگار (کی دادگاہ) کی طرف ہی ہوگا۔

تفسیر

دوسرے عالم اور مومنین وکفار کی سرنوشت سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں، موت کے دردناک لمحہ کے بارے میں گفتگو ہے جو دوسرے جہان کا ایک دریچہ ہے۔

فرماتا ہے: "اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان اس کے گلے تک نہ پہنچ جائے، وہ ایمان نہیں لائے گا" (كلا اذا بلغت التراقی)[1]

اس دن اس کی برزخی آنکھ کھل جائے گی، حجاب اور پردے ہٹ جائیں گے اور وہ عذاب و کیفر کردار کی نشانیاں دیکھیں گے اور اپنے اعمال سے واقف ہوجائیں گے اور اس لمحہ میں وہ ایمان لے آئیں گے لیکن وہ ایسا ایمان ہوگا جو ان کی حالت کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

---

[1] یہاں "اذا" شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "اذا بلغت التراقی انكشف له حقيقة الامر و وجد ما عمله ضمناً" "بلغت" کا فاعل "نفس" ہے جو محذوف ہے اور قرینہ کلام سے معلوم ہوجاتا ہے۔

" تراقی "،" ترقوہ " کی جمع ہے جو حلق اور گلے کے گرد کی ہڈیوں کے معنی میں ہے اور روح کا گلے تک پہنچنا، عمر کے آخری لمحوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس وقت روح بدن سے نکلتی ہے تو وہ اعضاء جو دل سے زیادہ فاصلہ رکھتے ہیں (مثلاً ہاتھ پاؤں) وہ جلدی بیکار ہوجاتے ہیں، گویا روح خود کو بدن سے تدریجاً کھینچتی ہے۔ یہاں تک کہ گلے تک پہنچ جاتی ہے۔

اس موقع پر اس کے اردگرد کے لوگ سراسیما اور پریشان ہوجاتے ہیں اور اس کی نجات کی تدبیریں کرتے ہیں" اور یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی ہے جو آکر اس بیمار کو نجات دے" (و قیل من راق)۔

یہ بات عجز، ناامیدی اور بے چارگی کی بناء پر کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اب کام بس سے باہر ہوگیا ہے۔ اور طبیب سے بھی اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

" راق "،" رقی " (بروزن نہی) کے مادہ سے اور" رقیہ " (بروزن خفیہ)" اوپر جانے" کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ " رقیہ " ان اوراد اور دعاؤں پر بولا جاتا ہے جو بیمار کے لیے موجب نجات ہیں، خود طبیب کو بھی اسی وجہ سے کہ وہ بیمار کو رہائی بخشتا ہے اور اسے نجات دیتا ہے" راقی " کہا جاتا ہے، اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ مریض کے اردگرد کے لوگ اور کبھی وہ خود تکلیف کی شدت کی وجہ سے پکارتا ہے، کیا کوئی طبیب مل جائے گا؟ کیا کوئی ہے جو دعا پڑھے اور بیمار رہائی پائے۔؟

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے، کہ فرشتوں میں سے کون اس کی روح کو قبض کرے گا اور اوپر لے جائے گا؟ کیا عذاب کے فرشتے، یا رحمت کے فرشتے؟

اور بعض نے یہ اضافہ کیا ہے کہ چونکہ خدائی فرشتے اس قسم کے بے ایمان انسان کی روح کو قبض کرنا اور اوپر لے جانا پسند نہیں کرتے، تو ملک الموت کہتا ہے، کون ہے جو اس کی روح کو اوپر لے کر جائے؟

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعد والی آیت میں" محتضر" کی مکمل مایوسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:" اس حالت میں وہ زندگی سے مطلق طور پر مایوس ہوجائیگا اور اسے دنیا کے فراق اور جدائی کا یقین ہوجائے گا" (وظن انہ الفراق)۔

" اور پاؤں کی پنڈلیاں ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں گی اور موت کا لمحہ آن پہنچے گا" (والتفت الساق بالساق)۔

ان کا ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھانا یا تو جان کنی کی تکلیف کی شدت کی وجہ سے ہوگا، یا ہاتھ پاؤں کے بیکار ہوجانے اور ان سے روح کے نکل جانے کے نتیجہ میں ہوگا۔

اس آیت کے لیے اور تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے۔

التفت الدنیا بالاٰخرة

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ سید ظہیر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید سجاد حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ہما زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا احمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم